اردو میں خود نوشت سوانح حیات

ڈاکٹر صبیحہ انور

صادقین
۲۷ جون ۱۹۸۲ء

اس مقالے پر لکھنؤ یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی

اردو میں
خود نوشت سوانح حیات

ڈاکٹر صبیحہ انور

ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

صدر شعبہ اردو

کرامت حسین مسلم گرلس ڈگری کالج۔ لکھنؤ

ضابطہ

سالِ اشاعت .. .. .. ۲۵ر اگست ۱۹۸۲ء
تعدادِ اشاعت .. .. ایک ہزار
خطاط .. .. محمد احمدؔ ۔ آغا حسن
مطبع .. .. نامی پریس ۔ لکھنؤ
گرد پوش .. .. جمیل اختر
قیمت .. .. ساٹھ روپے

سرورق ۔ صادقین

تقسیم کار

نامی پریس ۔ خواجہ قطب الدین روڈ ۔ لکھنؤ ۳

انور

کے

نام

ترتیب

پہلا باب

دوسرا باب

تیسرا باب

چوتھا باب

پانچواں باب

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ
(غالب)

ابتدائیہ

اپنی زندگی کے گوناگوں تجربات اور ان سے متعلق کیفیات کا اظہار بہت سے فن کاروں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ اظہار ذات کا جذبہ ہر فن کی بنیاد میں شامل ہے خود نوشت سوانح حیات کے دھندلے دھندلے نقوش ہمیں اردو نثر کے آغاز ہی سے ملنے لگتے ہیں (صوفیائے کرام کے ملفوظات۔ جعفر تھانیسری کی تحریریں۔ ظہیر دہلوی کی داستان حیات۔ باغ و بہار کا مقدمہ۔ خطوط غالب وغیرہ وغیرہ) لیکن افسوس کہ ہمارے ملک میں دیگر فنون کی طرح خود نوشت سوانح حیات کی اہمیت اور افادیت کا احساس بہت دیر میں پیدا ہو سکا۔ پھر بھی اس سلسلے میں جو مواد فراہم ہے اور جو تجربے کیے گئے ہیں وہ خواہ کیفیت کے اعتبار سے بہت اعلیٰ پائے کے نہ ہوں۔ مگر کمیت مقدار اور تنوع کے حساب سے ایسے حقیر اور مختصر بھی نہیں ہیں کہ جن پر معذرت کے علاوہ اور کچھ

ممکن نہ ہو۔

اس مقالے کا مقصد خود نوشت سوانح حیات کا بہ حیثیت صنف ادب کے جائزہ لینا اور اس کے فنی مفہوم کی روشنی میں اس کے ارتقا معنویت اور مستقبل کے امکانات کو واضح کرنا ہے۔

پہلے باب میں خود نوشت سوانح حیات کی اہمیت کو ادبی نفسیاتی اور تاریخی اعتبار سے جانچا گیا ہے کیونکہ اپنے گرد و پیش کی دنیا کو برتنا اور اپنے تجربات دوسروں کے سامنے پیش کرنا آرٹ ہی نہیں انسانی جبلت بھی ہے۔ فن کار کے فن کا مقصد صرف اپنی آواز دوسروں تک پہونچانا ہی نہیں بلکہ خود اپنی بے چین ذات کو تسکین دینا بھی ہوتا ہے فنی وسیلے کے علاوہ خود فن کار کے پاس بھی اپنی ذات کی گہرائیوں تک پہونچنے کا دوسرا ذریعہ نہیں ہوتا۔ مزید براں جزوی تفصیلات کے سبب بعض خود نوشتوں میں وہ حقیقتیں بھی مل سکتی ہیں جن کو محفوظ کرنے میں اکثر تاریخ کے صفحات بھی معذور رہ جاتے ہیں۔ خود نوشت سوانح عمری اور عام سوانح عمری دونوں اصناف کے درمیان اختلاف اور یکسانیت پر بھی اسی باب میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

دوسرے باب میں انگریزی ادب کے پس منظر میں خود نوشت سوانح عمری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مسیحی اعتقاد کے "اعتراف" میں مذہبی عنصر شامل ہو جانے کی وجہ سے انگریزی ادب میں خود نوشت سوانح عمری کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ چونکہ انگریزی زبان نہ صرف وسیع ذخیرۂ الفاظ کی مالک ہے۔ بلکہ ترقی یافتہ ملک کی زبان ہونے کی وجہ سے اسے جو بے باکی اور آزادیٔ فکر و بیان حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک

نہیں کہ وہ آج بھی اردو کو نصیب نہ ہو سکی ہے۔ اس لیے صرف اردو نے ہی نہیں بلکہ ادبی دنیا نے عام طور سے انگریزی ادب سے کسب فیض کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اردو خود نوشت سوانح حیات کا مطالعہ بھی انگریزی ادب کے حوالے کے بغیر ادھورا ہی رہ جاتا ہے۔ اس باب میں انگریزی کے علاوہ ہندی اور سنکرت میں بھی آپ بیتی کے ابتدائی نقوش واضح کیے گئے ہیں کیونکہ یہ مخصوص ماحول اور روایت اردو آپ بیتی کے ارتقاء میں کسی نہ کسی حد تک شریک رہی ہے۔

دنیا کے مشہور خود نوشت سوانح اردو میں اس صنف کے ارتقاء اور نشو و نما پر کس حد تک اثر انداز ہوتے رہے ہیں اس کا اندازہ خود اردو خود نوشت کے خارجی، داخلی اور پس منظر کے مطالعے سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کچھ عظیم غیر اردو خود نوشت سوانح پر تبصرے بھی اس باب میں شامل ہیں۔ یہ تبصرے صرف ان آپ بیتیوں کے ہیں جن کے تراجم اردو میں شائع ہو چکے ہیں اور انھوں نے کسی نہ کسی طرح اردو آپ بیتی کی روایت پر اپنا اثر ڈالا ہے۔

تیسرے باب میں اردو کے ان اصناف ادب کا تجزیہ کیا گیا ہے جن میں خود نوشت کی خوبیاں موجود ہیں اور ناداستہ طور پر مصنف ان باتوں کو بیان کر جاتا ہے جن کو شاید دانستہ طور پر کہنا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے (مثلاً روزنامچہ۔ خطوط۔ سفرنامے۔ رپورتاژ اور متفرق مضامین جن میں زندگی کے کسی مخصوص دور یا کسی کارنامے کی روداد بیان کی جاتی ہے) یہ تحریریں آپ بیتی نہ ہوتے ہوئے بھی آپ بیتی کی بہت سی کیفیات اور عناصر پر مشتمل ہیں۔

چوتھے باب میں اردو خود نوشت سوانح حیات کے ارتقاء پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو کی ان اہم آپ بیتیوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو اردو خود نوشت سوانح حیات کی تاریخ میں کسی نہ کسی حیثیت سے نمایاں مرتبہ رکھتی ہیں اگرچہ یہ حصہ نسبتاً طویل ہو گیا ہے مگر اس فہرست میں مزید اختصار کی گنجائش ممکن نہ تھی ہر خود نوشت سوانح نگار اپنی جگہ پر کسی جداگانہ زاویہ نگاہ کی نمائندگی کرتا ہے اس باب میں یہی کوشش رہی ہے کہ ہر اس خود نوشت نگار کا ذکر ضرور آ جائے جس نے آپ بیتی کی روایت کی تعمیر یا تبدیلی میں کوئی نمایاں حصہ لیا ہو اور جو مطالعہ کو مجموعی طور سے نمائندہ بنانے میں خاص کردار ادا کرنے کا اہل ہے جن اہم خود نوشت نگاروں کو یہاں پیش کیا گیا ہے ان کی خود نوشت پر اظہار خیال کرنے کا مقصد ان خصوصیات کو واضح کرنے کے علاوہ کہ جو ان کے موضوع اور اسلوب میں موجود ہیں یہ واضح کرنا بھی پیش نظر رہا ہے کہ مجموعی ارتقائی رفتار میں ان کی کارکردگی کیا رہی ہے۔

پانچویں اور آخری باب میں خود نوشت سوانح حیات کی ان خوبیوں پر بحث ہے جن کی توقع ایک قاری کے ذہن میں آپ بیتی کا مطالعہ کرتے وقت رہتی ہے۔ اس باب کے دوسرے حصے میں خود نوشت سوانح حیات کے مسائل اور فنی ترقی کے امکانات پر بحث اردو میں اس صنف ادب کی موجودہ اہمیت اور افادیت کو واضح کرتی ہے۔

اردو میں خود نوشت سوانح حیات کے موضوع پر ابھی تک کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ باوجود اس کے کہ

خود نوشت کے فن کو پھلنے پھولنے کے بہتر اور بیشتر مواقع انگریزی میں فراہم تھے لیکن وہاں بھی مواد توقع کے مطابق دستیاب نہیں ہے۔
صنف آپ بیتی سے متعلق مواد اردو میں بھی نہیں کے برابر ہے۔ اردو سوانح نگاری کے موضوع پر ڈاکٹر الطاف فاطمہ صاحبہ اور ڈاکٹر سید شاہ علی صاحب کے مقالوں میں ضمناً خود نوشت سوانح حیات پر جو تبصرہ ہوا ہے وہ چونکہ ان کا مخصوص موضوع نہیں تھا لہذا کافی تفصیل طلب ہے۔ اس کے علاوہ اردو کے مشہور ماہ نامے نقوش (لاہور۔ پاکستان) جون ۱۹۶۴ء کا شمارہ آپ بیتی نمبر ہے جس میں کچھ آپ بیتیوں کی تلخیص ہے اور کچھ حضرات سے فرمائش کر کے ان کے حالات زندگی لکھوائے گئے ہیں۔ اسی طرح "فن اور شخصیت" (بمبئی) اور "الزبیر" (بھاول پور) کا آپ بیتی نمبر بھی شائع ہوا ہے ان میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو اس سے قبل "نقوش" کا تھا، ان خصوصی نمبروں سے ہمیں بہت سے حضرات کے حالات زندگی کا ایک اجمالی خاکہ تو مل جاتا ہے لیکن خود نوشت سوانح نگاری کے اجزائے ترکیبی پر کوئی تنقیدی یا تجزیاتی روشنی نہیں پڑتی ہے۔
میں امید کرتی ہوں کہ میری اس کوشش سے اردو میں آپ بیتی کی روایت واضح ہوگی اور آپ بیتی کا مطالعہ کرنے والوں کو اس سرمائے کا اندازہ ہوگا۔ جس کا بیشتر حصہ گم نامی میں پڑا ہوا ہے۔
میں اپنے فرض کی ادائیگی میں ناکام ہی رہوں گی اگر میں

اپنے شفیق استاد پروفیسر سید شبیہ الحسن صاحب صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونی ورسٹی کا شکریہ ادا کروں جن کی ہمت افزائی اور گراں قدر مشوروں کے بغیر اس کام کی تکمیل ناممکن تھی، ان کے مشورے میرے تحقیقی سفر میں چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

صبیحہ انور

پہلا باب

خود نوشت سوانح حیات

خود نوشت سوانح حیات کا فنی مفہوم اور خصوصیات
۱۔ سچائی
۲۔ شخصیت
۳۔ فن
خود نوشت سوانح حیات اور سوانح عمری کا فرق
خود نوشت سوانح کی ضرورت اور اہمیت
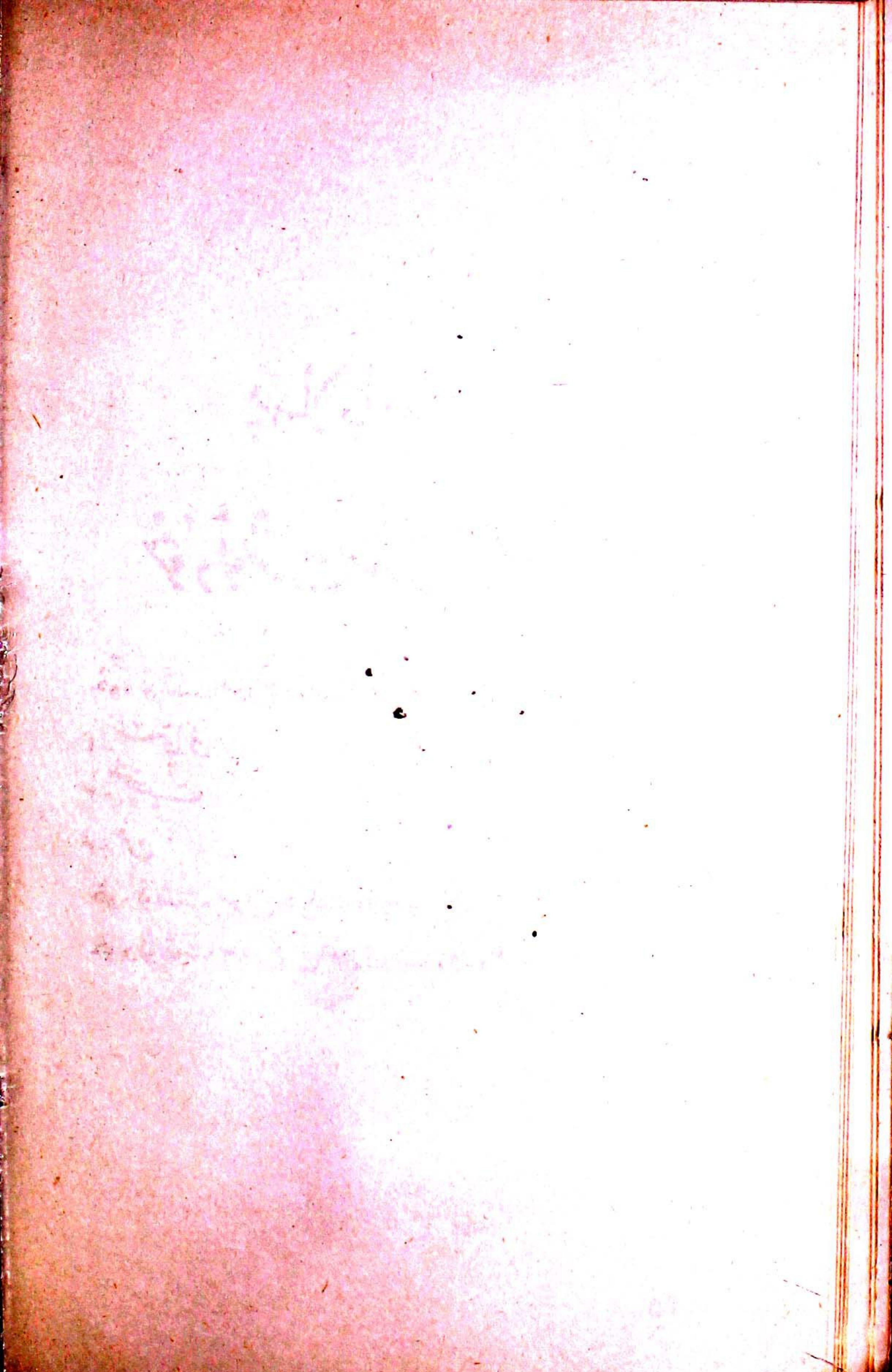
خودنوشت سوانح حیات کا فنّی مفہوم اور خصوصیات

کم و بیش ہر باشعور انسان کی ایک منفرد ذات اور شخصیت ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی ایک انا، زندہ رہنے کی خواہش اور ترقی کی جد و جہد کرتے رہنا اس کے لیے سب سے اہم اور بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے بعد ہمہ دم بے چین رکھنے والی سب سے بڑی جبلّی تمنّا یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو نمایاں کر کے اس سے دوسروں کو متاثر، مرعوب یا مستفید کر سکے۔ انا کا یہ جذبہ کم و بیش ہر انسان میں پایا جاتا ہے اور وہ ہر وقت بڑھنے پھیلنے اور چھا جانے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ بیشتر انسانوں میں یہ صلاحیت موقع کے فقدان کے باعث جوئے کم آب کی مانند محدود اور مخصوص ہوتی ہے، البتہ بعض لوگ اس جذبے کے زیرِ اثر اپنی محنت اور ذہانت سے گرد و پیش کے مقابلوں اور دشواریوں پر قابو پا کر اپنے ہم عصروں میں اور بعض اوقات بعد میں آنے والی نسلوں میں نمایاں مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

یہ انا کی ہی کارفرمائی ہوتی ہو جو عام انسانوں کو فاتح۔ حکمراں۔ مبلغ۔ مفکر۔ مصوّر
مغنی۔ شاعر اور طرح طرح کے آڑے ترچھے فن کاروں کے قالب میں ڈھال دیتی
ہو۔ یہ انا کی جلوہ سامانی ہو جو ہلاکو خاں سے بغداد کی دانش گاہ کو تاراج کروا دیتی
ہے۔ تاج محل کی تعمیر میں بھی جذبہ انا پوشیدہ ہو۔ یہ جذبہ تعمیر کی توفیق بھی دیتا
ہو اور تخریب کا حوصلہ بھی ـــــ اور یہ انا کی ہی تحریک ہو جس کے باعث کوئی
انسان اپنی ذات اور شخصیت کے اظہار کے لیے اپنی خود نوشت سوانح حیات
لکھتا ہو۔ خود نوشت سوانح حیات ادبی اعتبار سے فن کی خالص اور حقیقی صورت
ہو۔ نفسیاتی اعتبار سے یہ فن کار کے ان بنیادی تقاضوں کی تکمیل کرتی ہو جو
اس کی ذات کی تہوں کے اندر پوشیدہ ہیں اور خود ہی فن کا سرچشمہ ہیں۔
خود نوشت سوانح حیات کا جائزہ اگر ہم تاریخی اعتبار سے لیں تو حقیقت
سے قریب ہونے کی وجہ سے یہ ان لوازمات پر پوری اترتی ہو جو ایک اچھی
تاریخ کے لیے ضروری ہو یعنی بے لاگ اور دو ٹوک ـــــ!

خود نوشت سوانح حیات سے مراد کسی شخص کے اپنی زندگی سے متعلق
خود لکھے ہوئے حالات ہوتے ہیں۔ خود نوشت سوانح حیات میں مصوّر اپنی
تصویر خود بناتا ہو۔ بشری تقاضے کے تحت اس کا غیر ارادی مطمح نظر یہی
ہوتا ہو کہ لوگ اس کو پہچانیں۔ خود نوشت سوانح حیات میں عجز اور انکسار
کے خواہ کتنے ہی پردے ڈال دیے جائیں، تکلفات کے پے بہ پے حلقے کھینچ
دیے جائیں۔ ناچیز۔ عاجز۔ ننگ اسلاف۔ ہیچ مداں۔ حقیر فقیر سراپا تقصیر جیسے
الفاظ کا قدم قدم پر استعمال کیا جائے لیکن ہر شخص کا سب سے بڑا ہیرو وہ
خود ہوتا ہو۔

کوئی شخص درحقیقت کیا ہوتا ہو؟ اس کے متعلق مرزا غالب نے کہا ہو:۔

۵ کوئی آگاہ نہیں باطن ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورق ناخواندہ

خالصتہً لفظی اعتبار سے خود نوشت سوانح حیات میں اپنی کہانی خود لکھنے کی شرط ہے جیسا کہ Oxford Dictionary میں Autobiography کے ضمن میں درج ہے:-

" The story of one's life, written by himself "

"کسی شخص کی زندگی کی کہانی خود اُس کی لکھی ہوئی"

آپ بیتی کے فن کے لیے ضروری نہیں کہ تعداد صفحات کی کوئی قید ہو یا کوئی خاص طریقۂ کار ہو جس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہو۔ آپ بیتی خواہ چند سطروں پر مشتمل ہو یا سیکڑوں صفحات پر محیط ہو بہرحال آپ بیتی ہوتی ہے خود نوشت سوانح حیات جو معنوی اعتبار سے آپ بیتی کہلاتی ہے عموماً ایک مفصل کتاب ہوتی ہے جس میں مختلف باب ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے اس کا پھیلاؤ خاصا ہوتا ہے۔ البتہ آپ بیتی عام طور پر نثر میں اپنے حالات کا لکھنا ہے۔ یعنی بنیادی طور پر مصنف کے خود لکھے ہوئے اپنے حالات جو کہ نثر میں ہوں خود نوشت سوانح حیات کہلاتے ہیں۔ آپ بیتیوں کا نثر میں ہونا تقریباً ایک کلیہ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ جب آپ بیتی کا ذکر آتا ہے تو خیال نثر کی طرف ہی جاتا ہے یہ کوئی بنیادی شرط نہیں بلکہ رواج سا بن گیا ہے۔ نثر میں عموماً سہولت بھی ہے نظم کی اپنی بندشیں ہوتی ہیں نثر ایک کھلا میدان ہے جس میں قلم کا گھوڑا آزادی سے دوڑ سکتا ہے بہرحال ہر کلیہ کے ساتھ مستثنیات بھی ہوتی ہیں چنانچہ اردو میں بھی اس استثنیٰ کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر واجد علی شاہ، منیر شکوہ آبادی کی منظوم آپ بیتیاں ہیں۔

" CASSELLS ENCYCLOPAEDIA OF LITERATURE "

میں خود نوشت سوانح حیات کی تعریف ان الفاظ میں ملتی ہے۔

" Autobiography is the narration of man's life by himself. It should contain a greater guarantee of truth than any other form of biography Since the central figure of the book appears also a witness of the events which he records Jhonson was of the opinion that no man's life could be better written than by himself and it does seem as though an honest author should be more fully equipped than any body else to give a complete account of his own experiences"

"خود نوشت کسی انسان کی زندگی کی وہ روداد ہے جسے وہ خود بیان کرے اس میں سوانح حیات کی کسی بھی دوسری شکل سے زیادہ صداقت کی ضمانت ہونی چاہیے کیونکہ کتاب کی مرکزی شخصیت ایسے گواہ کے طور پر بھی پیش ہوتی ہے۔ جنھیں وہ قلم بند کرتی ہے جانسن کی رائے یہ تھی کہ کسی شخص کی زندگی کا حال خود اس سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکتا اور امر واقعہ یہ ہے کہ ایک ایمان دار مصنف کو اپنے تجربوں کا پورا حال بیان کرنے کے لیے کسی بھی دوسرے شخص کے مقابلے میں معلومات سے زیادہ مکمل طور پر لیس ہونا چاہیے"

" ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA "

میں خود نوشت سوانح حیات کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ مثالوں کا جزو

حذف کرکے اس طرح ہیں ۔

" Autobiography is the biography of a person written by himself. Its motivations are various, among others lsef scrutiny for selfedification, self-justification, a nostalgic desire to linger over enchanting memories. Belief that one's experiences may be helpful to others, an earnest attempt to orient self amid a world of confusion, the urge of artistic expression or the purely commercial desire to capitalize on fame or position "

" آپ بیتی کسی ایسے شخص کی ایسی سوانح حیات ہے جو خود اس نے لکھی ہو اس کے محرکات مختلف ہوتے ہیں منجملہ دیگر باتوں کے اخلاقی اصلاح کے لیے اپنے آپ کو پرکھنا ۔ اپنے افعال کی تاویل کرنا ۔ حسین یادوں تذکرانی باتوں کو تروتازہ کرنے کی کوشش ۔ یہ عقیدہ کہ ممکن ہے کہ اپنے تجربات دوسروں کے لیے معاون ہوں الجھی ہوئی دنیا میں اپنی ذات کی واضح سمت متعین کرنے کی پرشوق کوشش ، فن کارانہ اظہار کی تمنا یا شہرت اور رتبے سے فائدہ اٹھانے کی خالصتہً کاروباری کوشش ــــــ "

اول الذکر کی حیثیت کم و بیش تعریف تک محدود ہے لیکن موخر الذکر میں محرکات کی نشان دہی ملتی ہے پہلے اقتباس میں ایک سپاٹ سا ذکر اس بات کا ہے کہ کسی انسان کے بارے میں اس کی گواہی بہترین ہوتی ہے کیونکہ اپنی ذات پر بیتنے والے ایک ایک جزو سے اس کی واقفیت ہوتی ہے یہ اشارہ اس طرف بھی ہے کہ دوسرا شخص کسی کی سوانح عمری میں ساری باتوں کا احاطہ نہیں کرسکتا ہے ایک

شرط یہ ضرور ہے کہ اگر آدمی ایماندار ہو تو وہ اپنے تجربات اور واردات کا بکم و کاست اظہار کر دے گا۔ موخرالذکر (انسائیکلو پیڈیا برٹینکا) میں درج باتوں کی حیثیت حرف آخر کی تو نہیں لیکن اس میں محرکات کا ایک جامع احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پال ڈیلانی نے ۱۷ ویں صدی کی برطانوی آپ بیتیوں کا ایک بسیط جائزہ لیا ہے۔ اس نے محرکات سے صرف نظر کر کے بہت سادہ سی تعریف بیان کی ہے۔

"ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA" Volume 2 Page 783

" Literary works (I) Primarily written to give a coherent account of the anthor's life and (II) composed after a period of reflection and forming a unified narrative "

(ادبی تصانیف (۱) جو اصلاً اس لیے قلم بند ہوں کہ مصنف کی زندگی کی مربوط روداد پیش کر سکیں اور (۲) غور و خوض کے ایک عرصے کے بعد اس طور پر ترتیب پائیں کہ ان میں بیان کا تسلسل ہو۔)

فن در اصل فن کار کے مشاہدے کا ہی دوسرا نام ہے۔ مگر خود نوشت ایک ایسا فن ہے جس کا موضوع خود فن کار کی ذات ہے اس کا مرکز اصلاً داخلی بلکہ شدید داخلی ہے اس میں فن کار کی خارجی زندگی کی جھلکیاں بھی داخلی لفافے میں لپٹی ہوتی ہیں محور داخلی ہوتا ہے اور خارجی عنصر اس سے گریز نہیں کر سکتا۔ گریز کی تھوڑی بہت مثالیں تو ہو سکتی ہیں لیکن اگر گریز کا احاطہ بہت وسیع ہوتا ہے تو یہ آپ بیتی نہ ہوئی ——— اس صنف میں مواد خود اپنی ذات سے پیدا ہوتا ہے خود کوزہ و خود کوزہ گر خود ہی مجرم خود گواہ ——— خود ہی جج ——— آپ بیتی میں اس کی گنجائش نہیں کہ لکھنے والا شاعر اور افسانہ نگار کی طرح تخیل اور تصور پر اپنی دنیا آباد کرے کیونکہ خود نوشت میں صداقت خصوصی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے خود نوشت

130/61

سوانح حیات، سوانح حیات سے بھی زیادہ دل چسپ چیز ہو۔ اس میں ہمیں شخصیت کے ایسے مظاہر ملتے ہیں جن سے مصنف کے علاوہ اور کوئی واقف نہیں ہوتا اس میں فن کار کی داخلی اور خارجی زندگی یکجا ہوتی ہو۔

آپ بیتی میں اتنا ہی تنوع اور رنگا رنگی ہے جتنا کہ ایک زندگی میں ہوتا ہو اس لیے اس کے کوئی بندھے ٹکے اصول نہیں ۔ تاہم تین شرطوں کی احتیاط اور ضرورت پیش آتی ہو اور ایک جامع خود نوشت میں پڑھنے والا تین چیزوں کی تلاش اور توقع ضرور کرتا ہو۔

۱۔ سچّائی
۲۔ شخصیت
۳۔ فن

سچّائی سچّائی اور حقیقت نگاری شخصی تحریر کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہو۔ دراصل سچائی ہی وہ روح ہو جس کی بدولت خود نوشت کے صفحات میں ہماری زندگی دوبارہ متحرک اور جاندار ہو کر سامنے آتی ہو۔ اور جس سے عہدہ برآ ہونا خود نوشت کی دوسری شرائط کے مقابلے میں سب سے زیادہ مشکل ہو۔ اپنے گزرے ہوئے شب و روز کو ذہن کے پردوں پر سمیٹ کر یکجا کرنا ــــ بچپن کی عکاسی کے لیے تخیل پر وہی بے لوث سادگی اور بے ضرر معصومیت طاری کر لینا اور جوانی کی تصویر کشی کے لیے جذبات اور احساسات میں حرارت اور تازگی پیدا کرنا آسان کام نہیں ــــ ایک اچھی اور حقیقت فروز خود نوشت لکھنے میں جو چیز سب سے زیادہ حارج ہوتی ہو وہ خود فن کار کی انا ہو۔ کوئی بھی نہیں چاہتا کہ وہ اپنے اعترافات کی بنا پر اس سے کم تر درجے کا ثابت ہو جیسا کہ عام طور پر لوگ اسے سمجھتے ہیں۔ اسی لیے اپنی شخصیت اور انا

کی پرواخت کا خیال رکھنے والے کبھی اچھی خود نوشت سوانح حیات نہیں لکھ سکتے جیسا کہ ڈنٹن نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے:۔

"انسانی فطرت میں جو غرور اور اپنی زندگی کے ساتھ محبت ہے اس کے لیے بڑا دشوار ہے کہ وہ اپنی سرگزشت کا تجزیہ کرے اور اپنی خامیوں اور غلطیوں کو یکجا کرے ـــــ"

فرانس کے نامور ادیب آندرے ماروے Andre Maurois نے گوئٹے کو آپ بیتی لکھنے والوں میں اس لیے دانش مند ترین گردانا ہے کہ گوئٹے نے اپنی زندگی کی کہانی کو "شاعری اور سچائی کا مرکب" کہا تھا خود نوشت سوانح حیات شاعری اور سچائی کا خوب صورت امتزاج ہے۔ شاعری سے مراد طرز نگارش اور اسلوب بیان ہے۔ اپنی زندگی کے حالات سپاٹ انداز میں بیان کیے جائیں تو ادب کی چاشنی نہ آسکے گی۔ اس لیے سچائی پر شاعرانہ انداز بیان کا غلاف دل چسپی پیدا کرنے اور دل چسپی برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ ایک کامیاب آپ بیتی میں حقیقت نگاری کیا ہے؟ اس ضمن میں سر سید رضا علی کا یہ جملہ بہت معنی خیز ہے۔

"ـــــ میرے نزدیک اپنے لکھے ہوئے سوانح حیات کی سب سے بڑی صفت یہ ہونی چاہیے کہ ایک مرتبہ کراماً کاتبین بھی سامنے آکر بہ آواز بلند پڑھ لیں تو پڑھنے والے کو آنکھ نیچی نہ کرنی پڑے ـــــ" [1]

خالص یادداشت قابل اعتبار نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے بہت سے مصنفوں نے اپنی زندگی کے مختلف مرحلوں کی وقتاً فوقتاً خاص خاص باتیں قلم بند کرلیں تاکہ حافظہ جواب دے جائے تو ان تحریروں سے دماغ اور حافظے کو تازہ

---

[1] اعمال نامہ۔ از سر سید رضا علی۔ دیباچہ صفحہ ع ج

کرلیا جائے بچپن کی بہت سی باتیں دوسروں کی سُنی سنائی ذہن کے کسی گوشے میں پڑی رہ جاتی ہیں۔ ہربرٹ اسپنسر جب اپنی خود نوشت سوانح حیات لکھنے بیٹھے تو انھوں نے سائنسی نقطۂ نظر سے کام لینے کا تہیہ کیا۔ لیکن بالآخر ان کو اعتراف کرنا پڑا کہ ان کی بچپن کی اپنی اصلی یادیں گنتی کی اور محدود ہیں جن کی حیثیت محض تاثرات کی ہے۔ بہرحال بچپن کی بعض سرگزشتیں ایسی ہیں جن سے سچائی پھوٹی پڑتی ہے اس کی تین مثالیں دی جا سکتی ہیں:-

۱- ٹالسٹائی کی اپنی کہانی

۲- Maurice Barring کی Puppet show

۳- Forrest Reid کی Apostate

بہرکیف دانستہ طور پر غلط بیانی کرنا اور کسی واقعہ کا حافظے سے محو ہو جانا اور غلط بات یاد رہ جانے کی وجہ سے جھوٹ کا سرزد ہو جانا بالکل مختلف بات ہے سرسید رضا علی نے غالباً حقیقت نگاری اور سچائی کے باریک فرق کو نظر انداز کر کے اپنی خود نوشت اعمال نامہ کے دیباچے میں لکھا ہے:-

> "میں نے یہ تہیہ کر کے قلم اٹھایا ہے کہ واقعات کو اصل صورت میں پیش کروں گا موجودہ فن تجدید شباب Rejuvenation کے ماہرین کی طرح یہ ہرگز کبھی جائز نہ رکھوں گا کہ آنکھیں ماتھے پر پہونچ جائیں نیچے کا ہونٹ ٹھوڑی پر پڑا ہو یا دونوں کان گلے کا ہار ہو جائیں حقیقت نگاری بڑا مشکل کام ہے بالخصوص جب انسان خود اپنی کہانی لکھنے بیٹھے میری تمام تر کوشش یہ رہی ہے کہ انصاف سے کام لوں کسی کا رنگ پھیکا نہ پڑے نہ زیادہ گہرا ہونے پائے۔" [۱]

---

[۱] سرسید رضا علی۔ اعمال نامہ۔ دیباچہ صفحہ ج

اسی دیباچے میں انھوں نے یہ بات بھی لکھی ہے۔

"میرے گلدستے میں دونوں قسم کے پھول ملیں گے میں نے حقیقت نگاری کو ملحوظ رکھا ہے مغربی ممالک میں سوانح حیات لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ بیتی کے ساتھ جگ بیتی بھی بیان کی جاتی ہے ـــــ دنیا میں واقعات کا سلسلہ اتنا مربوط ہوتا ہے کہ اپنی کہانی اس صورت میں پوری ہو سکتی ہے کہ جب دوسروں کے حالات بھی درج کیے جائیں ـــــ" [1]

مصنف اپنے حالات بے کم و کاست اور سچ سچ بیان کرنے کے لیے بہتر سے بہتر معلومات حاصل کرتا ہے۔ لیکن جب قلم اٹھاتا ہے تو لغزشیں بار بار ہوتی ہیں دراصل غیر شعوری طور پر ایک سنسر شپ بھی ساتھ چلتی رہتی ہے انگریزی میں اس کی چند مثالیں Cassel کے انسائیکلو پیڈیا میں پیش کی گئی ہیں:۔

" The autobiographer whether consciously or not censors what is unpleasing to him. We remember the facts we want to remember, we forget those that have wounded our self esteem. Even writers who pride themselves on their frankness (Andre Gide is a good example) exercise only that part which is conditioned by their temperament or their ideas. They confess the actions which others might regard as blame-worthy, but omit those that contradict the portrait they have drawn them selves Ouite often they distort events of the past in order to bring them into harmony with their own later views on politics, religion or love."

---

[1] سر سید رضا علی۔ اعمال نامہ۔ دیباچہ صفحہ ح

"خود نوشت لکھنے والا شعوری یا غیر شعوری طور پر ان تمام باتوں کو حذف کر جاتا ہے۔ جو اس کے لیے ناخوشگوار ہوتی ہیں ہم ان حقائق کو یاد رکھتے ہیں جنھیں ہم یاد رکھنا چاہتے ہیں ہم ان باتوں کو بھول جاتے ہیں جن سے ہماری خود پسندی مجروح ہوتی ہے (اندرے گائیڈ اس کی ایک اچھی مثال ہے) اس کے بس اس جز سے کام لیتے ہیں جو ان کے مزاج یا تصورات سے ہم آہنگ ہو، وہ ایسے افعال کا اقرار کر لیتے ہیں جنھیں دیگر لوگ ممکن ہے کہ قابل اعتراض تصور کریں لیکن ایسی باتوں کو حذف کر جاتے ہیں جو ان کی اپنی بنائی ہوئی تصویر سے متصادم ہو، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ماضی کے واقعات مسخ کر دیتے ہیں تاکہ سیاست، مذہب یا محبت سے متعلق ان کے اپنے بعد کے تصورات سے ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔" ؎

اسی لیے دوسری اصناف سخن میں سچائی کی جو اہمیت ہے خود نوشت میں اس کی اہمیت کئی گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس تحریر میں فن کا تانا بانا جس کے گرد بنا جاتا ہے اور جو بنتا ہے۔ دونوں ایک ہی شخصیت ہوتی ہے اس لیے مصنف کی ذمہ داری کچھ اور زیادہ ہو جاتی ہے۔

"اینی بیسنٹ اپنی سرگزشت حیات میں ایک جگہ لکھتی ہیں:۔
ایک زندگی کی کہانی لکھنی مشکل ہے اور جب یہ کہانی کسی کی اپنی ہو تو بہت مشکل ہے۔"

شاید اسی لیے بڑی دل کشی اور گنجائش رکھنے کے باوجود اردو میں خود نوشت

CASSELLS ENCYCLOPAEDIA Page 62 ؎

سوانح حیات بہت کم لکھی گئیں ـــــ بہت سے لوگوں نے غالباً اس لیے خود نوشت سوانح حیات نہیں لکھی کہ وہ یہ ہمت اور حوصلہ نہیں رکھتے تھے کہ اپنی زندگی کے بعض گوشوں سے پردہ اٹھا سکیں، اور ان کی ادبی دیانت نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ وہ حقیقت کو افسانہ بنا کر پیش کریں۔ یعنی جو وہ خود واقعی تھے اس کے علاوہ کسی اور طریقہ سے خود کو پیش کریں۔ اپنی ذات کو سمجھ لینا اور اپنی خامیوں اور خوبیوں کو پہچاننا علاحدہ چیز ہے اور ان کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا دوسری چیز ہے۔ ادب کی دوسری اصناف کی طرح مقبولیت اور تاثر کا جادو جگانے کے لیے سچائی اور حقیقت کا منتر یاد ہونا ضروری ہے۔ ورنہ ساری محنت بے کار جائے گی ـــــ آپ بیتی کے لیے یہ سب سے مشکل اور سب سے اہم ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شرط کا پورا کرنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے دوسری اصناف ادب کے مقابلے میں خود نوشت لکھنے والا خود ہی شاہد اور خود ہی ناقد ہے اس لیے اس میں دشواری بھی زیادہ ہے۔ اکثر خود نوشت لکھتے وقت مصنف اپنے حالات کے بجائے اُس تصوراتی مثالی ہستی کے حالات بیان کرنے لگتا ہے جیسا کہ وہ ہوتا نہیں مگر ہونا چاہتا ہے اور پڑھنے والے کے سامنے کٹھ پتلی کی سرگزشت آتی ہے جو نہ دل کے لیے کشش رکھتی ہے نہ دماغ کے لیے۔ ـــــ خود نوشت سوانح حیات لکھتے وقت جس بے باک سچائی کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بغیر وہ نہ خود نوشت کے معیار پر پوری اترتی ہے اور نہ ہی پڑھنے والے کے لیے اپنے اندر کوئی دلچسپی رکھتی ہے۔ اگر خود نوشت نگار حقیقت سے دامن بچاتا ہے تو سب سے بڑا نقصان خود اس کا اپنا ہوتا ہے ـــــ کیونکہ پردہ داری اور غلط بیانی سے اس کی زندگی میں سپاٹ پن اور جھول پیدا ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر نے دیوان سنگھ مفتوں کی خود نوشت سوانح حیات "ناقابل فراموش" کا تعارف کراتے ہوئے برملا گوئی پر زور دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:-

"ہندوستان میں برملا گوئی کا دستور عام نہیں اور اردو نثر میں اس طرح کی تحریریں بہت کم ہیں جن میں زندگی کے حالات صاف صاف بیان کیے گئے ہیں۔ جو ہوں بھی تو ضروری نہیں کہ مصنف کی زندگی اس طرح کی ہو کہ ہر شخص کو اس میں دل چسپی ہو — اور پھر یہ بھی ہوتا ہو کہ جن لوگوں کی زندگی دلچسپ ہوتی ہو وہ ہر قسم کا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والا اکتا جاتا ہو یا نہیں تو زیب داستان کے لیے اس طرح رنگ آمیزی کی جاتی ہے کہ واقعہ قصہ اور قصہ داستان بن جاتا ہے —" [۵]

اسی لیے صرف اردو میں ہی نہیں بلکہ جب ہم دنیائے ادب کی اہم آپ بیتیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہو کہ صرف انھیں تخلیقات کو قبولیت عام اور بقائے دوام کے دربار میں رسائی حاصل ہوتی ہو جن میں حقیقت بیانی سے کام لیا گیا تھا۔ خواہ وہ روسو کے بے باک "اعترافات" ہوں یا جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی برات"

ان کی مقبولیت کا راز وہ بے باکی ہے جس سے کام لیتے وقت وہ اپنی دیو قامت اور خوب صورت شخصیت کی Images کے مجروح ہوجانے سے بھی خوف زدہ نہیں ہوئے — اسی لیے باوجود خامیوں کے جہاں جہاں سچائی کا حسن ہو۔ خود نوشت سوانح حیات بے مثال صنف ادب ہو —

۵۔ ناقابل فراموش — دیوان سنگھ مفتوں — صفحہ ۴

شخصیت یہ بات مسلّمہ ہو کہ خود نوشت سوانح حیات میں اپنی ذات اور شخصیت ہی وہ محور ہوتی ہو جس کے گرد تصنیف کا تانا بانا بُنا جاتا ہو شخصیت کا رنگ کہیں شوخ ہوتا ہو اور کہیں ہلکا ہوتا ہو اس کا انحصار صاحب تصنیف کے اپنے مزاج، میلان اور رجحانات پر ہوتا ہو آپ بیتی بنیادی طور پر داخلی خصوصیات اور واردات کو اپنے جلو میں لے کر نکلتی ہو۔ مصنف اپنی ذات کا خمیر اٹھاتا ہو اور اس کی کامیابی اور ناکامیابی کا انحصار خود اس کے قلم پر ہوتا ہو یہ فطرت انسانی کی کمزوری ہو کہ ہر شخص خود اپنے آپ سے محبت میں مبتلا ہو۔ آپ بیتی چونکہ خود اپنی ذات کا نقش ہو اس لیے ہر شخص اپنے بعد بھی اپنا وجود کسی نہ کسی شکل میں دیکھنا چاہتا ہو۔ ایک اچھی خود نوشت سوانح حیات ہمارے سامنے شخصیت کا بڑا دلچسپ روپ رکھتی ہے جس میں زندگی حقیقت کے اس لباس میں بے حجاب فطری انداز میں آکھڑی ہوتی ہو جیسی کہ وہ ہوتی ہو۔ یہی سادگی اور معصومیت حسن ہو اور یہ حسن زندگی کی ایک بڑی حقیقت ہے ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر ناقابل فراموش کے تعارف میں لکھتے ہیں:۔

> "بیشتر واقعات بظاہر اور لوگوں سے متعلق ہیں مگر ان کا راوی سے اتنا تعلق ہو یا اس قدر انہماک ہو کہ ان میں سے اس کا کردار، اپنی شخصیت اپنے آپ پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہو۔"[1]

خود نوشت سوانح حیات اپنی ذات کا پرتو ہو۔ وہ خود نوشت ادبی دیانت کا نتیجہ نہیں کہی جا سکتی جو اپنے ہم عصروں پر اپنی فوقیت ظاہر کرنے کے لیے لکھی گئی ہو ـــــ ایک اچھی خود نوشت میں زندگی کے

---

[1] ناقابل فراموش ـــــ دیوان سنگھ مفتوں ـــــ دیباچہ ایم ڈی تاثیر صفحہ

حالات بتدریج اس طرح بیان کیے جاتے ہیں جیسے کہ وہ زندگی میں پیش آئے ہوتے ہیں۔ زندگی کے سرد و گرم، نشیب و فراز کو یادوں کی حرارت سے متحرک کرنے کے لیے بڑی ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگرچہ ہماری زندگی اپنے تنوع کے باعث اتنی رنگا رنگ اور طولانی واقع ہوئی ہے کہ پوری زندگی کو صفحات پر سمیٹنا بڑا مشکل کام ہے ایک اچھا فن کار ہمیشہ یہ خیال رکھتا ہے کہ تصنیف نہ تو قارئین کے لیے بار ہو اور نہ ہی کوئی ضروری بات لکھنے سے رہ جائے کہ پڑھنے والے کو واقعات کے درمیان خلا کا احساس ہو ـــــ

اپنے ذوق، شوق، پسند و ناپسند کا تذکرہ ضروری ہے۔ مگر پند و نصیحت کے دفتر کھولنا۔ مختلف دلیلوں اور ثبوتوں سے اپنے سیاسی۔ مذہبی نظریات کی تلقین کرنا پڑھنے والے کے ذوق پر ناخوشگوار اثر ڈالتا ہے اور خود پڑھنے والے کی شخصیت افکار کے ہجوم میں کھو جاتی ہے۔ اپنے حسب و نسب اور آباؤ اجداد کا غیر ضروری ذکر خود نوشت سوانح حیات کو تذکرہ بنا دیتا ہے اس طرح آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے اور آپ بیتی کا ذاتی حسن ختم ہو جاتا ہے۔

خود نوشت میں شخصیت نگاری کا ایک اور پہلو ہے کہ خود نوشت سوانح حیات عموماً بڑھاپے کی تخلیق ہوا کرتی ہے پچاس۔ ساٹھ۔ ستر اور اس سے زیادہ عمر میں لوگوں نے خود نوشت سوانح حیات لکھنے پر توجہ کی ہے۔ یہ زمانہ زیادہ پختگی کا ہوتا ہے اور اس میں کسی بنیادی تبدیلی کا امکان نہیں رہ جاتا ہے اس کلیہ کا اطلاق صرف مستقل اور باقاعدہ تصنیف پر ہوتا ہے۔ خطوط، سفرنامے اور روزنامچے وغیرہ پر نہیں جن میں شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ مگر وہ کسی بھی عمر میں لکھے جا سکتے ہیں۔ جبکہ سرگرم ترین دور کے گزار چکنے کے بعد

آپ بیتی لکھنے کی طرف توجہ کی جاتی ہو اس مرحلہ پر پہونچنے کے بعد پیچھے مڑ کر سارے واقعات پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جاسکتی ہے اور یہ انتخاب آسانی سے کیا جاسکتا ہے کہ اپنی شخصیت کا کون سا پہلو گفتنی ہے اور کون ناگفتنی!

—— معمر آدمی فطرتاً قدامت پسند ہو جاتا ہے لیکن بعض لوگ ایسے بھی ملیں گے جو بوڑھے ہو کر اپنی آزادروی، برملاگوئی اور بے باکی کو برقرار رکھیں گے، جوش ملیح آبادی کی تصنیف "یادوں کی برات" اس کی زندہ مثال ہے۔ دوسری طرف سرسید رضا علی نظر آتے ہیں۔ جو پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ کچھ حضرات اپنی ذات اور شخصیت کو اجاگر کر دینے میں سارا زور قلم صرف کر دیتے ہیں لیکن ایسے بھی منکسر مزاج لوگ ملیں گے جو اپنی شخصیت کا ضمناً ذکر کریں گے اور ساتھ ہی دوسروں کے حالات نمایاں کریں گے مثال کے طور پر حکیم احمد شجاع نے اپنی خود نوشت سوانح حیات "خوں بہا" کے تعارف میں لکھا ہے:۔

"—— اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں بہت اجمال کے ساتھ وہ حالات اور وہ واقعات بیان کر دوں جن کے سیلِ رواں کے ساتھ ساتھ میں اپنی عمر کے گزرے ہوئے زمانے میں بہتا ہوا چلا آیا ہوں —— اپنے حالات کے بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں کہ میں کسی ذاتی اہمیت یا شخصی فوقیت کے لیے بہانہ تلاش کروں مدعا فقط یہ ہے کہ اس سلسلے میں ان نامور بزرگوں کا بھی ذکر کیا جائے جن کے فیضِ صحبت سے ازلی مناسبت کو اکتسابات دانش کی سعادت میسر آئی —" [1]

---

[1] خوں بہا —— حکیم احمد شجاع —— دیباچہ صفحہ ۱۰

آپ بیتی کے اندر جگ بیتی کس قدر ہو اس کا فیصلہ مصنف کی شرست کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا ۔ لیکن خود نوشت کا منظر عام پر آنا خود اس حقیقت کا غماز ہے کہ صاحب تصنیف اپنی شخصیت کے جلوے دکھانے کے لیے بے چین ہے وہ اس سیر بین کے ذریعہ اپنی ذات کی جھلکیاں دکھاتا ہے ۔

اظہار ذات کے لیے دفتر کے دفتر سیاہ کیے جا سکتے ہیں شخصیت کے اظہار کے لیے اشہب قلم پر کوئی بندش اس کے سوا نہیں ہوتی جو مصنف خود عائد کرے کوئی پابندی اس بارے میں نہ ہے اور نہ ہی ہو سکتی ہے کہ آپ بیتی کی ضخامت کیا ہو؟ طوالت کی کیا حدیں رکھی جائیں ۔ البتہ لکھنے والے کی ایک عوامی شخصیت ہونی چاہیے ۔ شاعر اور نثار کے عوامی ہونے کا ایک ایسا خاص مفہوم ہوتا ہے ۔ جس کی صراحت اور وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے اسی طرح صحافی ۔ فوجی افسر ۔ مصور ۔ نقاش ۔ سیاست داں ۔ ماہر تعمیر ۔ سائنس داں ۔ مجاہد آزادی ۔ سرکاری افسر اور ماہر تعلیم بہت ہوتے ہیں لیکن خود نوشت کے مصنف وہی ہوتے ہیں جن کی اپنی ذات اور شخصیت خاصی عوامی اور نمایاں رہی ہو ۔ کبھی کبھی شخصیت کا اظہار نسلی تفاخر کے اظہار کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے مثلاً مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی خود نوشت سوانح حیات "نقش حیات" میں خاصہ زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ وہ ٹانڈے سے متعلق ہونے کے باوجود بنکروں والی انصاری برادری سے تعلق نہیں رکھتے ہیں ۔ سید سلیمان ندوی نے اپنی ذات اور شخصیت سے زیادہ اپنی علمی شخصیت کے نشو و نما کی جو تصویر کھینچی ہے ۔ وہ آئینے کی طرح صاف ہے اس میں انھوں نے اپنے ذہنی نشو و نما کے ایک ایک مرحلے کا بڑا واضح مرقع

پیش کیا ہے۔ اور جن جن علماء اور بزرگوں سے استفادہ کیا ہے۔ اس کا کھل کر اظہار ملتا ہے۔

ایک ہی شخصیت کا نقشہ جب دو مختلف قلموں کے ذریعے کھینچا جاتا ہے تو یہ یکساں بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی متضاد بھی۔ بعض شخصیتیں اتنی غیر متنازعہ ہوتی ہیں کہ نہ صرف وہ اپنی خودنوشت میں تعریف کا تاثر دیتی ہیں بلکہ دوسرے لوگ ان کی جو سوانح لکھتے ہیں اس میں اسی قسم کا تاثر ملتا ہے متضاد تصویروں کے زمرے میں مثال کے طور پر خواجہ حسن نظامی نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی آپ بیتی اور روزنامچے میں جو تصویر کھینچتے ہیں وہ بڑی صاف اور نکھری نکھری ہے لیکن دیوان سنگھ مفتوں اپنی خودنوشت سوانح حیات میں خواجہ حسن نظامی کے لیے رقم طراز ہیں:۔

"۔۔۔ خواجہ حسن نظامی اپنے اخبار منادی میں دن رات اپنی تعریفیں کرتے ہیں مگر کیا ایک شخص آپ کو ایسا ملے گا جو ان کو سیاسی چار سو بیس اور مذہبی فراڈ نہ سمجھتا ہو ۔۔۔" [1]

اس سلسلے میں ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ دیوان سنگھ مفتوں نے اپنی اس کتاب میں اپنی دیانت داری کا بار بار ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کے بارے میں عام تاثر یہ رہا ہے کہ وہ اپنے اخبار کے ذریعہ والیان ریاست کو بلیک میل کرتے تھے۔

خودنوشت سوانح حیات لکھتے وقت مصنف کی اپنی شخصیت ایک ایسا محور ہوتی ہے جس کے گرد پوری تصنیف گھومتی ہے۔ خودنوشت سوانح حیات میں اپنی ذات سے متعلق خود ہی بیان دیئے جاتے ہیں۔ اپنی شخصیت کو

---

[1] ناقابل فراموش ۔۔۔ دیوان سنگھ مفتوں ۔۔۔ صفحہ ۳۲

پیش کرنے کے اس مخصوص انداز کی کئی غرض و غایت ہو سکتی ہیں۔

۱۔ اپنے حالات سے دوسروں کو روشناس کرانا

۲۔ اپنی شخصیت اور کردار کی اہمیت کا مرقع پیش کرنا۔

۳۔ اپنی ذات پر گزرنے والے حالات اور تجربات سے دوسروں کو روشناس کرانا۔ اور کسی عام غلط فہمی کا ازالہ کرنا۔

۴۔ اپنے حالات اگر ایسے ہیں جس میں محنت کر کے غیر معمولی ترقی حاصل کی گئی ہے تو دوسروں کو اس کی ترغیب دلانا ۔۔۔!

۵۔ اپنے زمانے کے سیاسی سماجی۔ ادبی حالات کو اپنے زاویہ نگاہ سے پیش کرنا اور اپنی زندگی کے آدرشوں کی تبلیغ کرنا۔

۶۔ اپنے ہم عصروں سے اپنے تعلقات واضح کرنا اور ان کے اعمال اور افعال پر تنقید کرنا۔۔۔

بہرکیف خود نوشت سوانح حیات ایک نجی چیز ہوتی ہے اور اس میں لکھنے والے کو اپنی زندگی سے متعلق، اپنے زمانے کے دوسرے امور اور افراد کے متعلق بہت آزادی سے اظہار خیال کا موقع ملتا ہے۔

کوئی شخص واقعی کیا ہے؟ یہ دوسروں کے لیے ہی نہیں خود اس شخص کے لیے بھی صحیح طور پر سمجھ سکنا قریب قریب ناممکن ہے۔ انسانی شعور کسی میکانکی عمل سے مخصوص سانچوں میں نہیں ڈھالے جاتے وہ میراث۔ احول مواقع۔ حالات۔ تربیت۔ صحبت تعلیم وغیرہ کا مجموعہ ہوتے ہیں نفسیاتی ردّ و قبول اور تحت الشعور کی پیچیدگیاں اسے قریب قریب ایک عقدۂ لاینحل بنا دیتی ہیں، جسے ہم ایک شخصیت سمجھتے ہیں وہ فی الواقع کئی متضاد اور متناقض شخصیتوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے۔

کوئی شخص اپنی شخصیت کا جو مجموعی نقش یا تاثر چھوڑتا ہے اس کو تین پہلوؤں سے جانچا جا سکتا ہے۔

پہلا یہ کہ وہ در حقیقت کیا ہے؟

دوسرا یہ کہ وہ دوسروں کے لیے اپنی شخصیت کا کیا پیکر پیش کرنا چاہتا ہے

تیسرا یہ کہ لوگ اسے کیا سمجھتے ہیں؟

کسی فرد کی شخصیت کی خود نوشت سوانح حیات سے بہتر تصویر کشی نہیں ہو سکتی۔ بشرطیکہ خود نوشت سوانح حیات دیانت داری اور خلوص نیت سے لکھی گئی ہو، لیکن کتنے افراد میں یہ ہمت اور حوصلہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو اپنے اصلی رنگ روپ میں دیکھ سکیں چہ جائیکہ اپنے ڈھکے چھپے خد و خال کو سر بازار پیش کر سکیں۔ اسی لیے اپنی کہانی اپنی زبانی سناتے وقت اکثر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ اپنی شخصیت کو ظاہر کرنے کے لیے جتنے پردے اس پر سے اٹھائے جا رہے ہیں اس سے زیادہ اس پر ڈالے جا رہے ہیں۔

عام طور پر خود نوشت سوانح حیات لکھنے سے گریز کی جو چند وجوہات سامنے آتی ہیں وہ یہ بھی ہیں کہ ہر شخص نہیں چاہتا کہ وہ اپنے نجی حالات کو سر بازار ظاہر کر دے۔

مانیٹگ۔ نے خود نوشت سوانح حیات کی اسی دشواری کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

"There is no description equal in difficulty to a description of one self"

"اپنی ذات کی بابت بیان سے زیادہ دشوار کوئی بیان نہیں ہو سکتا۔"

فن خود نوشت سوانح حیات کی تیسری اور اہم خصوصیت یہ ہو کہ خود نوشت محض یادداشت نہیں بلکہ فن کا حصہ بھی ہے ایک اچھی خود نوشت صرف تاریخی نہیں بلکہ ادبی کارنامہ بھی ہے۔ کہانیوں اور افسانوں کو حقیقت کا جامہ پہنایا جاتا ہے۔ اور یہاں حقیقت خوب صورت الفاظ میں ملبوس سامنے آتی ہے اگر سرِ دلبراں کو حدیث دیگراں میں پیش کرنا فن ہے تو سر دلبراں بیان کرنے کی بیباکی کو فن کی معراج کہا جائے گا یہ بے باکی اور جرات رندانہ صرف خود نوشت نگار کے نصیب میں آتی ہو۔ فن اظہار ذات کا دوسرا نام ہو چونکہ خود نوشت سوانح حیات کا تعلق ہمارے شدید داخلی جذبات سے ہے اس لیے اسے فن کی اعلیٰ اقدار میں شامل کیا جائے گا

خود نوشت کو ہم اعتراف بھی کہہ سکتے ہیں مسیحی اعتقادات میں اپنی غلطیوں کے اعتراف سے جو ندامت ہوتی ہے وہ گناہوں کو دھو دیتی ہو اور اعتراف کرنے والے کی روح پاکیزہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے آپ بیتی میں ایک عرفانی رنگ بھی ملتا ہے۔ ادب میں خود نوشت سوانح حیات کو فن کی حیثیت سے تسلیم کیا جا رہا ہے اور ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہو صورت حال کچھ ایسی ہی ہے کہ مصنف کا ادب میں کوئی مقام نہیں ہوتا ہے لیکن اس کی تصنیف کو صنف ادب کا جزو مان لیا جاتا ہے۔ کیونکہ اردو ادب میں اکثر خود نوشت سوانح حیات ان لوگوں کی ہیں جن کا ادب اور فن کی دنیا میں کوئی مقام نہیں ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک مثال چودھری خلیق الزماں کی ہو۔ سیاست میں ان کا ایک نمایاں مقام تھا۔ لیکن وہ صرف نام کے صحافی تھے ان کی اپنے اخبار میں کوئی قلمی معاونت نہیں ہوتی تھی۔ پھر برسوں بعد وہ انگریزی

میں نسبتاً مختصر اور اردو میں نسبتاً ضخیم خود نوشت سوانح حیات کے ساتھ جلوہ گر ہوئے سوال یہ ہے کہ کیا ان شخصیات کی جن کا ادب میں کوئی مرتبہ اور درجہ نہیں ہے خود نوشت کو ادب میں داخل کیا جائے؟

ایک طبقہ شمولیت کی وکالت اس بنا پر کر سکتا ہے کہ اگر تمام غیر ادبی شخصیتوں کی اس قسم کی تصنیفات کو خارج کیا گیا تو خود نوشت کا ذخیرہ اردو میں بہت محدود ہو کر رہ جائے گا۔ اس لئے مصلحت کا تقاضہ یہ ہے کہ جو کچھ آتا ہے اُسے سمیٹ لیا جائے دوسرا خالص پسندوں کا طبقہ اس پر ناک بھوں سکوڑ سکتا ہے۔ اور یہ اصرار کر سکتا ہے کہ ایسی تمام تصنیفات کو اس برادری سے باہر رکھا جائے بالفاظ دیگر تصانیف خواہ کم ہوں مگر ان پر ادب کی ہر اعتبار سے چھاپ لگی ہو —— اس سلسلہ میں ایک راستہ یہ بھی ہے کہ بہتر اور کمتر درجے کی حد بندی کر لی جائے۔

ظاہر ہے کہ آپ بیتی ہر ایرا غیرا نہیں لکھتا اس کا مصنف ہمیشہ نمایاں شخصیت کا مالک اور صاحب کمال ہوتا ہے یہ کمال ضروری نہیں کمال ادب ہو۔ سیاست۔ فوج۔ مصوری۔ نقاشی۔ کھیل کود غرضیکہ زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ممکن ہے۔ نثر ایک وسیلہ ہے جس میں ہر شخص اچھا بُرا اظہار خیال کر سکتا ہے۔ ہر انجینئر۔ ماہر تعمیر اور مصور۔ نقاش اور اسپورٹس مین شاعری کی ہمت نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی قیود اظہار خیال میں رکاوٹ بن جاتی ہیں لیکن ان میں سے ہر شخص اگر تھوڑی سی زبان پر قدرت رکھتا ہو تو اپنے حالات زندگی نثر میں بیان کر کے اپنی ذات اور اس میں موجزن خیالات سے دنیا کو بُرا بھلا روشناس کرا سکتا ہے۔

اظہار ذات فن ہے اور خود نوشت سوانح حیات خالص فن کی شکل ہو

جو ادب کی دنیا میں ایک انوکھے طرز سے داخل ہوتا ہے اور اسے مالا مال کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

خود نوشت سوانح حیات لکھتے وقت فن کے نقطۂ نگاہ سے جو آزادی زبان و بیان درکار ہوتی ہے وہ ہندوستان میں حصول آزادی سے پیشتر مفقود تھی ہندوستان میں فوجی افسروں نے ریٹائر ہونے کے بعد آپ بیتیاں لکھیں اور پاکستان میں بھی ایسا ہی ہوا —— مگر زیادہ تر انگریزی میں لکھی گئیں۔ —— انگریزی راج کے اثر سے اور اس بنا پر بھی کہ انگریزی زبان تفاخر کی علامت ہے آپ بیتیاں اکثر انگریزی میں لکھی گئیں ——

فوجی زندگی یوں بھی رنگا رنگ۔ بے فکری، خطرات اور مہمات سے بھرپور ہوتی ہے پاکستان میں ایک عرصہ تک فوج کا غلبہ رہا۔ پاکستان کے جنرل اعظم خاں اور کرنل محمد خاں نے خود نوشت سوانح حیات کے لیے اردو کا وسیلہ اختیار کیا اور فیلڈ مارشل ایوب خاں کی آپ بیتی Friends Not Masters انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئی۔

Cassel's Encyclopaedia of Literature میں خود نوشت کو فن کی حیثیت سے برقرار رکھنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

آپ بیتی لکھنے والا اگر اپنی کہانی کو فن پارہ سمجھنے کا خواہش مند ہو تو جمالیاتی اسباب کی بنا پر کئی حقائق کو حذف کر دینے پر خود کو مجبور پاتا ہے خود نوشت کے مصنف کے لیے یہ بات لازم ہو کہ اپنی روزمرہ کی روکھی پھیکی باتوں کو ضرورتاً دہرائے اور اپنی توجہ اہمیت رکھنے والے قصوں۔ کاموں اور خصوصیات پر مرکوز رکھے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو کئی کئی جلدوں والے وسیع سلسلے پڑھنے کے لائق نہ رہ

جائیں گے۔"

"The autobiographer if he wishes to treat his story as a work of art finds himself compelled to eliminate many facts for aesthetic reasons, the autobiographer must of nacessity suppress the crdinary humdrum of daily existence and concentrate his attention on dominant episodcs, actions and characteristics. It he does not do so the vast serles of necessary volumes will be unreadable"

جدید آپ بیتی مغرب میں ایک نیا رخ اختیار کر رہی ہے Psycho Analytical School کے امریکی نقاد پروفیسر البرٹ۔ ای۔ اسٹون نے اس ضمن میں لکھا ہے

"فن کارانہ تخیل حقیقت سے بھی زیادہ حقیقی ہو سکتا ہے دورِ جدید کے فن کار میں زندگی سے بیگانگی کا ایک عنصر ہوتا ہے آج کی معاشرتی اور عوامی زندگی ایسی نہیں ہے جسے فن کار گزارنا پسند کرے گا۔ وہ اس انداز کی زندگی کو ترجیح دے گا جیسی اسے فی الوقت گزارنا پڑتی ہے لیکن اس کے سوا چارہ نہیں اس لیے وہ حقیقت کی نئی شیرازہ بندی اپنے تصورات کے مطابق کرتا ہے۔"

غرضیکہ آپ بیتی کے خاکوں میں سچائی۔ شخصیت کے پرتو اور فن کی قدروں کے احساس سے رنگ بھرا جاتا ہے۔ انھیں خوبیوں کی موجودگی سے باوجود ذاتی بیان کے آپ بیتی میں ہر ایک کو متاثر کرنے والا حسن پیدا ہوتا ہے۔ سچائی کی طلسمی خاصیت اور جذبہ کی کارفرمائی کے سلسلے میں یوسف حسین خاں اپنی

Cassel's Encyclopaedia of Literature Volume I PAGE 63

آپ بیتی "یادوں کی دنیا" کے دیباچے میں رقم طراز ہیں۔

"آپ بیتی زندگی کی تاریخ بھی ہے اور ماورائے تاریخ بھی، حافظے کو کھنگالنے سے زندگی کی جو تصویر سامنے آتی ہے اس میں ایک طرح کی طلسمی خاصیت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے بشرطیکہ کہانی کہنے والا اپنے فن کے آداب کو برتنا جانتا ہو۔ خیالی نقوش جب صفحہ قرطاس پر اتارے جاتے ہیں تو جذبے کی رنگ آمیزی بھی کسی صورت میں راہ پاتی ہے اور خیالی پیکروں میں ایسی تحلیل ہو جاتی ہے کہ اسے ان سے جدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ تخلیقی مسرت میں اس سے اضافہ ہوتا ہے تاہم ادیب کے ہاتھ سے صداقت اور حقیقت کا دامن کبھی نہ چھوٹنا چاہیے اس کا سرنیاز سوائے اس کے کسی اور کے آگے خم نہیں ہو سکتا ہے جذبہ اور تخیل اگر حقیقت سے بےگانہ ہیں تو غیر متوازن ہو جائیں گے اور ان سے جو نقوش ابھریں گے دھوکے میں ڈالنے والے ہوں گے اُن سے حقیقت تک پہنچنے میں رہنمائی نہیں ہو سکتی۔" [1]

دراصل ہر تخلیق خالق کی شخصیت اس کے مزاج، عادات، افکار اور عقائد کا نچوڑ ہوتی ہے اس کے بغیر وہ بے روح اور کھوکھلی ہوگی۔ فنی اعتبار سے ایک خود نوشت تاریخی ہی نہیں ادبی کارنامہ بھی ہوتی ہے۔ افسانے میں افسانے کو حقیقت کے قریب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور خود نوشت سوانح حیات میں حقیقت خوب صورت الفاظ میں سامنے آتی ہے۔ آپ بیتی میں بے باک سچائی اور خلوص کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اس کی غرض شخصیت کو پیش کرنا ہے اور لازمی یہ ہے کہ تصنیف شخصیت کو واضح کر دے اور فن کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے صفائی اور سچائی کے ساتھ پیش کیا جائے۔

---

[1] یادوں کی دنیا — ڈاکٹر یوسف حسین خاں — دیباچہ صفحہ (ب، ح)

خود نوشت سوانح حیات اور سوانح حیات کا فرق

خود نوشت سوانح حیات اور سوانح حیات دونوں ہی سے ہمیں کسی شخص کی زندگی کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں لیکن دونوں کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے خود نوشت سوانح حیات میں ایک شخص نہ صرف اپنے متعلق خود لکھتا ہے بلکہ اپنے زاویہ نگاہ سے لکھتا ہے۔ اس کی کاوش اس بات کو نظر میں رکھ کر ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے سامنے کیا پیش کرنا چاہتا ہے، سوانح نگار کے سامنے دوسری چیز ہوتی ہے یعنی کسی شخص کو لوگ کیا سمجھتے ہیں یا انہیں کیا سمجھنا چاہیے۔ وہ اس بات کو اپنے نقطۂ نظر سے دنیا کے سامنے رکھتا ہے Chamber's Encyolopaedia میں سوانح حیات کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"سوانح حیات کسی مخصوص فرد کی زندگی اور کردار کے مسلسل بیان کا فن کارانہ اظہار ہوتا ہے اس میں یہ اضافہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ سوانح عمری سے زیادہ دل چسپ شعبہ ادب میں نہیں ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ نوع انسانی کا دلکش ترین مرکز مطالعہ ہمیشہ سے انسان رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا ۔۔۔ یہ بات اسی نوعیت کی سوانح عمری یا خود نوشت کے مقابلہ میں نظم یا کبھی کبھار کے مضمون میں کم ہی ہوتی ہے ۔" [1]

Cassel's Encyclopaedia of Literature میں سوانح عمری کی تعریف اس طرح کی گئی ہے :۔

---

[1] Chamber's Encyolopaedia Volume II Page No. 53

"سوانح عمری تاریخ کی ایک شاخ ہوتی ہے اس کا مقصد جہاں تک ہو سکے دیانت داری کے ساتھ کسی فرد کی زندگی کا بیان ہوتا ہے۔ سوانح نگار کا فرض یہ ہے کہ وہ مورخ اور مصور دونوں حیثیتوں سے کام کرے مصور کا فرض کیا ہوتا ہے؟ تصویر سازی کیلیے بیٹھنے والے شخص کی ایسی شبیہ تیار کرنا جو نہ صرف اس سے ملتی جلتی ہو بلکہ فن کا نمونہ بھی ہو۔ اور مورخ کا فرض کیا ہے؟ ٹھیک ٹھیک باتیں بیان کرنا اور حقائق کو قابل فہم انداز سے ترتیب دینا۔ حقائق کی محض فہرست مرتب کر دینا جس میں فن کاری نہ ہو — تاریخ ہے نہ ہی سوانح عمری —" [1]

یہ بات کم و بیش مسلمہ ہے کہ دنیا میں دوسروں کی سوانح حیات، پہلے لکھی گئیں اپنی کہانی اپنے قلم سے لکھنے کے فن نے بعد میں جنم لیا اول الذکر میں قدامت کی وجہ سے بڑا ذخیرہ ہے۔ آپ بیتی بعد کی چیز ہے اس لیے اس کا ذخیرہ محدود ہے۔ دونوں کو ہمجولی سمجھنے کا رجحان عام ہے۔ اس لیے کئی جگہوں پر جہاں سوانح عمری کا بیان ہوتا ہے وہاں ضمناً خود نوشت کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے۔ دونوں میں مماثلت کم اور مغائرت زیادہ ہے — خود نوشت میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مرکزی کردار مصنف کی اپنی ذات ہوتی ہے سوانح عمری میں مرکزی کردار منتخب اور متعین ہوتا ہے آپ بیتی میں مصنف آپ اپنا ہیرو ہوتا ہے۔ اور سوانح عمری میں ہیرو مصنف کی مرغوب اور محبوب ہستی ہوتی ہے۔

---

[1] Cassel's Encyclopaedia of Literature Volume I Page No. 59

خود نوشت میں یہ رجحان رہتا ہے کہ روشنی کا دائرہ مصنف کی ذات کو گھیرے رہے سوانح عمری میں مصنف اپنی ذات کو نظر انداز کر کے دوسروں کی ذات کو روشنی کے گھیرے میں رکھتا ہے خود نوشت میں آپ اپنا محاسبہ کرنے کا پہلو مضمر ہے۔ سوانح عمری میں دوسروں کا محاسبہ ہوتا ہے لیکن احتیاط کے ساتھ اور نتیجہ تقریباً ایک سا ہی نکلتا ہے۔

سوانح عمری میں پہلے لکھی جانے والی دوسری کتابوں سے استفادہ کیا جاتا ہے خود نوشت میں اس قسم کی تقریباً کوئی ضرورت ہی نہیں پیش آتی۔ سوانح عمری میں اصل دستاویزات۔ مثلاً خطوط۔ روزنامچے اور سرکاری ریکارڈ کا سہارا لینا پڑتا ہے آپ بیتی میں صحت واقعات کے خیال سے ان کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سوانح عمری میں معاصرین کے تذکرے معاون ثابت ہوتے ہیں خود نوشت میں اس کی ضرورت پیش نہیں آتی ہے۔ کیونکہ آپ بیتی لکھنے والا خود الگ اپنی دنیا آباد رکھتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں مصنف سے پہلے کسی کے قدم نہیں پہونچے۔ سوانح عمری میں اگر مصنف اپنے ہیرو کے بارے میں ذاتی واقفیت رکھتا ہے تو اسے اپنی یادداشت سے کام لینا ہوتا ہے خود نوشت میں چونکہ مصنف اپنی ذات کا واقف کار ہوتا ہے اس لیے وہ اپنی یادداشت کے بل بوتے پر اپنی آپ بیتی کی پوری عمارت تیار کر لیتا ہے۔

سوانح عمری حرف آخر نہیں ہوتی ہے کیونکہ جس کی سوانح عمری لکھی گئی ہو اس کے بارے میں تازہ معلومات کا دروانہ کبھی بند نہیں ہوتا

Dowden نے Shelley کی سوانح عمری لکھی تھی۔ جس کی اہمیت بعد میں بہت کم ہو گئی ہے کیونکہ بعد میں اس سے بہت مختلف باتیں منظر عام پر آئیں اس لیے کہا جاتا ہے کہ عظیم ترین شخصیتوں کے حالات زندگی پر وقتاً فوقتاً نظر ثانی کرنے کی اور ان کو نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ جبکہ خود نوشت سوانح حیات ایک طرح سے پتھر کی لکیر ہے۔ اس میں مصنف کی حد تک تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے یہ وصیت نامہ نہیں جسے بدلتے ہوئے حالات میں تبدیل کیا جا سکے

آپ بیتی اور سوانح عمری میں دلچسپی اور تجسس کے اعتبار سے بڑا فرق ہے خود نوشت سوانح حیات کی مقبولیت کی وجہ یہی ہے کہ لکھنے والا وہ بتاتا ہے۔ جو اس کے سوا کوئی اور نہیں جانتا اور جگ بیتی معلوم کرنے کے اور بہت سے دوسرے ذرائع ہو سکتے ہیں،

سوانح نگار اپنے موضوع کو اپنے زاویہ نگاہ سے پیش کرتا ہے اس میں سوانح نگار کی معلومات، مشاہدات اور سب سے زیادہ خود اس کے معتقدات کا ہاتھ ہوتا ہے اسی وجہ سے ایک ہی شخص کی اس کے مختلف سوانح نگار ایسی مختلف تصویریں کھینچتے ہیں کہ ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق ہی نظر نہیں آتا ہے۔ غالب کے متعلق مولانا حالی اور مرزا یگانہ کے خیالات ملاحظہ کئے جائیں۔ بنیادی طور پر واقعات ایک ہی ہیں مگر دو مصوروں نے محض رنگوں کی آمیزش کے اختلاف سے انہیں کہیں شوخ اور کہیں ہلکا کر کے دو بالکل متضاد تصویریں پیش کی ہیں۔

خود نوشت سوانح حیات کی ضرورت اور اہمیت

انسان کو حیوان ظریف کہا گیا ہے اگر اسے حیوان متجسس کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اسے اپنے گرد و پیش کی چیزوں اور باتوں اور خصوصاً انسانوں کو جاننے اور سمجھنے کا بے پناہ اشتیاق ہے، اسے اگر ایک طرف فضائے بسیط اور کائنات کے اسرار و رموز کو دریافت کرنے کی جستجو ہو تو دوسری طرف اسے یہ معلوم کرنے کا بھی شوق ہے کہ آج اس کے ہمسایہ کے گھر میں کیا پکا ہے۔ اس کا تجسس بہ یک وقت اس کی عظمت کا ضامن بھی اور اس کی جبلی کمزوری کی نشان دہی بھی کرتا ہے اس کا انحصار تجسس کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ کبھی یہ علم کی تشنگی ہوتی ہے اور کبھی محض ایک طفلانہ شوق۔ کائنات کو سمجھنا۔ پرکھنا۔ مختلف تجربات سے جانچنا اور اس کی روح تک اتر جانے کی سعی نا تمام میں لگے رہتے میں ہی دراصل انسانی عظمت اور نسل انسانی کی بقا کا راز ہے۔

زمین کی وسعتیں اور سمندر کی بیکراں گہرائیاں ہی اس کی دسترس میں نہیں بلکہ اپنی رفعت پرواز میں اس نے آسمان کو بھی بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے خنک چاندنی میں سمویا ہوا چاند صرف اس کی دل کی ناکام حسرت نہیں ہے بلکہ آج اس پر انسانی قدموں کے نشان ثبت ہیں۔ یہ بے چین فطرت یہ متلاشی نگاہیں، یہ جستجو کا جذبہ ہی جس کے تحت ہر منزل کو پیچھے چھوڑتا ہوا کاروان حیات آگے ہی آگے بڑھ رہا ہے دنیا کو سمجھنے کے لیے انسانی علم کے دو ماخذ یا ذریعے ہیں ایک علم تو وہ ہے جسے ہم خارجی مشاہدات سے حاصل کرتے ہیں۔ دوسرا خود

اپنی ذات کا مشاہدہ ہے۔ دنیا کی وسعتوں اور اس کے بے پناہ مسئلوں اور سربستہ عقدوں کے سامنے ہمیں خود اپنی ذات بالکل حقیر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم اپنی ذات کے اندر جھانک کر دیکھیں تو وہاں خود ایک جہان آباد ہے جہاں آج تک کوئی کولمبس نہیں پہونچا ہو اور نہ ہمارے سوا کسی کی رسائی ممکن ہے۔ خارجی علم کو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس دوسرے ذرائع علم ہیں اور دوسروں کے بنائے ہوئے قوانین موجود ہیں جن میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن اپنی ذات تک پہونچنے کے لیے ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ اس لیے معرفت ذات خارجی علم کی واقفیت سے زیادہ مشکل کام ہے۔

میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کیسا ہوں؟ یہ سوالات انسان کے دل میں نئے نئے زاویوں سے سر اٹھاتے رہتے ہیں چونکہ اس سوال کا جواب صرف اپنے ہی پاس ہوتا ہے اس لیے جواب بھی خود اپنی ذات سے ہی اخذ کرنا جاتا ہے۔ زندگی نت نئے تجربات کا مرکب ہے ہر سانس میں اس کا رنگ نیا اور ہر دن نیا عالم ہے ہم دنیا کو جس طرح دیکھتے ہیں جیسا محسوس کرتے ہیں جس طرح وہ ہم سے پیش آتی ہے اس کو ہم دوسروں تک پہونچانا چاہتے ہیں۔ اپنے اردگرد کی دنیا کو برتنا، اور اپنے تجربات دوسروں کے سامنے پیش کرنا انسانی جبلت بھی ہے اور آرٹ بھی فن کار کی آگہی کبھی پتھر، رچینی کی پے درپے چوٹوں سے ابھرتی ہے کبھی شفق کی سرخی یا معصوم چہرے پر بکھری ہوئی حیا سے پیدا ہونے والے خوب صورتی کے تاثرات رنگوں کا سہارا لے کر ابھرتے ہیں غرضیکہ اپنی ذات میں پیدا ہونے والے متنوع احساسات کے اظہار کا دوسرا نام فن ہے۔ اپنے اس اظہار کے ذریعے فن کار اپنی ذات میں

پیدا ہونے والی فن کارانہ بے چینی کو مطمئن کرتا ہے۔ اس کا مقصد نہ صرف
اپنی آواز کو دوسروں تک پہونچانا ہوتا ہے بلکہ اس طرح وہ خود کو بھی تسکین
دیتا ہے کیونکہ اپنی ذات بے کنار تک پہونچنے کا اس کے پاس یہی ایک
ذریعہ ہوتا ہے۔

اگر اظہار ذات کو فن سمجھا جائے تو تمام اصناف سخن میں خود نوشت سوانح
حیات فن کی ایک خالص صورت ہے ایک جاندار آپ بیتی میں لکھنے والے
کے ماتھے کی تیوریاں اس کا تبسم زیرلب، سوچنے کا انداز اور دل کے دھڑکنے
کی آواز بھی سنی جا سکتی ہے۔

بقول غلام رسول مہر:۔

"___ نفس معلومات صحیحہ کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو آپ بیتی
کو ہر دوسرے ذخیرۂ تاریخ اور ابنائے عبرت پر ترجیح حاصل ہے"[۱]

یہاں پر اس کا ذکر بھی ضروری ہے کہ دراصل آپ بیتی کی ضرورت اور
اہمیت کیا ہے یا اس کے لکھنے کا کیا مقصد ہے؟ خود نوشت سوانح حیات
کے محرکات کے بارے میں Encylopaedia Britannica میں بڑی تفصیل
کے ساتھ اس طرح درج ہے۔

"اس کے محرکات مختلف ہوتے ہیں، منجملہ دیگر باتوں کے اخلاقی اصلاح
کے لیے اپنے آپ کو پرکھنا اس کی مثال کارڈنل نیو مین کی
خوب صورت انداز میں لکھی ہوئی تصنیف

"Apologia pro Snavita" 1864 حسین یادوں اور پرانی باتوں
کو تروتازہ کرنے کی کوشش مثلاً سلا بیسگر لوف

---

[۱] آپ بیتیوں کی اہمیت۔ غلام رسول مہر۔ نقوش لاہور جون ۱۹۶۴ء صفحہ ۳۸

"Marbaka" 1922 کی تصنیف Salma Lager Lofs

یہ عقیدہ کہ ممکن ہے کہ اپنے تجربات دوسروں کے لیے معاون ہوں مثلاً ہیلن کیلر کی The Story of My Life ابھی

ہوئی دنیا میں اپنی ذات کی واضح سمت متعین کرنے کی شوق بھری کوشش مثلاً The Education of Hnery Adams 1906

فن کارانہ اظہار کی تمنا یا شہرت و رتبہ سے فائدہ اٹھانے کی خالصتہً کاروباری خواہش۔

کبھی کبھی اپنی ذات اور شخصیت سے بے حد محبت بھی خود نوشت سوانح حیات کو وجود میں لاتی ہو اسے نرگسیت کی ایک شکل بھی کہا جا سکتا ہو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مصنف کا ذہن خیالات کے بے پناہ ہجوم کی آماجگاہ رہتا ہے۔ اور دوسرے اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے یا سرگرمیوں سے بھرپور زندگی گزارنے کے بعد بھی نکاس کی مزید راہیں تلاش کرتا ہو اور آپ بیتی نفسیاتی اصطلاح میں Catharsis کا ایک اچھا وسیلہ ہے انسانی کاسۂ سر میں عوامل کی جو اتھل پتھل ہوا کرتی ہے اس کو پوری طرح سمجھنے کا یارا خود انسان میں بھی نہیں ہے۔ کیسل کی انسائیکلو پیڈیا میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"ہمارے اپنے زمانے کے مصنفوں کو اپنے پیش رو قلم کاروں کے مقابلے میں نوع انسانی کی پیچیدہ اور غیر مستحکم کیفیت کا زیادہ حد تک احساس ہے۔ دور جدید کا انسان فرائیڈ اور پراوسٹ کا چیلا ہے اس کا کہنا ہے کہ کسی فرد کی نفسیات کو سمجھنا ممکن ہے جب تک اس کے بے حد چھوٹے چھوٹے مظاہر کے بارے میں

کھوج نہ کی جائے کوئی شخص نیکی یا بدی کا ٹھوس تو وہ نہیں ہوتا
اور ایک بات یہ ہے کہ وہ آغاز شباب سے پیری تک ایک حالت
میں نہیں رہتا۔"

لوگ اپنے ذاتی تجربات سے زیادہ ذہنی تجربات کھل کر بیان کرتے ہیں
بہترین آپ بیتیاں وہی ہوتی ہیں جن میں انسان کی اندرونی زندگی
کے تغیرات کا بیان ہوتا ہے اس کی مثال سینٹ آگسٹائن
St. Augustine کی Confession یا نسبتاً حال کی چیز اسٹیفن اسپنڈر
Stephen Spender's کی یادداشتوں (Volume of Recollections)
کے مجموعے سے دی جا سکتی ہے ایسا ہونا فطری ہے ذہن کی مہم پیمائی
سے ہم زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ ذہنی تجربات کو قلم بند کرنے میں
جذباتی واردا توں سے کم جھجھک محسوس کرتے ہیں۔

یہ سوال کہ کیا خود نوشت سوانح حیات کی ضرورت دیگر اصناف سخن
مثلاً افسانہ اور نظم سے زیادہ ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی سیدھا سادا جواب
وضع نہیں ہو سکتا ہر صنف سخن کے مضمرات پر اس فیصلے کا انحصار ہوگا تاہم
یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ آپ بیتی مصنف زندگی میں ایک بار
ہی لکھتا ہے البتہ افسانے۔ نظم اور دیگر نثر پارے بار بار ظہور میں آتے ہیں
کسی بڑی شخصیت بالخصوص ادبی شخصیت کی خود نوشت کے بارے میں
جو کرید اور تجسس ہوتا ہے اس کی مثال کسی دوسری صنف سے نہیں دی جا سکتی
اس کی مثال یہ ہے کہ پاکستان کے ادب پارے مشکل سے ہی ہندوستان
پہونچ پاتے ہیں۔ لیکن یہ جوش جیسی عظیم شخصیت کی خود نوشت ہی تھی جو

Cassels Encyclopaedia Page 61 ؎

پاکستان میں چھپنے کے تقریباً فوراً بعد نہ صرف ہمارے ملک آپہونچی بلکہ ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ ادب سے لگاؤ رکھنے والا شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے "یادوں کی برات" کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ کوئی اگر یہ کہے کہ فراق گورکھپوری نے نئی غزل کہی ہے تو اس میں کوئی چونکا دینے والی اہمیت نہ ہوگی لیکن اگر یہ خبر مل جائے کہ فراق گورکھپوری نے اپنی خود نوشت مرتب کر لی ہے تو لوگ اسے حاصل کرنے کے لیے دوڑ پڑیں گے۔ اسی طرح انگریزی ناول نگاری کی ابتدا میں یہ ایک عام دستور تھا کہ ہر ناول کو ایک سرگزشت کہہ کر پکارا جاتا تھا اگر کسی ناول پر یہ درج ہو کہ یہ محض فرضی کردار کا افسانہ نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی سرگزشت حیات ہے تو لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ خرید لیتے تھے۔

نفسیاتی اہمیت

خود نوشت سوانح حیات سے لکھنے والے کی زندگی کے حالات اور تجربات سے تعارف تو ہوتا ہی ہے لیکن اس سے اس کی طبیعت، ذہنیت، دبی ہوئی خواہشات اور چھپی ہوئی ذہنی الجھنوں کا بصیرت آمیز ذہنی تجزیہ کرنے کا بھی موقع ملتا ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

غالب کا محبوب خواہ بے وفا ہو یا تغافل پیشہ لیکن دیدہ ور ضرور تھا اول تو وہ ان کی کہانی جس سے وہ اپنے کو بالکل غیر متعلق رکھنا چاہتا ہے سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہو لیکن اگر وہ کسی خوشامد درآمد سے راضی بھی کر لیا جائے تب بھی وہ اس کا تو کسی صورت سے روادار نہیں کہ

وہ یہ کہانی غالب کی زبانی سنے وہ جانتا ہے کہ غالب جو اپنی آپ بیتی سنائیں گے اس میں بیشتر مبالغہ۔ غلو۔ شکوہ شکایت۔ غیبت۔ عذر خواہی خود ترحمی اور ادعائے عشق کے علاوہ اور کچھ نہ ہو گا۔ لہذا غالب کی کہانی وہ غالب کی زبانی سن کر تضیع اوقات نہیں کرنا چاہتا۔

غالب کی آپ بیتی کے متعلق ان کے محبوب کے جو مفروضہ شکوک اور شبہات ظاہر کئے گئے ہیں وہی بہت سی آپ بیتیوں کے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں اور ایک حد تک درست بھی ہو سکتے ہیں۔ البتہ ایک بہت اہم اور بنیادی بات درمیان میں آ جاتی ہے۔ غالب کے محبوب کو بقول ان کے ان سے کوئی دل چسپی نہیں برخلاف اس کے دوسری آپ بیتیوں کے پڑھنے والوں کو ان کے بیان کرنے والوں سے نہ صرف ایک طرح کی عقیدت اور انس ہوتا ہے بلکہ ان کے وسیلہ سے بہت سی دوسری باتوں کے معلوم کرنے کا تجسس بھی ہوتا ہے۔

مبالغہ۔ غلط بیانی اور خود نمائی سے تو کسی بھی تصنیف میں مفر نہیں بلکہ خود نوشت سوانح حیات میں اس کے امکانات کئی گنا بڑھ جاتے ہیں کیونکہ قلم اپنا، حال اپنا، بیان اپنا اور زبان بگڑ جانے کا اندیشہ کم سے کم گویا کہ انداز گل افشانی گفتار دکھانے کی سب ہی شرائط پوری ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک طنز نگار نے طنزاً کہا بھی ہے کہ "میں خود نوشت سوانح حیات کو افسانوی ادب کی بہترین تصنیف سمجھتا ہوں" لیکن اس کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی خود نوشت میں صداقت یا نیم صداقت ہوتی ہی نہیں۔ بالغ نظری کا تقاضہ یہ ہوگا کہ قانون کے اس مسئلہ پر کہ شبہ کا فائدہ ملزم کو دیا جانا چاہیئے، کاربند ہونا چاہیے۔ یعنی ہم کو

کسی خود نوشت سوانح حیات کے واقعات کو اس وقت تک صحیح اور درست سمجھنا چاہیے جب تک کہ ان کی عدم صحت کا ثبوت نہ مل جائے یا ہم ان کو ناممکن الوقوع یا خلاف عقل قرار دینے پر نہ مجبور ہو جائیں۔

اپنی کہانی آپ سنانے والا اپنی زندگی کے نہاں خانے سے سب ہی پردے اٹھا دیتا ہے اور بقول شخصے اپنا کلیجہ کاغذ پر نکال کر رکھ دیتا ہو۔ لیکن اس کے بعد قاری کی ذہانت، عقل سلیم اور رد و قبول کی صلاحیت کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ کس بات کو کس نظر سے دیکھے، اور سنگ ریزوں سے جواہر پارے چن لے۔ اور بعض سطحی واقعات سے بیان کرنے والے کی شخصیت کی تہہ تک پہونچے۔ تحلیل نفسی کے ذریعہ ذہنی مریضوں کا علاج کرنے والے ماہرین اکثر اپنے مریضوں سے کہتے ہیں کہ جو بھی ان کے دل میں آئے بلا تکلف بولتے رہیں ——— اور پھر وہ انھیں بے ربط اور بے تکی باتوں سے ان کی دبی ہوئی خواہشات اور پیچیدہ ذہنیت کا پتہ چلا لیتے ہیں ہر علم کی طرح علم نفسیات کی بنا بھی عقل سلیم پر ہی ہے۔

خود نوشت سوانح حیات پڑھنے والوں کو صرف ان کی سطور کو نہیں بلکہ بین السطور بھی پڑھنا چاہیے اور اسے لکھنے والے کی شخصیت کے اصلی خد و خال کو سمجھنے کے لیے علم نفسیات سے بھی شغف چاہیے اکثر کہی ہوئی باتوں سے زیادہ وہ باتیں بولتی ہیں جو ان کہی چھوڑ دی جاتی ہیں۔ یا جن کو کہی باتوں سے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے مثال کے طور پر جن دنوں فرانس میں ہر طرف ہیجان اور بغاوت پھیلی ہوئی تھی لوئی (سولھویں) نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا "آج کچھ نہیں ہوا" اسی طرح کیونسٹ انقلاب کے دوران جس میں زار روس اور اس کے پورے

خاندان کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ زار روس نے اپنی ڈائری کے متعدد مقامات پر لکھا تھا ــــ "حالات اپنے معمول پر ہیں ــــ"
لکھنے والا خود نہیں جانتا کہ وہ کسی بات کو اس مخصوص انداز میں کیوں پیش کر رہا ہے اس کا تجزیہ وہ خود بھی نہیں کر پاتا لیکن پڑھنے والا جب اس کو ان حالات کے پس منظر میں پڑھتا ہے اس وقت اسے لکھنے والے کی نفسیاتی کیفیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

جوش ملیح آبادی اپنی شہرۂ آفاق خود نوشت سوانح حیات "یادوں کی برات" میں اپنے آباؤ اجداد کی امارت کا نہ صرف ذکر کرتے ہیں بلکہ اس پر فخر کرتے ہیں جبکہ اپنی شاعری میں وہ مزدور دوست اور جمہوریت پسند ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن اس تضاد اور دورخے انداز میں ایک نفسیاتی پہلو یہ بھی نظر آتا ہے کہ جس وقت جوش صاحب نے یہ کتاب لکھی اس وقت ان کی زندگی خود ان کے الفاظ میں کچھ اس طرح گزر رہی تھی۔

"اپنی اس زندگی کا حال کیا بتاؤں؟ جان کی اماں پاؤں تو زبان ہلاؤں۔ اللہ اللہ یہ آب و ہوا کی ناسازگاری یہ کراچی کی علم بیزاری یہ پرانی یادوں کی کٹاریاں یہ نئے ماحول کی آریاں یہ مولد و منشا سے دوری یہ غربت کی رنجوری یہ سینے میں کھٹکتی پھانسیں۔ یہ حالات کی اکھڑی سانسیں۔ یہ دل پہ چلتی بان یہ سر پر کڑکتی کمان یہ اخباروں کی ریشہ دوانیاں یہ حکومت کی سرگرانیاں یہ دوستوں کا فقدان معاشی بحران۔ یہ چہرۂ زندگی پر گرد و غبار کا غازہ یہ دوش پر عزت نفس کا جنازہ ــــ" [۵۱]

---

[۵۱] یادوں کی برات جوش ملیح آبادی صفحہ ۲۳۸

نواب حسام الدولہ تہور جنگ نقیر محمد خاں گویا کا پڑپوتا پاکستان میں
جب ایک افسر سے ملنے ان کے آفس میں پہنچتا ہے تو اس کے ساتھ کوئی
خصوصی رعایت نہیں برتی جاتی بلکہ ایک آدمی جیسا سلوک ہوتا ہے۔

"چپراسی نے آکر کہا اس وقت ایک اور صاحب بیٹھے ہوئے
ہیں۔ آپ پی۔ اے کے کمرے میں انتظار کریں۔ دل نے کہا
"اور آؤ پاکستان" خون کے گھونٹ پیئے اور پی۔ اے کے کمرے
میں جاکر بیٹھ گیا۔ پی۔ اے۔ صاحب نہ تو کھڑے ہوئے نہ ہاتھ
ملایا مجھ کو فرعون کی طرح دیکھا اور کام کرنے لگے۔ دل نے کہا
"مبارک ہو خان صاحب پاکستان کی طرف سے یہ ہمت افزائی"
جی چاہا کمرے سے نکل جاؤں پھر سوچا کہ ہم تو طارق کی طرح کشتیاں
جلا کر آئے ہیں۔ اب کہاں جا سکتے ہیں ــــ" [1]

یہ فن ناشناس ماحول ان کی انانیت اور خود پرستی پر تازیانے لگاتا ہے
ان کی غیر معمولی شخصیت ماضی میں فرار کی راہیں تلاش کرتی ہے جہاں
جھنجھلایا ہوا فن کار کسی مخصوص پناہ گاہ میں یادوں کے بل بوتے پر
اپنے قد کو اونچا کر لیتا ہے۔ اور اپنے گرد و پیش سے بالاتر ہو کر اپنے کو
تسکین دیتا ہے۔ اپنے خاندان اور اپنے بزرگوں کا ذکر انھوں نے بہت
بڑا Enlarge کر کے پیش کیا ہے۔ اپنے پردادا۔ دادا۔ باپ اور چچا وغیرہ
کو جوش صاحب نے یوں پیش کیا ہے۔ جیسے وہ زمیندار نہیں بلکہ بادشاہ
ہوں۔ مثلاً اپنی پھوپھی سائرہ بیگم کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں۔

"ان کا کھانا منجھلے محل میں پکتا تھا۔ لیکن ان کا ناشتہ ایک

---

[1] یادوں کی برات ــــ جوش ملیح آبادی ــــ صفحہ ۲۹۴

روپیوں اور اشرفیوں سے بھرے ہوئے تھال کے ساتھ بطور جیب
خرچ باپ کے گھر سے آیا کرتا جس کو چاندی اور سونے کی آمیزش
کی بنا پر کھچڑی کہا کرتی تھیں" [1]

اپنے بچپن میں جب جوش ملیح آبادی اپنے والد کے ساتھ نوکروں اور خدمت گاروں کے ایک قافلے کے ساتھ اپنے گاؤں پہونچے تب

"ہمارے تھانے پہونچتے ہی رعایا جوق در جوق آنے اور ہم دونو
بھائیوں کے پاؤں چھو چھو کر نذرانے دینے لگی اور ہم نذر کے
روپیوں کو سامنے کے کھرے تخت پر بڑی بے پروائی کے ساتھ
کھنا کھن اور چھنا چھن پھینکنے لگے اور تھوڑی دیر میں پیاز کے
قتلوں کے سے چمکتے سکوں کا تخت پر انبار لگ گیا۔ اور ایک
پہاڑی سی بن گئی" [2]

یہ سب مبالغہ آمیز تحریریں جوش صاحب کی اس ذہنی کیفیت کی آئینہ داری کر رہی ہیں جن سے دوچار ہونے کے بعد جوش جیسے شخص کو خاندانی امارت کی کمزور بیساکھیاں لگانی پڑیں پاکستان کی بے مقصد زندگی کے روکھے پھیکے اداس رنگوں کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے انھوں نے ماضی کے ایسے بھڑک دار اور شوخ رنگوں کی آمیزش کی کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں اور اسے مصنف پر چھائی بے کیفی کا احساس نہ ہو۔

اس کے علاوہ اپنے آباد اجداد کی امارت کا فخریہ ذکر کر کے اپنی جاگیردارانہ ذہنیت پر سے بھی غلاف اتار دیتے ہیں جبکہ وہ بڑے جمہوریت پسند ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

---

[1] و [2] یادوں کی برات ـــ جوش ملیح آبادی ـــ صفحہ ۳۲۸/۴۴

اسی طرح مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی خود نوشت سوانح حیات "نقش حیات" میں ایک طویل بحث حسب نسب کے بارے میں کی ہے۔ اگرچہ خود اپنے الفاظ میں وہ حسب نسب کی تفریق کو قابل مذمت سمجھتے ہیں۔

"اپنے اعمال اور اخلاق کو درست کیا جائے جس سے تمام خاندان کے لیے دینی اور دنیوی عزت اور افتخار ملے۔ نسب پر فخر کرنے والے نہ صرف عملی میدان میں کسل مند اور لنگڑے ہوتے ہیں بلکہ ان کے اخلاق اور عقائد بھی بگڑ جاتے ہیں جہالت اور بے کمالی کا بھوت، دنیاپرستی اور نفس پروری کا شیطان ان پر سوار ہوجاتا ہے۔"[۵]

لیکن اس تمام بحث اور وعظ کے بعد بھی انھوں نے اپنی خود نوشت کی ابتدا میں ایک طولانی بحث اپنے نسب اور خاندان کی بڑائی کے بارے میں کی ہے۔ خاندانی شجرے اور مختلف واقعات کی دلیلوں سے اپنی بات کو اتنی بار واضح کیا ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ اس معاملے میں مصنف کا زاویۂ نگاہ متوازن نہیں ہے یا وہ کسی عام غلط فہمی کی صفائی دے رہے ہیں۔

والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ میں سادات سے ہوں اور میرا خاندان پیرزادوں کا خاندان ہے تو لوگ تصدیق نہیں کرتے تھے کیونکہ اودھ کے شہروں میں ٹانڈہ کپڑا بننے والوں (نوربافوں) کی بستی مشہور تھا۔ ٹانڈے کی آبادی کا بڑا حصہ اسی برادری کا ہے اس لیے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ بھی اسی قوم کے ہوں گے مگر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز نے ایک روز بھرے مجمع میں ارشاد فرمایا مدرس تو سید اور پیرزادے ہیں

۵؎ نقش حیات ــــ حسین احمد مدنی ـ صفحہ ۱۹

ان کے مورث اعلیٰ شاہ نور الحق رحمۃ اللہ۔ بہت بڑے اولیاء اللہ میں سے
ہیں رات میرے پاس آئے تھے کہتے تھے کہ میرے بیٹے حبیب اللہ کا
خیال رکھو بھئی یہ تو پیرزادے ہیں ـــــ " اس کے بعد سے ان کی نظر
عنایت مجھ پر زیادہ ہوگئی اور لوگوں کے خیالات میرے نسب کے
بارے میں بدل گئے ـــــ " [1]

کبھی کبھی کسی بات کی بہت زیادہ پردہ داری کس طرح خود پردہ دری بن جاتی ہو اس کو نفسیاتی اعتبار سے ہی سمجھا جا سکتا ہے اکثر جگہ جہاں مصنف اپنے فعل کی عذر خواہی کرتا ہو تعلّی کرتا ہے یا کسی کی ہجو ملیح کرتا ہو۔ یا کہنا کچھ چاہتا ہو۔ کہتا کچھ اور ہو کسی امر کو چھپانے کے لیے صاف صاف بات کرنے کے بجائے چبا چبا کر باتیں کرتا ہو، پڑھنے والا بخوبی اندازہ لگا لیتا ہو کہ یقیناً یہیں کہیں بالی مرتا ہو ـــــ مثلاً "یاد ایام" میں نواب احمد سعید چھتاری نے اپنی زندگی کے واقعات میں زیادہ تر ان واقعات پر زور دیا ہو جس میں انھوں نے ہندوستانیوں کے حق میں مفید خدمات انجام دیں۔ ایسے فیصلوں اور ریزولیشنوں کا ذکر بڑی طوالت سے کیا ہے جن سے ہندوستانیوں کو کسی طور فائدہ پہونچا ہو کیونکہ نواب چھتاری کے بارے میں عام خیال تھا کہ وہ انگریزوں کے عطا کردہ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہی ہو۔ اس لیے ہمیشہ انگریزوں کے حمایتی رہو ـــــ اس وقت جب ہر پڑھا لکھا ہندوستانی انگریز دشمنی پر آمادہ تھا۔ نواب چھتاری کا یہ طریق عمل یقیناً بعد میں ایک وضاحت۔ ایک صفائی کی ضرورت رکھتا ہو۔ نواب چھتاری اس تصنیف کو مصنف کی اپنے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کے ازالے کی ایک کوشش کہہ سکتے ہیں

---

[1] نقش حیات ـــــ مولانا حسین احمد مدنی ـــــ صفحہ ۱۷

خود نوشت سوانح حیات میں مصنف نہ صرف اپنا جائزہ لیتا ہے — اور اپنے ہر عمل کی ایک نفسیاتی وجہ پیش کرتا ہے۔ بلکہ زندگی میں گزرنے والے قابل ذکر لمحات کی مصنف رپورٹ بھی تیار کرتا ہے۔ جس میں فخر و پشیمانی افسوس و سرخوشی۔ امید و نا امیدی کی پوری دنیا سمٹ آتی ہے۔ اور پڑھنے والے کو نفسیاتی اعتبار سے مصنف کو جانچنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کی کمزوریاں پسندیدہ اور ناپسندیدہ واقعات کے پیش کرنے کے انداز سے وہ خود حل نکال لیتا ہے۔

تاریخی اہمیت

کہنے کو تو سوانح عمری فرد واحد کی آپ بیتی ہوتی ہے اور اس میں وہ اپنی زندگی کے ذاتی واقعات، تجربات، مشاہدات اور تاثرات بیان کرتا ہے لیکن چونکہ وہ دوسروں سے غیر متعلق کسی خلا میں نہیں رہتا اور زمان و مکاں کے سیاسی سماجی و معاشرتی اور دیگر حالات اس پر مسلسل اثر انداز ہوتے ہیں لہذا دانستہ یا نادانستہ طور پر اس کی زندگی کی تاریخ کی ایک حیثیت مصنف کے عہد کی تاریخ کی بھی ہو جاتی ہے۔ عام طور سے جب ہم کسی عہد کی تاریخ کو پڑھتے ہیں تو صرف تاریخ اور واقعات کے ڈھانچے نظر آتے ہیں جو مورخ کے نقطہ نظر اور انداز بیان کی رنگ آمیزی کے ساتھ ہم تک پہونچتے ہیں اور ہم صرف اس عہد کی ایک مخصوص زاویہ سے بنائی ہوئی تصویر دیکھتے ہیں لیکن محض اس تصویر کے ذریعہ ہم اس عہد کی روح تک نہیں پہونچ سکتے ہیں ہر عہد کی روح اس کے عوام ہوتے ہیں مگر بدقسمتی سے ہماری تاریخوں میں صرف بادشاہوں اور حکمرانوں کی فتح و شکست کی داستانیں ملتی ہیں، یا پھر کچھ ایسے متفرق اور مختصر حالات جن کا عوام کی زندگی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا ہم ایک حکمراں کے متعلق ایک عام تاریخ سے یہ تو معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ

کب تخت نشین ہوا؟ اس وقت اس کی مملکت کی وسعت کیا تھی؟ اس نے اس میں کیا وسعت کی، اس نے کون کون سی جنگیں لڑیں؟ اور ان کے کیا نتیجے ہوئے؟ اس نے کون سی اصلاحات نافذ کیں؟ اور کن کن بغاوتوں کو ختم کیا؟ لیکن ہم یہ پتہ نہیں لگا سکتے کہ اس زمانہ میں عوام کس طرح کی زندگی بسر کر رہے تھے؟ اور وہ اپنا کون سا تہوار کس طرح مناتے تھے؟ ان کی کون کون سی رسمیں تھیں؟ اور وہ اپنا خالی وقت کن دلچسپیوں میں صرف کرتے تھے۔ کس قسم کا ادب مقبول تھا اور اس وقت کے کون مشہور مصوّر۔ ادیب۔ شاعر۔ گوّیے اور دیگر فن کار تھے۔ ان باتوں کے متعلق علم ہمیں اس زمانے کی خود نوشت سوانح حیات، خطوط سفرناموں اور روزنامچوں سے ہی ہو سکتا ہے۔ خود نوشت سوانح حیات کا یہ پہلو اپنے اندر بے انتہا افادیت اور اہمیت رکھتا ہے کیونکہ خود نوشت سوانح حیات میں ان حالات کا قیمتی خزانہ مل جاتا ہے۔

"یاد ایام" مصنفہ نواب چھتاری کے پیش لفظ میں سر تیج بہادر سپرو نے خود نوشت سوانح حیات کے تاریخی پہلو پر بہت زور دیا ہے۔

"انگلستان اور یورپ کے دیگر ممالک میں اس قسم کی کتابیں لکھنے کا بہت شوق ہے۔ علاوہ اس کے کہ بڑے تجربے کار آدمی کی زندگی کا حال معلوم ہوتا ہے ایسی کتابوں سے خاص فائدہ یہ ہے کہ اس سے ملک کی ترقی و تنزلی کے اسباب معلوم ہوتے ہیں اور ایسی کتاب سے تاریخ کا مواد تیار ہوتا ہے ـــــ" [1]

یہ ممکن ہے کہ کچھ آپ بیتیاں ایسی ہوں جس میں زمانے کا ذکر کم ہو لیکن

---

[1] یاد ایام ـــ از محمد احمد سعید خاں آف چھتاری۔ پیش لفظ تحریر کردہ سر تیج بہادر سپرو صفحہ ج۔ مطبوعہ۔ ایجوکیشنل پریس۔ علی گڑھ سنہ ۱۹۴۹ء

عموماً کوئی آپ بیتی ایسی نہ ملے گی جو اپنے عہد کے حالات اور ماحول سے بالکل بیگانہ ہو۔ کسی آپ بیتی سے متعلقہ دور کے خط و خال کا تصور قائم کیا جا سکتا ہے اور تصویر سازی میں مدد ملتی ہے ـــ ہم بابر کی فتوحات کے متعلق تو بہت کچھ جانتے ہیں لیکن ہم میں سے بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ اس فاتح ہندوستان کے اس وقت کے ہندوستان اور یہاں کے طرز معاشرت کے متعلق کیا خیالات تھے اس نے تزک بابری میں جو لکھا ہے اس کے لیے مورخ کی نظر کے علاوہ فن کار کی باریک بینی اور مشاہدے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

"ہندوستان میں اچھے گھوڑے نہیں۔ اچھا گوشت نہیں انگور نہیں۔ خربزہ نہیں۔ برف نہیں۔ آب سرد نہیں۔ حمام نہیں۔ مدرسہ نہیں، شمع نہیں، مشعل نہیں، شمعدان کے بجائے ڈیوٹ ہے یہ تین پائے کا ہوتا ہے۔ راجوں مہاراجوں کو رات کے وقت جب روشنی کا کوئی کام پڑتا ہے۔ تو نوکر چاکر وہی ڈیوٹ لے کر پاس میں کھڑے ہوتے ہیں ـــ" [1]

خود نوشت سوانح حیات کا یہ وصف نہ صرف اس صنف کی منصفانہ خوبی کا غماز ہے بلکہ تاریخ کے طالب علم کے لیے ضروری بھی ہے۔ قدیم ادب میں تقریباً ہر تاریخ اور تذکرے میں مصنف کے حالات زندگی خود نوشت سوانح حیات کی شکل میں ضرور ملتے ہیں اور اگر ان کو یکجا کر لیا جائے تو بہترین نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں کیونکہ مصنف کی نظر زندگی کے ان تاریک اور باریک گوشوں پر بھی پڑتی ہے جن پر مورخ کی نظر نہیں پڑتی ہے۔ مثلاً محمد تغلق ہندوستان کی تاریخ کی بڑی متنازعہ شخصیت ہے کوئی مورخ اسے ایک سرے سے فاتر العقل

---

[1] نقوش (لاہور) ۱۹۶۴ء جون۔ صفحہ ۴۵

قرار دیتا ہو اور کوئی ایسا مدبر بادشاہ جو اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوا تھا لیکن اس کے عہد کی جتنی صاف اور مربوط تصویر ہمیں ابن بطوطہ کے سفر نامے میں ملتی ہو اور کہیں نظر نہیں آتی ہو۔ کیونکہ اس نے بادشاہ کے ہی نہیں بادشاہ کے طرز حکومت کے متعلق عوام کے رد عمل اور ان کے حالات کا بھی تذکرہ کیا ہو بیگم بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم علیہ حضرت کی خود نوشت سوانح حیات "تزک سلطانی یعنی تاج الاقبال" بظاہر تو ایک والی ریاست کی زندگی کا ایک نقشہ ہو۔ اس میں ریاست کے مختلف امور پر آپسی اختلافات کا ذکر ہو۔ نواب سلطان جہاں بیگم کا اپنی والدہ سے جو جھگڑا تھا اس خود نوشت میں اس کے پوشیدہ حقائق بیان کرکے بیگم صاحبہ نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کی ہو۔ لیکن اتنا نجی اور مقامی ہونے کے باوجود بھی اس عہد کی زندگی پر روشنی پڑتی ہو۔ معاشرتی اور ثقافتی حالات کے آئینہ دار ہونے کی حیثیت سے اس خود نوشت کی ایک الگ حیثیت ہو۔

رہن سہن، عادات و اطوار و آداب کے بارے میں جتنی صحیح اور جامع معلومات ہم کو خود نوشت سے ہوتی ہیں کسی تاریخ کے صفحات پر ملنا مشکل ہیں۔ ہماری تاریخ کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہو کہ یہ واقعات کی کھتونی اور جنگ و جدل کا ایک مرقع ہیں جس میں درباری رسوم اور مار دھاڑ کے سوا کچھ نہیں۔ اگر تاریخ کے ان صفحات کے ساتھ اس زمانے کی آپ بیتیوں کو ملا کر پڑھا جائے تو وہ چیز جسے عوام کی سرگرمیوں کی تاریخ کہا جاتا ہو اور جس پر اہل مغرب ناز کرتے ہیں۔ بخوبی تیار ہو سکتی ہے۔

دوسرا باب

عالمی ادب اور خود نوشت سوانح حیات کی روایت

۱۔ انگریزی ادب میں خود نوشت سوانح حیات کی روایت۔
۲۔ خود نوشت سوانح حیات اور ہندوستان کی دیگر زبانیں۔
۳۔ اردو میں دوسری زبانوں کے قابل ذکر ترجمے۔

انگریزی ادب میں

خود نوشت سوانح حیات کی روایت

انگریزی میں خود نوشت سوانح حیات کے لیے مستعمل اصطلاح Auto biography کی تعریف بیان کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ اس کے لفظی معنی بیان کیے جائیں کہ یہ لفظ کب اور کہاں سے آیا، دراصل یہ بیان Graphia ہے ایک انفرادی انسانی زندگی Bio کا خود اس کے قلم سے Auto

"The description (Graphia) of an individual human life (Bio) by the iudividual himself (auto)"

یہ اصطلاح بہت پرانی نہیں ہے۔ اٹھارویں صدی کے تقریباً اختتام کی ہے۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزی سے قبل جرمن ادب میں اس کا استعمال ہوا۔ مصنوعی ساخت سائینس کی تکنیکی اصطلاحوں کے انداز میں قدیم یونانی زبان کی مدد سے ہوئی۔

یہ اصطلاح کس ذہن کی اختراع ہے اس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اس کا پہلا ذکر جرمن شاعر اور مفکر J. G Hurder کے تجویز کردہ مجموعہ کے عنوان میں ملتا ہے۔ مجموعہ جرمن زبان میں ہے اور اس کے عنوان کا انگریزی ترجمہ ہوگا۔

"Self biographies of famous men."

اسے اٹھارویں صدی کے آخری چار برسوں میں ۱۷۹۶ء اور ۱۷۹۹ء میں ترتیب دیا گیا۔

PIERRE—LAROUSSE نے ۱۸۶۴ء میں اپنی (Grand Universal Dictionaire.) مرتب کی اس میں انھوں نے Auto-bio—graphic کے ذیل میں لکھا ہے۔

"یہ لفظ تو یونانی الاصل ہے لیکن اس کی ساخت انگریزی ہے۔"

(The word through of Greek origin is of English manufacture)

اس بیان کا کوئی ثبوت انھوں نے نہیں پیش کیا۔ دی گریٹ آکسفورڈ ڈکشنری میں یہ بات درج ملتی ہے کہ اس کی اصطلاح کا اولین معلوم استعمال Robert Southey نے ایک مضمون میں کیا تھا۔ جو ۱۸۰۹ء کے Quarterly reniew میں چھپا تھا۔ اس میں انھوں نے پرتگالی ادب کا ایک عام خاکہ پیش کیا ہے اور اسی سلسلہ میں انھوں نے ایک پرتگالی مصور کی اپنی زندگی پر لکھی ہوئی عرصے سے فراموش ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔ اور اسے (Auto-biography) کا مزے دار اور منفرد نمونہ بتایا ہے علامت اتصال Hyphen کا استعمال یہ ثابت کرتا ہے کہ لفظ عام طور پر اس زمانے میں رائج نہیں تھا

بہرحال یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس کی اختراع خود Southey نے کی ہو یا ان ممتاز ادیبوں اور فاضلوں میں سے کسی نے کی ہو جس میں Southey کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔

بتدریج ہی اس اصطلاح کا وہ مفہوم لیا جانے لگا جو آج یورپ کی تمام زبانوں میں رائج ہے۔ اس میں علم سے وابستگی کی ایک جھلک ملتی ہے۔ اس لفظ نے ایک ایسے رواج کو واضح اور نمایاں شعور کی بلندی تک پہونچا دیا۔ جو ادب کے تمام ادوار میں فطری اور انسانی عنصر کے طور پر موجود تھا۔ نہ صرف یوروپی بلکہ مثال کے طور پر مشرق بعید کے ادب میں بھی نمود ارتقاء کے کسی مرحلے میں خود نوشت سوانح حیات کی سی جو تحریریں اور اپنی خاکہ کشی کا جو رجحان ملتا ہے اس کا سلسلہ بہت پیچھے تدوین و انضباط کے اس دور تک جاتا ہے جب تحریری تصانیف کے مفہوم میں کوئی ادب موجود نہ تھا۔ بہ الفاظ دیگر یہ سلسلہ اس وقت بھی موجود تھا جب کاغذ کی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ اور تحریر کے لیے دیگر وسیلے مثلاً پتھر اور پتے استعمال کیے جاتے تھے۔ اس رجحان کو ہی تو بائیوگرافی کی اصطلاح وضع کرنے والے نامعلوم اسکالر نے ایک منفرد صنف کا درجہ دیا۔ اور اس طور پر صراحت کردی کہ یہ سوانح نگاری کا ایک خصوصی زمرہ ہے جس میں صاحب قلم دوسروں کے بجائے اپنے ذاتی اور انفرادی حالات بیان کرتا ہے۔

یہاں یہ واضح کردینا مناسب ہوگا کہ اس قسم کے بیان کے لیے تنہا یہی اصطلاح نہیں تھی۔ آٹو بائیوگرافی کا استعمال انیسویں صدی میں اس سے پہلے مروج اصطلاح (تذکرہ) Memoirs کی جگہ پر ہوا حالانکہ دونوں میں کسی قدر

فرق ہو۔ آٹو بائیو گرافی کے مصنف کا بنیادی مدعا اپنی زندگی کا حال بیان کرنا ہوتا ہے۔ اور Memoirs کا مصنف اپنے زمانے کے حالات بیان کرتا ہے بہر کیف صاحبِ تذکرہ اور مورخ میں فرق ہوتا ہے۔ مورخ ایک غیر جانبدار مبصر کے نقطۂ نظر سے حقائق کا بیان صداقت کے ساتھ کرتا ہے اور تذکرہ کا مصنف یہ بتاتا ہے کہ اس نے کیا دیکھا اور سنا۔ عام طور پر یہ خیال ہے کہ آٹو بائیو گرافی کی جڑیں گہرائی میں اس وقت تک نہیں پہونچیں جب تک کہ عیسائی مذہب کا قدیم تہذیب میں داخلہ نہیں ہو گیا۔ اس سے پہلے نمونہ کے طور St. Augustine ۳۵۴ء تا ۴۳۰ء کی تصانیف Confessions کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور کئی دوسرے آپ بیتی نگاروں نے اس کی تقلید کی۔ لیکن سینٹ آگسٹائن نے جو کچھ لکھا وہ روحانی نوعیت کی خود نوشت کی ابتدا تھی۔

"St. Augustine کے اعترافات میں مذہبی جذبات سے پیدا شدہ پیچیدہ داخلی خود نوشت سوانح حیات کی ابتدا کا پتہ چلتا ہے یہ ایک عظیم دماغ کے انکشافات ہیں St. Augustine کے بعد نشاۃ ثانیہ تک کوئی قابل ذکر نام نہیں ملتا ہے۔ ۱۵۰۱ء۔۱۵۷۶ء میں کارڈن کی Devitapropria داخلی خود نوشت کا ایک سائنسی نمونہ ہے۔ اس نے انسانی اوصاف اور عادات کے تحت اپنی خصوصیات کا اس ایمانداری سے جائزہ لیا ہے کہ بقول ایک مغربی نقاد کے جدید علم نفسیات سے اس کا وہی رشتہ ہے جو گلیلو کا علم ہیئت سے ہے۔" [1]

---

[1] اردو میں سوانح نگاری ــــ سید شاہ علی ــــ صفحہ ۶۱، گلڈ پبلشنگ ہاؤس کراچی

روشن خیالی Enlightenment کا دور یورپ کا وہ زمانہ ہے۔ جب وہاں اٹھارویں صدی کے فرانسیسی فلسفیوں کے نظریات کا اثر پڑ رہا تھا۔ انگلستان فرانس اور جرمنی میں اسی زمانے میں مختلف صاحبانِ قلم نے آٹو بائیو گرافی کی ادبی اہمیت کو تسلیم کیا اور اسے علمی تحقیق و فکر کا موضوع بنایا۔ نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں بعض انسان شناس Humanist اس صنفِ ادب کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ انھیں زمانہ قدیم کی آپ بیتیوں میں دل چسپی تھی ان ہی لوگوں نے ان آپ بیتی نگاروں کے نمونے پر خود اپنی ذات کی تصویر کشی کی۔ یہ اولین لوگ تھے جو خود نوشت کے تہذیبی منظر کے واقعی رخ تک پہونچے انھوں نے اسے تصنیفی اور نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھا۔

اٹھارویں صدی میں خود نوشت سوانح حیات کے اقدار کا احساس وار دات قلبی اور تفکر تاریخی کے اثر سے پھیلا —— نمایاں اور ممتاز ترین شخصیتوں کے اعترافات Confessions کے تقاضے ہونے لگے۔ چنانچہ ان کے مجموعہ منظرِ عام پر آنے لگے۔ زیادہ مانوس تصانیف کا جائزہ لیا گیا۔ اور ان کی درجہ بندی کی کوشش ہوئی — ان کوششوں میں مورخوں۔ فلسفیوں اور شاعروں نے حصّہ لیا۔ جن میں بعض بہت سربرآوردہ تھے۔

گبن Gibbon ہرڈر Hurder گوئٹے Goethe آپ بیتی لکھنے والوں کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے۔ انگریزی تاریخ نویسی کے ایک مکتبۂ عظیم کے نامور نمایندے ایڈورڈ گبن نے اپنی تصنیف Memoirs of his life and writings کے شروع میں ادب کی اس شاخ کی اہمیت کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"ایسے قدیم اور جدید لوگوں کی فہرست پیش کرنا دشوار نہ ہوگا

جنھوں نے مختلف شکلوں میں اپنی جو تصویر کشی کی ہو وہ اکثر
اور بیشتر صورتوں میں ان کی تحریروں کے دل چسپ ترین
بلکہ بسا اوقات واحد دل چسپ اجزا ہیں۔ اور اگر انھوں نے
خلوص سے کام لیا تو ان کے ذاتی تذکرے کی جزئیات نگاری
یا طوالت کی شکایت ہم شاید ہی کبھی کریں ۔۔۔"

انیسویں صدی میں مطالعات انسانی کی تجدید سے آپ بیتی میں
سائنٹفک انداز کی دل چسپی نے خصوصی حیثیت اختیار کر لی پھر اس نے
نفسیات اور تاریخ کے ماخذ کے طور پر ایک متعین مقام حاصل کر لیا ہے۔
St. Augustine کے Confession's کے علاوہ Rousseau کے اعترافات
کو بھی خود نوشت سوانح حیات کے فن میں ایک اہم مقام حاصل ہوا ہے
روسو خود نوشت سوانح حیات کی صنف میں جمہوری رجحان کا علم بردار
ہے۔ وہ اپنے اعترافات کو اپنا "اعمال نامہ" کہتا ہے۔

"میں نے ایک ایسی مہم کا بیڑا اٹھایا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں
اور شاید کوئی دوسرا آدمی اس کی تقلید کی جرأت بھی نہ کر سکے
گا۔ میں کشتۂ تقدیر مخلوق (بنی نوع) کے سامنے ایک انسان
کی تصویر رکھ رہا ہوں اور یہ انسان کون ہے۔ میں خود ہوں"
عین ممکن ہے کہ میں نے بعض ایسی باتوں کو یقینی سمجھ لیا ہو

Geurge Misch "A history of Autobiography in Antiqinty"

خود نوشت سوانح حیات کے سلسلے میں میش کی یہ اہم اور وقیع تصنیف دو جلدوں پر مشتمل ہے میش نے
اپنی تحقیق کے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان سے اس باب کی تیاری میں مدد دی گئی ہے۔

جو احتمالی تھیں لیکن میں نے جان بوجھ کر جھوٹ کو سچ نہیں کہا
میں جیسا بھی تھا ویسا ہی میں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ کبھی بُرا
اور قابل نفرت، کبھی نیک طینت، کشادہ دل اور رفیع میرے
بنی نوع میرے ان اعتراضات کو سنیں۔ میری پستی پر شرمائیں
میرے دکھ پر کانپ جائیں ـــ اور اگر ان میں سے کسی کو جرأت
ہو تو وہ اسی خلوص اور جرأت کے ساتھ اپنے دل کو ٹٹولیں اور
اگر کہہ سکتا ہو تو صاف کہہ دے کہ میں اس آدمی (روسو) سے
برتر ہوں ـــ"

روسو کی جرأت اور بے باکی وہ انوکھی خوبی تھی جو کم ہی لوگوں کے
نصیب میں آئی۔

گاندھی جی کی تصنیف My experiments with truth
کو بھی اس قبیل کی تصنیف تصور کیا جاتا ہے۔

(Issac williams) کی آٹو بائیو گرافی جو ۱۸۵۱ء میں لکھی گئی ـــ اور
۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی۔ تھیالوجی کے میدان میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے
روحانی خوبیوں والی آپ بیتیوں میں (Alferd Noyes) کی کتاب
Unknown God نسبتاً تازہ تصنیف ہے۔ کیونکہ اس کا سن اشاعت ۱۹۳۴ء ہے۔

بچپن کی یادوں کی حیثیت زیادہ تر ثانوی ہوتی ہے۔ ہربرٹ اسپنسر
نے اپنی آپ بیتی میں ایک سائنس داں کی حیثیت سے خود اپنا مشاہدہ
کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن انھیں بعد میں اعتراف کرنا پڑا کہ بچپن
کے متعلق ان کی یادیں حقیقی اور سچی بہت کم اور چند واضح تاثرات ہی
تک محدود تھیں۔ بہرکیف بچپن کے بعض حالات ایسے ضرور ملتے ہیں جن میں

صداقت کا تاثر ملتا ہو۔ مثلاً جو کچھ ٹالسٹائی نے قلم بند کیا ہو وہ Maurice
Baring کی کتاب Puppet show of memory اور Forest Reid
کی تصنیف Apostate میں ملتی ہے۔

Thomas cooper, کی خود نوشت سوانح The life of Thomas cooper
written by himself کو بعض نقادوں نے انیسویں صدی کی بہترین آپ بیتی
قرار دیا ہو۔ انگریزی کی دیگر اہم آپ بیتیوں اور ان کے مصنفوں کے نام
حسب ذیل ہیں۔

1- Bertrand Russel.

2- John Stuart Mill.

3- Anthony Trollop.

4- G. K. Chesterton.

5- Thomas Henry Huxley.

6- Charles Darwin.

7- Edward Gibbon.

8- Benjamin Franklin.

9- Cicely Hamilton.

10- Samuel Smiles.

11- Leigh Hunt.

یہ وہ آپ بیتیاں ہیں جو "آپ بیتی" (Autobiography) کے نام
سے شائع ہوئیں۔ انگریزی کی دیگر مشہور آپ بیتیوں کے عنوانات
مختلف ہیں۔

1- Reminiscences by Thomos carlyle.

2- My apprentice ship by Beatrice webb.

3- Adventures-of a younger son by Edword John Trelawney.

4- The autobiography of a Super Tramp by William Henrey Davis.

5- The Story of my life By Philips Meadows. Taylor.

6- Some Reminiscences By Geoseph Gonard.

7- Experiments in Autobiography. By H. G. wells.

8- Praeterita By John Ruskin.

9- Father and Son By Sir Edmund Gosse

10- De profundis By Oscar wilde

11- The Mint By T. E. Lawrence

12- Some thing of my self. By Rud yard kipling.

13- My life By Have lock Ellis.

برطانیہ کے مشہور سیاست داں بھی لکھنے کے معاملے میں پیچھے نہیں ہیں. سرونسٹن چرچل نے جو نامور ادیب بھی تھے اور عرصہ تک وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہے. اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں ایک کتاب اور دوسری عالمگیر جنگ کا حال چھ جلدوں میں قلم بند کیا ہے. لیکن فی الحقیقت یہ سب تصانیف memoires کے زمرے میں آتی ہیں۔ ایک اور سابق وزیر اعظم ہیرلڈ میک ملن نے بھی اپنے اور اپنے زمانے کے حالات چھ جلدوں میں لکھے ____

ارل اٹیلی بھی وزیر اعظم رہ چکے تھے انھوں نے اپنی تصنیف کا نام Memoirs of Earl Attlee رکھا۔

انیسویں صدی کے وسط تک انگریزی تعلیم کے زیر اثر ہندوستان میں آپ بیتی کی نشو و نما کے لیے سازگار ماحول پیدا ہوا۔

انگریزی اور دیگر زبانوں کے ادب کا ہندوستانیوں نے بڑے ذوق وشوق سے مطالعہ کیا۔ ان میں بہت سی آپ بیتیاں بھی ہوں گی اور ان کے مطالعہ نے نئے فیشن کے مطابق انھیں بھی اپنی سرگزشت قلم بند کرنے پر مائل کیا ہوگا۔

انگریزی زبان میں کسی ہندوستانی کی پہلی آپ بیتی ــــ لطف اللہ نے ۱۸۵۷ء میں لکھی۔ ۱۸۵۷ء میں اس کی اشاعت کے فوراً بعد انگریزی پڑھنے والے اس کی طرف متوجہ ہوئے [۱]

مختصر سی مدت میں اس کتاب کے متعدد اڈیشن شائع ہوئے۔ ہندوستانی زبانوں کے مشہور اسکالر گارساں دتاسی کا بیان ہے کہ یورپ میں یہ خود نوشت بہت مقبول ہوئی۔

لطف اللہ ۱۸۰۲ء میں دھار نگر (وسط ہندوستان) میں پیدا ہوئے تھے ان کی زندگی ایڈونچر سے بھرپور تھی۔ اس کا تذکرہ انھوں نے دلچسپ تفصیل سے کیا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں ان کو بہت سے تجربات ہوئے اور اس ملازمت کے بعد وہ انگریزوں کو عربی اور فارسی پڑھانے لگے ۱۸۴۴ء میں انھوں نے انگلستان کا سفر کیا۔ اور اپنی زندگی

---

[۱] The Indian autobiographies in English By R.C. P. Sinha Page 48

کی کہانی انھوں نے دل چسپ اور سادہ انگریزی میں لکھی۔
لطف اللہ کی خود نوشت کے تقریباً بیس سال بعد لال بہاری ڈے
کی آپ بیتی منظر عام پر آئی ڈے نے یہ کتاب ۱۸۷۳ء اور ۱۸۷۶ء کے
درمیان لکھی۔
اس سے کچھ ہی پہلے "رکھالا داس ہلدر" کی خود نوشت ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۲ء
"The English Diary of an Indian Student" کے درمیان شائع ہوئی،
۱۸۷۳ء میں ہی ایک ریٹائرڈ فوجی سیتارام نے ہندی میں اپنے
حالات بڑے خوبصورت انداز میں لکھے۔ سیتارام نے اپنی خود نوشت اپنے
انگریز افسروں کی فرمائش پر لکھی "From Seppy to Subedar" (جس کا اردو
ترجمہ تھا "سپاہی سے صوبہ دار تک") اس خود نوشت کی مقبولیت کا یہ عالم تھا
کہ چند سال میں کئی اڈیشن نکلے۔ سیتارام ایک سپاہی تھا اور ترقی کرتے
کرتے صوبہ دار بن گیا تھا۔
۱۸۹۲ء میں نشی کانت چٹوپادھیائے نے جرمن یونی ورسٹی میں اپنی زندگی
کی یادیں "Reminiscences of German University life" سے ترتیب دیں
ہندوستان میں انگریزی خود نوشت کے سلسلے میں بیسویں صدی میں
بہت سے نئے اضافے ہوئے۔
بیسویں صدی صدی کی اولین آپ بیتی ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی،
A reminiscences of a retired Hindu offical.
یہ خود نوشت مسٹر اے۔ بال کرشن۔ مدلیار کی لکھی ہوئی ہے۔ اس خود نوشت
میں بیسویں صدی کے نئے رجحانات اور ہندو فلسفے کا ذکر اپنے ذکر سے
زیادہ ملتا ہے۔

۱۹۰۰ء میں لالہ لاجپت رائے نے اپنی خود نوشت لکھی ان کی خود نوشت میں سیاسی سرگرمیوں کا بیان حاوی ہے۔ لالہ لاجپت رائے کو چھ ماہ تک جلاوطنی کی زندگی گزارنی پڑی تھی۔ اس نوع کی ان کی اور تحریریں بھی ہیں ۱۹۱۴ء میں انھوں نے "اپنی زندگی کی کہانی" اردو میں لکھی۔ یہ لالہ لاجپت رائے کی آریہ سماجی تحریک سے وابستگی کی داستان ہے ۱۹۱۹ء میں کم و بیش ساڑھے پانچ سال امریکہ اور جاپان میں گزارنے کے بعد لالہ لاجپت رائے نے ان دونوں ممالک کے ہندوستانی انقلابیوں کا حال انگریزی میں لکھا ہے۔ جس کا عنوان ہے

The Indian revolutionaries in the united states and Japan.
(1919)

شیام سندر چکرورتی بھی ہندوستان کی ایک بڑی سیاسی شخصیت تھے ۱۹۰۷ء میں شیام سندر چکرورتی کو بھی جلاوطن ہونا پڑا تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب Through Solitude and Sorrow میں اپنے قید خانہ کے تجربات پر روشنی ڈالی ہے۔ انگریزی میں یہ آپ بیتی ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی ۱۹۱۷ء میں گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کی آپ بیتی کی اشاعت ہندوستان میں خود نوشت کی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ہے یہ شاید پہلا موقع تھا جب ایک ہندوستانی شاعر نے اپنی زندگی کا حال تفصیل سے بیان کرنے کی ہمت کی۔ اور شاعری کے مفہوم میں زندگی کے اندر مقصدیت تلاش کرنے اور ایک شاعر کے طور پر زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی۔

تحریک خلافت کے مشہور رہنما مولانا محمد علی جوہر —— مذہب اسلام پر چار جلدوں میں ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے اس کے ابتدائیہ کے

طور پر انھوں نے اپنی زندگی کے حالات My life-A fragment
(1921 To 1922) کے عنوان سے قلم بند کئے ہیں۔ قرآن کے مطالعہ اور قرآن
کی تعلیمات نے مولانا کی زندگی کے رخ کو کس طرح نیا موڑ دیا اس کا بیان
بڑی خوب صورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس میں مولانا نے اپنے مذہبی
عقائد اور نظریات واضح کیے ہیں۔ اس خود نوشت کی سب سے اہم خوبی
اس کا طنزیہ اور شگفتہ انداز ہے۔ سید واجد علی نے ۱۹۲۴ء میں
"Aligarh memoirs and a Persion Bouquet" لکھی اس میں مصنف
نے اپنے اسکول اور کالج کے زمانے کی یادیں تازہ کی ہیں۔

ہندوستانی سائنس داں P. C. Ray کی خود نوشت سوانح حیات
"Life and experiences of a Bengali Chemist." کا عنوان ہے۔
یہ خود نوشت ۲ جلدوں میں لکھی گئی — پہلا حصہ آپ بیتی ہے۔ دوسرے
حصے میں مختلف مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔ یہ خود نوشت ۱۹۳۲ء
میں لکھی گئی۔

With no regrets-an autobiography یہ عنوان جواہر لال نہرو
کی بہن کرشنا ہتھی سنگھ کی خود نوشت کا ہے گلبدن بیگم کے ہمایوں نامے
کی طرح اس خود نوشت کا مرکزی کردار مصنفہ اپنی نہیں بلکہ ان کے
والد موتی لال نہرو کی ذات ہے۔

مشہور ناول نگار ملک راج آنند نے اپنی خیال بیتی ۱۹۴۶ء
میں لکھی —
"Apology for heroism-A brief autobiography of ideas"

مشہور شاعر ہریندر ناتھ چٹو پادھیائے نے ۱۹۴۸ء میں

Life and my Self, کے عنوان سے اپنی خود نوشت شائع کی،
اس خود نوشت میں انھوں نے اپنے شعور شعری کی نشو و نما کے سلسلہ میں
بڑی صاف گوئی سے کام لیا۔ ان کا انداز بیان کسی قدر مزاح کا رنگ
لیے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر سر ڈیلی رادھا کرشنن نے جو بعد میں ہندوستانی جمہوریہ کے صدر
ہوئے تھے ۱۹۳۷ء میں اپنی فلسفیانہ نشو و نما کا مختصر خاکہ "My
Search for truth کے عنوان سے لکھا۔

سبھاش چندر بوس نے جو نیتا جی کے نام سے مشہور ہوئے آسٹریا
میں اپنے دس روزہ قیام کے دوران اپنی آپ بیتی An Indian
Pilgrim کے عنوان سے عجلت کے عالم میں دسمبر ۱۹۳۷ء میں لکھی تھی
یہ تصنیف ان کی زندگی کے صرف ۲۳ برسوں کا احاطہ کرتی ہی۔

بچوں کی شادی کو روکنے والے مشہور قانون شاردا ایکٹ کے
معمار ہر بلاس شاردا کی یادیں ۱۹۵۱ء میں مندرجہ ذیل عنوان سے شائع
"Recollections and Reminiseences"
ہوئیں۔

میسور کے ملک گیر شہرت کے مالک۔ انجینئر ایم وسویسریا نے بھی
اپنے کچھ حالات Memories of my working life
کے عنوان سے لکھے۔ لیکن اس کتاب کا دائرہ ان کی پیشہ وارانہ زندگی اور
ان کی نگرانی میں پایہ تکمیل تک پہونچنے والے منصوبوں تک ہی محدود
ہے یہ کتاب ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔

۱۹۵۱ء میں ایک مشہور خود نوشت سوانح حیات منظر عام پر آئی
اس خود نوشت سوانح حیات کا عنوان ہے۔

"An Indian out Caste the autobiography of an untouchable"

یہ ایک بے حد حساس اور حوصلہ مند شخص کی خود نوشت ہے۔ جس کے مصنف "ہزاری لعل" ہیں ہزاری پہلے اچھوت ہیں۔ جنھوں نے اپنی آپ بیتی قلم بند کی۔ وہ ہندوستانی معاشرے کے پست طبقے سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے ہندوستانی اینگلو انڈین اور انگریز ذہنیت کی تصویر کشی کی ہے ہزاری یکے بعد دیگرے کئی انگریز خاندانوں میں نوکری کرتے رہے۔ اسکول میں تعلیم بھی حاصل کی۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کے ایک ٹیچر مسٹر نومین کی ملازمت نے ان کی زندگی میں ایک نیا موڑ دیا ___ مسٹر نومین اور علی گڑھ کے مسلمانوں نے اس کی زندگی میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کیا ___ اول الذکر نے تعلیم اور مطالعہ کے سلسلے میں اس کی حوصلہ افزائی کی اور مسلمانوں نے اسے اخوت اور مساوات کی بنیاد پر سماج میں برابر کا درجہ دیا۔ بالآخر ہزاری نے اسلام قبول کر لیا۔ ہزاری نے اپنی خود نوشت سوانح میں سماج کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا۔ اس خود نوشت سوانح کی اہم چیز یہ ہے کہ اس میں خلاف توقع شدت پسندی نہیں ملتی ہے۔ انداز بیان قائل کر دینے والا ہے یہ آپ بیتی مصنف کی یورپ روانگی کی منزل پر ختم ہوتی ہے۔

نراد۔ سی۔ چودھری کا شمار موجودہ زمانے کے بہترین ہندوستانی نثر نگاروں میں ہوتا ہے ان کی خود نوشت "An autobiography of on unknown Indian" ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔

یہ اپنا ایک منفرد انداز رکھتی ہے یہ ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کرتی ہے جس کی شخصیت کا خمیر دو ثقافتوں اور تہذیبوں کے ٹکراؤ سے تیار ہوا تھا اس میں مصنف کے مخصوص مزاج اور ذہنیت کے ساتھ

ہی ہندوستانی معاشرے کے بعض گوشوں پر نئے رخ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔
ایم۔ این۔ رائے کا شمار ہندوستان کی اہم شخصیتوں میں ہوتا ہے
اگرچہ وہ اپنا کوئی مقام بنانے میں ناکام رہے تھے۔
ایم۔ این۔ رائے خود نوشت سوانح حیات کے تصور ہی سے بھڑکتے تھے
اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار انھوں نے Letters from Jail
میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

"میں آپ بیتی کو معروضی صداقت کے ماخذ کے طور پر بہت غیر معتبر سمجھتا ہوں۔ کوئی شخص اپنے بے حد ذاتی تجربے کے بارے میں مکمل قسم کی سچائی سے نہیں لکھ سکتا ہے۔ درحقیقت میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ذہین لوگ آپ بیتی مرتب کرنے کی طرف کیوں ہیکتے ہیں۔"

ایم۔ این۔ رائے کی یہ رائے آپ بیتی کے بارے میں ضرور تھی۔ لیکن بالآخران کے دوستوں نے ان کو زندگی کے آخری زمانے میں (وفات ۲۵ جنوری ۱۹۵۴ء) یادداشتیں لکھنے پر آمادہ کر ہی لیا۔ اگرچہ اس میں صرف آٹھ سال ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۳ء کے واقعات کا ہی احاطہ ہو سکا ہے۔ یہ آٹھ سال ان کی زندگی کے اہم ترین سال تھے۔ ان کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات ان کی ذات پر حاوی ہیں۔ رائے دنیا بھر میں گھومے۔ کمیونسٹ انقلابی سرگرمیوں میں شریک رہے اور ان کے لینن۔ اسٹالن۔ ٹراٹسکی جیسی بے شمار شخصیتوں سے تعلقات رہے۔
یہ خود نوشت واقعاتی اعتبار سے بہت دل چسپ ہے۔
حیدرآباد۔ جے پور اور میسور جیسی مشہور دیسی ریاستوں کے وزیر اعظم

مرزا اسماعیل بیگ نے اپنے انتظامی تجربے کی وسیع دولت "My Public life" کے عنوان سے ۱۹۵۴ء میں شائع کروائی۔

ایورسٹ کے اولین فاتح Tenzing کی آپ بیتی Man of Everest کے نام سے ۱۹۵۵ء میں طبع ہوئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی بیتی ہمایوں کبیر کے قلم سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ خود مولانا نے اس کے مسودے پر بڑی احتیاط اور توجہ سے نظرثانی کی۔

Many word—An autobiography ایک ممتاز آئی اے ایس افسر کے۔ پی۔ ایس۔ مینن کی خود نوشت ہے۔ وہ کئی ملکوں میں سفیر بھی رہے۔ ملک کے اندر اور بیرون ملک اعلیٰ عہدوں پر فائض رہے اس کتاب میں انھوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے حالات بڑے دل چسپ انداز میں لکھے ہیں۔

مشہور ستار نواز روی شنکر کی آپ بیتی My Music-My life کے عنوان سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی

مشہور انگریزی صحافی فرینک موریس کے بیٹے ڈام موریس (Dom Moraes) کی خود نوشت My father's son-An autobiography کے عنوان سے منظر عام پر آئی ڈام نے بہت کم عمری میں شہرت حاصل کرلی تھی۔ اپنی نجی زندگی کے بیان میں انھوں نے بڑی جراٗت سے کام لیا اور اپنے جذبات اور احساسات کا تجزیہ بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی۔

مشہور دانش ور اور صحافی رستم علی ہاشمی نے اپنی یادیں

Reminiscences کے عنوان سے لکھیں جو نیویارک (امریکہ) میں شائع ہوئیں اور بعد میں ۱۹۷۵ء میں "یادیں" کے عنوان سے اس کا ترجمہ اردو میں بھی شائع ہوا۔ یہ خود گزشت یادوں کا جھرمٹ ہی حالانکہ جیساکہ خود مصنف نے اعتراف کیا ہے۔

"اصل مسودہ ۱۹۳۴ء میں لکھا گیا تھا جبکہ وہ واقعات میرے ذہن میں تازہ تھے لیکن وہ مسودہ گم ہوگیا اب اتنی مدت کے بعد بہت سے واقعات فراموش ہوگئے ان سب باتوں کو یاد کرنا مشکل ہے۔"

شاید اسی وجہ سے واقعات کے بیان میں ایک بے ربطی اور ادھورا پن محسوس ہوتا ہے۔

ہندستانی ادب میں
خود نوشت سوانح حیات کی روایت

ہندوستان اور ہندوستانی ادب میں خود نوشت کا سرچشمہ کیا ہے؟ اپنی ذات کو سمجھنے اور سمجھانے کی فطرت نے سب سے پہلے اظہار کا پیکر کہاں سے تراشا؟

ان سوالوں کا جواب مع ثبوت کے مہیا کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے کیونکہ اپنے دل کی بات کہنے اور دوسروں کی بات سننے کی خواہش اتنی پرانی ہے جتنا کہ انسان میں اپنے وجود کا احساس!

قدیم ہندوستان میں اظہار ذات کی کیا شکل تھی؟ اس کی کچھ جھلکیاں درج ذیل ہیں۔ ہندوستان میں خود نوشت کی ابتدائی جھلک "رگ وید" میں ملتی ہے[1] ایک رشی نے "میں" کا استعمال کرکے بتایا کہ اسے راجہ سے کیا کیا عطیات ملے تھے اس میں سب سے زیادہ قابل توجہ حصہ ایک جواری کی پشیمانی کے بارے

---

[1] The Indian autobiographies in English. Page 14-15-16

میں ہورشی نے بتایا کہ کس طرح وہ جواری بن کر اپنی زندگی تباہ کر بیٹھا وہ اپنے
کنبے کو پہونچنے والے نقصان کو محسوس کرتا ہو مگر جوئے میں اتنی دل کشی
ہو کہ مزاحمت کی سکت نہیں رکھتا وہ اپنی کمزوری پر نادم ہو کر طے کرتا ہو
کہ اب جوا نہ کھیلے گا لیکن جہاں پھر جمی ہو وہاں سے اٹھنے والا شور
اسے بے قابو کر دیتا ہے۔ اور سیدھا وہیں پہونچ جاتا ہو۔ جب دوسکر
لوگوں کا سلیقہ اور گھر دیکھتا ہو تو اسے شدید کوفت اور ندامت ہوتی ہو۔

اشوک ہندوستان کا بہت بڑا بادشاہ گزرا ہو۔ اس نے مختلف مقامات
پر لاٹ نصب کرائیں اور ان پر عبارتیں کندہ کرائیں۔ اشوک کی یہ تمام
کوششیں بدھ مذہب کی تبلیغ کے لیے تھیں۔ لیکن اشوک کے یہاں جہاں
مذہب کی تبلیغ ملتی ہو وہیں اشوک نے اپنی ذات کا اظہار مختلف انداز
میں لفظ "میں" کے ذریعہ کیا۔ سنسکرت ادب میں چند ہی قلمکار ایسے
گزرے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہو۔
ڈرامہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ہو وہ ابتدائیہ Prologue تک ہی محدود
رہا۔

"سدراکا" اسی عہد کے ابتدائی دور کا ایک ادیب گزرا ہو۔ اس نے
اپنے ڈرامہ کے "ابتدائیہ" میں اپنی زندگی کے بارے میں بہت سی باتیں
ایک اداکار کی زبانی کہلوائی ہیں۔ لیکن ایک بات ایسی ہو جو اس سلسلے
میں شک پیدا کر دیتی ہو وہ یہ کہ اس کی موت کی بالکل صحیح تاریخ
بتائی گئی ہو۔ سدراکا کی یہ کوشش اس عہد میں خود نوشت سوانح
حیات کے رجحان کا پتہ دیتی ہو۔ اگرچہ ڈرامہ نگار نے اپنے بارے میں
کھل کر کوئی بات کہنے کی ہمت نہیں کی ہو اور اس کو ڈرامائی اختتام

دے کر غیر حقیقی رنگینی پیدا کر دی ہے۔

ساتویں صدی میں شمالی ہندوستان پر ہرش وردھن راج کرتا تھا اس کے حالات زندگی "بان بھٹ" نامی ایک شخص نے لکھے ہیں اس تصنیف میں "بان بھٹ" نے اپنے حالات زندگی کسی قدر تفصیل سے بیان کئے ہیں۔

دسویں صدی عیسوی میں راج شیکھر۔ جینت بھٹ اور دھن پال نے بھی مختلف تحریروں میں اپنے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں
گیارہویں صدی عیسوی میں راجہ وکرما دیتہ ششم کے حالات زندگی بلہن نامی ایک کشمیری پنڈت نے لکھے اور اپنی اس تصنیف میں اپنی ذات کے متعلق حالات بھی تفصیل سے بیان کئے۔

بارہویں صدی عیسوی کی ایک تاریخ کی کتاب "راج ترنگنی" ملتی ہے جس میں "کلہن" نے اپنے حالات زندگی مختصر طور پر بیان کئے ہیں "کلہن" کی تحریر کی بہت اہمیت اس لیے ہے کہ سنسکرت کا جو لٹریچر امتداد زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے اس میں صحیح تاریخ نگاری "کلہن" کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی، ہی سنسکرت اور ہندی ادب میں کلہن اولین مورخ ہے جس کی عظمت مسلم ہے۔

مذکورہ بالا مثالیں مختصر ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ مفہوم کہیں ادا نہیں ہوتا جو جدید خود نوشت کا تقاضہ ہے تاہم یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ اظہار ذات کے تخم اس دور میں بھی موجود تھے ـــــ آزادانہ انداز میں پوری آپ بیتی کے قسم کی کوئی چیز سنسکرت یا پراکرت میں نہیں ملتی ہے۔ البتہ سوانح حیات بالخصوص راجاؤں کے حالات زندگی لکھنے کا رواج شروع ہو گیا تھا

اور ۱۴ ویں صدی تک یہ رواج خاصہ عام ہو گیا۔

مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے تو سرگزشت نویسی نے نئی کروٹ بدلی۔ نئے دور کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ بعض مسلمان سلاطین اور منصب دار اپنے حالات زندگی اپنے قلم سے لکھتے تھے اور اس طور سے خود نوشت سوانح نگاری ایک الگ صنف کے طور پر منظر عام پر آنے لگی۔

حضرت امیر خسرو (ولادت ۱۲۵۴ء وفات ۱۳۲۵ء) نے اپنے حالات زندگی دو شعری تصانیف "غرۃ الکمال" اور "تحفۃ الصغر" میں لکھے ہیں لیکن پہلا ہندوستانی جس نے آپ بیتی ایک الگ تصنیف کے طور پر لکھی وہ سلطان فیروز شاہ (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء، تھا (تخت نشینی کی تاریخ) اس نے دو اسباب اس تصنیف کے عالم وجود میں آنے کے بتائے ہیں ایک تو تحدیث نعمت یعنی خدا نے جو نعمتیں دی ہیں ان پر خدا کا شکر و احسان بجالائیں اور دوسرے یہ کہ نیک بننے کے خواہش مند لوگ اسے پڑھ کر سبق حاصل کریں اور سمجھیں کہ صحیح راستہ کیا ہے۔ بہرحال بنیادی طور پر یہ کتاب (فتوحات فیروز شاہی) فیروز شاہ کے کارناموں اور فتوحات سے متعلق ہے جو اس نے فرمانروا کے طور پر انجام دیے تھے

فیروز شاہ تغلق کے ڈیڑھ سو سال بعد بابر نے اپنی خود نوشت سوانح حیات مرتب کی جسے "بابرنامہ" یا "تزک بابری" بھی کہا جاتا ہے تزک بابری کی سادگی اور حقیقت بیانی کی وجہ سے بابر کو آپ بیتی نگاروں کا شہزادہ Prince of Autobiographers بھی کہا گیا ہے۔ [1]

---

[1] The Indian autobiographies in English Page 29

بابرنامہ کی حیثیت ایک دلکش ترین آپ بیتی کی ہے اس کی دل کشی کا راز لکھنے والے کی صاف و شفاف شخصیت اور اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کو اپنے دل کا کل احوال بتاتا ہے اور اس پر اعتماد کرتا ہے بابر کو اپنی زندگی کا سچا حال بتانے کی اہمیت کا شعور ہے چنانچہ اس نے اکثر جگہ اس بات پر زور دیا ہے۔

"اس بات پر میں مضبوطی سے جما رہا ہوں کہ ہر معاملے میں سچ تک پہنچا جائے اور یہ کہ ہر واقعہ جس طرح پیش آیا بالکل اسی طور پر قلم بند کیا جائے۔" [1]

بابر نے اپنی تزک میں اپنے نصب العین کو ہمہ وقت سامنے رکھا اس نے کچھ نہیں چھپایا اور کسی کو نہیں بخشا۔ اپنے والد کی کمزوریوں اور طاقت دونوں کا اس نے ذکر کیا ہے کئی بار اس نے اپنے چہیتے بیٹے کی اس کی لغزشوں اور غلطیوں کے باعث سرزنش کی بابر کی تحریروں میں ریاکاری اور بناوٹ نہیں ملتی ہے۔ اسی لیے وہ آسانی سے لوگوں کو اپنا مداح بنا لیتا ہے۔ کوئی بادشاہ اپنی ہزیمتوں۔ فرار۔ اور ناکامی کا تذکرہ اس سادگی کے ساتھ نہ کرے گا جس طرح بابر نے اپنی آپ بیتی میں کیا ہے وہ اس وقت کو نظر انداز نہیں کرتا جب اس کو شکست ہوئی اور وہ سمرقند سے فرار ہوا اور اس کی بہن خانزادہ بیگم شیبانی خاں کے قبضے میں چلی گئی۔

پہلی بار شراب پینے کے سلسلے میں اپنے متضاد تاثرات کا اظہار اس نے بڑے حسین انداز میں کیا ہے۔ دو سال کی توبہ کے بعد شراب کی خواہش کا ذکر بھی اسی قدر متاثر کرنے والا ہے خود نوشت میں اس کے روزنامچے کی خصوصیت

---

[1] بابرنامہ۔ ترجمہ

اس کی تحریر کو مزید مستند بنا دیتی ہے۔

بابر نے اپنی سرگزشت قلم بند کرنے کی جو شروعات کی اس نے اس کی خاندانی تہذیب میں ایک روایت اور ایک رواج کی شکل اختیار کر لی ہندوستان کے پہلے مغل بادشاہ نے جو کام وقت گزاری کے لیے کیا تھا اسے اس کے خاندان کے دیگر لوگوں نے اپنا خاندانی فرض بنا لیا ان کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ "تزک" یا "یادیں" خود لکھتے یا کسی اور کو اس کام پر مامور کرتے۔ یہ روایت برابر جاری رہی۔ تا آنکہ اورنگ زیب نے مبینہ طور پر یہ ہدایت جاری کرادی کہ کوئی مورخ اس کے عہد کے حالات اور واقعات قلم بند نہ کرے۔

بابر کے قائم کیے ہوئے رواج کی تقلید اس کی بیٹی "گل بدن بیگم (۱۵۲۳ء تا ۱۶۰۳ء) نے کی جس نے اپنے باپ بابر اور بھائی ہمایوں کے متعلق یادیں فارسی میں لکھیں۔ اگرچہ اصلاً وہ اپنے باپ اور بھائی کے متعلق لکھنا چاہتی تھی لیکن خود اس کی شخصیت کی جھلکیاں ہر جگہ نمایاں ہیں گل بدن بیگم شائد پہلی ہندوستانی خاتون ہے۔ جس نے اپنی یادیں سپرد قلم کی تھیں ہمایوں نامے کے صفحات سے وہ شاہی خاندان کی ایک شریف اور مہذب رکن کی حیثیت سے ابھرتی ہے۔

بابر کے رشتے کے ایک بھائی مرزا محمد احمد حیدر دوغلت (۱۴۹۹ء تا ۱۵۵۱ء) نے اپنی تصنیف "تاریخ رشیدی" کے دوسرے حصے میں اپنی زندگی کا حال اور ان حکمرانوں اور شہزادوں کے متعلق یادیں فارسی میں لکھی ہیں جن سے ان کی واقفیت تھی۔ انھوں نے زیادہ تر اپنی فوجی مہموں بالخصوص کشمیر اور تبت کی مہموں کی داستان بیان کی ہے۔

بابر اور ہمایوں کے سلسلے میں ان کی یادیں اس کتاب کو ایک تاریخی دستاویز کے طور پر یادگار بنا دیتی ہے۔

جہانگیر (۱۵۶۹ء تا ۱۶۲۷ء) نے اپنے پردادا کی طرح اس بات پر زور دیا کہ اپنی سرگزشت لکھنے کا کام دوسروں کے بجائے خود ہی کیا جائے وہ اپنی کہانی اپنی فرمانروائی کے ۱۷ ویں سال تک ہی جاری رکھ پایا تھا کہ صحت کی خرابی نے یہ سلسلہ منقطع کرنے پر مجبور کر دیا اور اس کے بعد یہ کام "اقبال نامہ" کے مصنف معتمد خاں کے سپرد ہوا جنھوں نے بادشاہ کے نام سے یہ سلسلہ ۱۹ سال تک جاری رکھا اس طور پر جہانگیر کی ۲۲ سالہ بادشاہت کے ۱۹ برسوں تک کا حال ملتا ہے جہانگیر نے اپنی روداد ۲۴ اکتوبر ۱۶۰۵ء سے یعنی ۳۸ سال کی عمر میں اپنی تخت نشینی کے دن سے شروع کی۔ تزک جہانگیری کی ترتیب بھی روزنامچے سے کی گئی ہے جس میں جہانگیر روزانہ کے واقعات لکھا کرتا تھا۔

روزنامچے کے معاملے میں بھی جہانگیر نے اپنے پردادا کی تقلید کی ہے اپنی تزک میں جہانگیر نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان کی بڑی تاریخی اہمیت ہے۔ لیکن جہانگیر کی اپنی شخصیت ملازموں کے تبادلے اور برطرفی کے تذکروں کے انبار تلے دب کر رہ جاتی ہے اور اس کی شخصیت میں جھانکنے کا موقع کم ہی ملتا ہے جہانگیر کا اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو بیان کرنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن بعض باتیں اس کے قلم سے ایسی نکل جاتی ہیں جو نادانستہ طور پر پس پردہ بات کا اظہار کر دیتی ہیں — اور ان سے ایک پیچیدہ شخصیت کی شبیہ ابھرتی ہے۔ جو متصادم خصوصیات اور جذبات کا عجیب و مرکب تھی۔ ایک طرف عدل جہانگیری

کی شہرت ہو اور اسی مقصد سے دروازہ پر ایک زنجیر لگا دی گئی تھی تاکہ ہر مظلوم کی دادرسی ہو سکے۔ دوسری طرف ایک آدمی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اور دو دیگر لوگوں کے گھٹنے کے پیچھے کی نس کٹوا کر معذور کر دیا گیا تھا ان لوگوں کی خطا یہ تھی کہ وہ غلط موقع پر آگئے تھے اور جہانگیر کا شکار بچ کر نکل گیا تھا۔ لیکن تزک جہانگیری دلچسپی سے عاری تصنیف نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جہانگیر کے اوصاف صحیح طور پر ابھر کر سامنے نہ آتے ہوں۔ واقعات کے ڈھیر میں جہانگیر کے دل و دماغ کی متعدد خوبیوں کا انکشاف بھی ہو جاتا ہے۔ بابر کی طرح جہانگیر بھی فطرت کا دلدادہ تھا۔ پھلوں، پھولوں اور حسین مناظر والے مقامات کے بارے میں اس کی نگارشات اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

۱۷ویں صدی کے نصف اول میں لکھا جانے والا ایک اور تذکرہ علاؤالدین اصفہانی عرف مرزا ناتھن کا ہے جس کا عنوان "بہارستان غیبی" ہے وہ جہانگیر کے عہد میں فوجی جنرل تھا۔ اس نے اپنی کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور ان سب کو ملانے والی کڑی اس کی اپنی ذات ہے اس کتاب میں علاالدین اصفہانی نے اپنی فوجی زندگی کی دلچسپیوں کا ذکر کیا ہے۔

ہندوستان کی اپنی زبانوں میں تحریر کی جانے والی آپ بیتیوں میں اولین آپ بیتی ایک جین شاعر "بنارسی داس" کی ہے۔ اس نے مقامی زبان میں اپنی سرگزشت اردھ کتھا (نصف کہانی) سنہ ۱۶۴۱ء میں تحریر کی۔ یہ اس کی ۵۵ سالہ زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ مذہب کے عقید

کے مطابق مثالی عمر جتنی ہونی چاہیے یہ اس کی آدھی عمر ہے۔
"اردھ کتھا" نہ صرف مقامی زبان میں پہلی مکمل شعوری خود نوشت ہے بلکہ اس کی اپنی چند خوبیاں بھی ہیں۔ یہ خود گزشت ایک ایسے آدمی کی ہے جس نے زمانے کے بہت سرد و گرم دیکھے۔ اور جسے اپنی شعری صلاحیتوں اور سماجی ماحول میں تصادم نظر آتا تھا، بہر حال کہانی مزے لے کر بیان کی گئی ہے۔ اور تلخی کی کوئی علامت نہیں ملتی ہے'
بنارسی داس ۱۵۸۶ء میں جونپور کے ایک سنار خاندان میں پیدا ہوا۔ گھریلو ماحول اس کی حساس طبیعت کے لیے ناسازگار تھا شاعری سے اس کی دلچسپی ایک لغزش تصور کی جاتی تھی۔ کیونکہ تجارتی برادری کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اس سے یہ توقع تھی کہ وہ کاروبار میں ہاتھ بٹائے گا۔ گھر والوں کی بیزاری کا ایک سبب اس کی عشق بازی بھی تھا، مزاج اور طبیعت میں بے راہ روی تھی، اس کے باوجود بنارسی داس میں خود اپنے فیصلے اور رائے کی روشنی میں اصلاح کر لینے کی صلاحیت زندہ تھی۔ اس کے اندر ایک بحران کروٹیں لے رہا تھا۔ شیو جی کا وہ بڑا عقیدت مند تھا۔ لیکن ان کے بارے میں اس کا عقیدہ اس وقت سے متزلزل ہونے لگا جب اس نے دیکھا کہ شیو جی اس کے بے ہوشی کے دوروں میں اس کی کوئی مدد نہیں کر رہے ہیں۔ اس اثنا میں ایک سنیاسی نے اسے فریب دیا کہ یہ منتر ایک سال تک پڑھو تو تم کو سونے کے سکے مل جائیں گے مایوس اور دل شکستہ ہو کر اس نے اپنے دل کو ٹٹولا ــــــ اندر جھانک کر دیکھا اور اپنی ذات کا احتساب کیا۔ ایک روز گومتی کے کنارے اپنی کتاب

پڑھتے ہوئے اچانک اسے اپنی گنہگار زندگی کا احساس ہوا — اس نے اپنی لکھی ہوئی نظمیں دریا میں پھینک دیں اور جب واپس ہوا تو ایک بالکل بدلا ہوا انسان تھا۔

اس جگہ بنارسی داس نے اس بات کا ذکر وضاحت سے کیا ہے کہ یہ تبدیلی کسی روحانی روشنی کے اچانک نظر آجانے سے نہیں ہوئی یہ دراصل ایک طویل اور تکلیف دہ روحانی کشمکش کا نقطۂ عروج تھا اور آخری تجزیہ میں مذہبی قدروں نے نہیں بلکہ اخلاقی قدروں نے انقلاب پیدا کیا۔

انگریزوں کی آمد سے پہلے ہی ہندوستان میں آپ بیتی کی جاندار اور پھلتی پھولتی روایت موجود تھی۔ ۱۸ ویں صدی میں فارسی زبان میں لکھے ہوئے کئی تذکرے اور آپ بیتیاں ملتی ہیں۔ بنارسی داس کی خصوصی اہمیت یہ ہے کہ مذکورہ روایت ۱۷ ویں صدی کے آخر تک مقامی زبانوں تک پہونچ گئی۔ قدیم ہندوستان میں آپ بیتی لکھنے کے جذبے کا اظہار اس عہد کے بڑے بڑے بادشاہوں کے سوانح حیات قلم بند کرنے کے ساتھ ذیلی اور ضمنی حیثیت میں ہوجاتا تھا۔ سنسکرت ہی نہیں کبھی کبھی پراکرت کو بھی وسیلۂ اظہار بنایا جاتا — مسلمان اور مغل بادشاہوں اور فوجی جنرلوں کی آپ بیتی نگاری کی روایت وہاں سے چلی آرہی تھی جہاں سے اصلاً ان کا سلسلہ ملتا تھا اور یہ روایت خود نوشت کے جدید تصور سے قریب تر ہے۔ بہر کیف ان لوگوں نے اپنی جو خود نوشت لکھیں اس میں اپنی شان و شوکت کا بیان بنیادی مقصد تھا۔ "بابرنامہ" وہ منفرد تحریر ہے جو اپنی تعریف کرنے

کے نقص سے بے داغ ہے۔ اپنی ذات کا مجرد تجزیہ ہے جسے ہم جدید خود نوشت کا وصف سمجھتے ہیں۔ اس زمانے میں اصل مدعا نہیں ہوا کرتا تھا۔ بلکہ ضمناً قلم سے ٹپک پڑتا تھا۔ اس حیثیت سے بھی اس کی بڑی قدر و قیمت ہے کہ بنارسی داس نے خواص کی زبان میں یعنی سنسکرت اور فارسی کا استعمال ترک کر کے شائد ہندوستان میں آپ بیتی کو قبول عام کی راہ پر ڈالنے کا پہلا قدم اٹھایا تھا۔

اسے اصل دل چسپی انفرادی ذہن کے نشو و نما کی منظر کشی میں تھی اس روایت کے اس مفہوم کے چمن میں بہار انگریزوں کی آمد سے پہلے نہیں آئی۔

اٹھارویں صدی کے اختتام پر ہندوستان میں آپ بیتی نویسی کو ایک آزاد اور قابل احترام اندازِ اظہار تسلیم کر لیا گیا تھا۔ تاہم یہ محلوں کے اندر اور اردگرد کے ایک چھوٹے طبقے تک محدود رہی۔ یہ بہت کچھ شاہی دل چسپی کی چیز تھی اور عام لوگوں بالخصوص ہندوؤں کا اس سے کوئی واسطہ نہ تھا یا بہت ہی کم تھا ـــــ نتیجہ یہ ہوا کہ قومی شعور کے جزو کی حیثیت اسے حاصل نہ ہو پائی۔ اور رفتہ رفتہ اپنی تعریف خود کرنے کا ایک بندھا ٹکا وسیلہ بن کر رہ گئی، ہندو اکثریت کے اس سے کنارہ کش رہنے کا سبب یہ تھا کہ مسلمان آپ بیتی فارسی میں لکھتے تھے۔ اور ہندوؤں کی ایک قلیل تعداد ہی اس زبان کو جانتی تھی۔

انیسویں صدی کے شروع میں انگریزی تعلیم کے رواج پانے سے ہندوستان میں جدید آپ بیتی کی نشو و نما کے لیے سازگار ماحول

پیدا ہوا۔ فرد کی قدر و قیمت انسانی مساوات اور ضمیر و دلیل کی ادیت و اہمیت کا مغربی تصور ہندوستانی شعور میں داخل ہو گیا۔ ذاتی آزادی اور قانون کی عملداری جیسے تصورات نے تعلیم یافتہ ہندوستانی ذہن کو چونکا دیا ـــــ سائنس جس میں دلیل اور تجربہ کو حقیقت کی کسوٹی پر تسلیم کرنا پڑتا ہے، ہندوستانی نصاب میں مغربی مطالعات کے جزو کے طور پر شامل ہو گئی۔

اردو میں
دیگر زبانوں کے قابل ذکر ترجمے

۱	تلاش حق	گاندھی جی	(انگریزی)
۲	میری کہانی	جواہر لال نہرو	(انگریزی)
۳	اعترافات	روسو	(انگریزی)
۴	گردِ راہ	میکسم گورکی	(انگریزی)
۵	وطن کے لیے میرے عزائم۔	شاہ محمد رضا شاہ پہلوی	(فارسی)
۶	ذکرِ میر	میر تقی میر	(فارسی)
۷	عشق نامہ	واجد علی شاہ اختر	(فارسی)
۸	الایام	ڈاکٹر طٰہٰ حسین	(عربی)

تلاشِ حق

مُصنّف :- موہن داس کرم چند گاندھی

موہن داس کرم چند گاندھی کو بیسویں صدی کے ہندوستان میں جو اعلیٰ مقام حاصل رہا ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی اس خود نوشت کی بڑی اہمیت ہے یہ یہی نہیں بلکہ ذات کو بنیاد بنا کر کئے جانے والے متعدد تجربات کی کہانی ہے۔ گاندھی جی کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین نے کیا ہے جو مجموعی اعتبار سے پانچ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے گاندھی جی کی آپ بیتی کا انگریزی عنوان اس کے موضوع پر روشنی ڈالتا ہے۔ "My experiments with truth"

سنہ ۱۹۳۵ء میں لکھی ہوئی تمہید میں گاندھی جی نے لکھا ہے کہ

"میں نے چند عزیزوں اور رفیقوں کے کہنے سے اپنی زندگی کے حالات لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔"

گاندھی جی کے اس ارادے پر ان کے بعض دوستوں نے اعتراضات کیے اس کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"مگر میرے باخدا دوست کو اس بارے میں کچھ شبہے تھے انھوں نے مجھ سے کہا کہ یہ آپ کو کیا سوجھی کہ اس جھگڑے میں پڑ گئے۔ آپ بیتی لکھنا مغربی ملکوں کا دستور ہو میں نے آج تک نہیں سنا کہ مشرق میں سوا ان لوگوں کے جن پر مغرب کا اثر ہو گیا ہو کسی نے آپ بیتی لکھی ہو اور آپ لکھیں گے کیا؟ فرض کیجیے آج آپ جن اصولوں کے قائل ہیں انھیں کل ترک کر دیں یا اب جو تجویزیں آپ کے سامنے ہیں وہ آیندہ بدل جائیں تو کیا اس کا اندیشہ نہیں کہ جو لوگ آپ کی تحریر اور تقریر پر عمل کرتے ہیں وہ دھوکے میں پڑ جائیں گے۔ کیا آپ کے خیال میں یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ ابھی اس قسم کی کتاب نہ لکھیں۔ بلکہ کبھی نہ لکھیں۔" [1]

ان دلیلوں کا کچھ اثر مجھ پر ضرور ہوا لیکن اصل میں میرا مقصد اس قسم کی کہانی لکھنا نہیں جو آپ بیتی کہلاتی ہے میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میں نے اس کوشش میں جو تجربے کیے ہیں ان کی کہانی سنا دوں یہ سچ ہو کہ اپنی ساری عمر تجربوں میں گذری اس لیے یہ کہانی آپ بیتی بن جائے گی — لیکن اگر کتاب کے ہر صفحہ میں سوائے ان تجربوں کے کسی چیز کا ذکر نہ ہو تو میں اسے آپ بیتی لکھنے میں کوئی

---

[1] صفحہ ۸ "تلاش حق" (مترجم ڈاکٹر عابد حسین) مکتبہ جامعہ۔ دہلی

حرج نہیں سمجھتا ہوں، ہو سکتا ہے کہ یہ میرے نفس کا فریب ہو مگر مجھے یقین ہے کہ ان تجربوں کا مسلسل بیان پڑھنے والوں کے لیے فائدے سے خالی نہ ہوگا۔"[51]

"بعض معاملے بندے اور خدا کے درمیان ایسے ہوتے ہیں جن کی کسی اور کو خبر نہیں ہوتی ظاہر ہے کہ یہ چیزیں بیان میں نہیں آسکتی ہیں جن تجربوں کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ ایسے نہیں ہیں مگر ہیں یہ بھی روحانی بلکہ یوں کہیئے کہ اخلاقی تجربے کیونکہ اخلاق ہی مذہب کی جان ہے۔"[52]

اگر مجھے محض علمی اصولوں پر بحث کرنا ہوتا تو ظاہر ہے کہ مجھے آپ بیتی لکھنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیئے تھی۔ چونکہ میرا مقصد یہ ہے کہ ان اصولوں پر جس طرح مختلف صورتوں میں عمل کیا گیا اس کا حال سناؤں اس لیے میں نے ان چند باتوں کا جو میں لکھ رہا ہوں یہ نام رکھا ہے۔" ان تجربوں کی کہانی جو میں نے تلاش حق میں کیئے۔" ظاہر ہے کہ اس میں عدم تشدد تجرد کی زندگی وغیرہ اخلاقی اصولوں کے تجربے بھی شامل ہیں، جنھیں لوگ حق سے جدا سمجھتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک حق اصل اصول ہے جس میں اور بہت سے اصول شامل ہیں۔"[53]

"جو کچھ ان صفحوں میں لکھ رہا ہوں اگر اس میں سے کسی چیز میں پڑھنے والوں کو غرور کا شائبہ بھی نظر آجائے تو انھیں سمجھ لینا چاہیے کہ میری تلاش میں کوئی کھوٹ ہے اور جو جھلک

---

۵۱ صفحہ ۹ ۵۲ صفحہ ۱۰ ۵۳ صفحہ ۱۱ تلاش حق۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

مجھے نظر آیا کرتی ہے وہ محض ایک سراب ہے۔ مجھ جیسے فانی انسانوں کے اعمال کا محاسبہ کرنے میں آپ کو حق کے معیار سے بال برابر بھی نہیں ہٹنا چاہیئے۔" [۵۱]

"مجھے امید ہے کہ میں پڑھنے والوں کو اپنے سارے عیبوں اور خطاؤں سے آگاہ کر دوں گا۔ میرا مقصد لوگوں کو یہ بتانا نہیں کہ دیکھو میں کتنا اچھا ہوں بلکہ فن ستیہ گرہ کے اصولوں سے آگاہ کرنا ہے۔" [۵۲]

کتاب کے اختتام پر "خدا حافظ" کے عنوان کے تحت لکھی ہوئی تمام باتوں میں مندرجہ ذیل سطریں گاندھی جی نے مزید اپنی حق گوئی کی صفائی اور دلیل کے لیے کہی ہیں —

"میں اپنے ان تجربوں کو بہت قیمتی سمجھتا ہوں میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ میں ان کے بیان میں پوری طرح کامیاب ہوا ہوں البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان کی سچی تصویر پیش کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔"

---

۵۱ صد ۱۲ ۵۲ صد ۱۳۰ تلاش حق۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی

میری کہانی

مُصنّف:- پنڈت جواہر لال نہرو

پنڈت جواہر لال نہرو ایک سیاسی رہنما تھے۔ اور ملک کی سیاسی پارٹی کانگرس کے سربراہ تھے۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی انگریزی میں لکھی جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی اس وقت نہ ہندوستان آزاد ہوا تھا اور نہ وہ ملک کے وزیر اعظم بنے تھے اس آپ بیتی میں انھوں نے نہ صرف اپنی زندگی کے تادم تحریر مکمل حالات لکھے ہیں بلکہ اپنے زمانے کی تمام سیاسی تحریکوں اور ان کے رہنماؤں کے سیاسی کرداروں کا تجزیہ کیا ہے۔ اس آپ بیتی کو پڑھتے ہوئے گمان یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی فرد کے حالات نہیں بلکہ ایک پورے عہد کی تاریخ پڑھ رہے ہیں۔ برطانوی حکومت کی ریشہ دوانیوں اور ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں اور رہنماؤں کا ان کے متعلق ردعمل کا ہر گوشہ اور

ہر پہلو نہرو جی کی نظر میں رہا ہو۔ ان نظریات سے اختلاف ایک بالکل الگ چیز ہو۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے خلوص نیت کے ساتھ اپنے زیر تحریر عہد کی بڑی چابکدستی سے عکاسی کی ہے۔

جواہر لال نہرو کی اس آپ بیتی کا محرک کیا تھا؟ جیل میں باوجود سہولتوں کے گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی میں ان محرکات کا ذکر کیا ہے۔

"حال کے تصور سے مجھے تکلیف ہوتی تھی اس لیے میں ماضی کا تصور کرنے لگا اور یہ سوچنے لگا کہ جب سے میں نے قومی معاملات میں حصہ لینا شروع کیا ہندوستان میں سیاسی واقعات کی رفتار کیا رہی ہو۔ اور ہم نے اب تک جو کچھ کیا اس میں کون سی بات بجا تھی اور کون بے جا تھی؟ میں نے اپنے دل میں کہا کہ جو کچھ میں سوچتا ہوں اسے لکھ ڈالوں تو میرے خیالات زیادہ باترتیب اور مفید ہوں گے ــــ اور ایک معین کام میں لگ جانے سے مجھے اس پریشانی اور ادا سی سے بھی نجات مل جائے گی ــــ چنانچہ جون سنہ ۱۹۳۴ء میں میں نے دہرہ دون جیل کے اندر آپ بیتی لکھنی شروع کی اور پچھلے آٹھ مہینے برابر یہ کرتا رہا کہ جب کبھی جی آ گئی بیٹھ کر اسے لکھ ڈالا ــ بیچ میں ایسے کئی وقفے آئے کہ لکھنے کو جی نہیں چاہا ان میں سے تین وقفے تین تین مہینے کے گزرے مگر کسی نہ کسی طرح یہ کام چلتا رہا ــ یہاں تک کہ اب

خاتمہ پر آپہونچا ہے۔ اس کا بڑا حصہ میں نے غیر معمولی پریشانی کے زمانے میں لکھا ہے جب میرے دل پر رنج اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ شاید اس کی جھلک اس کتاب میں بھی آگئی ہے مگر اس کے لکھنے ہی سے مجھے اس سے نجات ملی ہے لکھتے وقت میں نے پڑھنے والوں کو پیش نظر رکھا تھا میرا خطاب اپنے دل سے تھا میں آپ ہی سوال کرتا اور آپ ہی جواب دیتا تھا۔ جس سے مجھے بعض اوقات ہنسی بھی آجاتی تھی میں چاہتا تھا کہ جہاں تک ہوسکے جذبات سے الگ ہوکر بے لاگ طریقے سے غور کروں اور میں سمجھتا تھا کہ ماضی کے اس جائزے سے مجھے اس میں مدد ملے گی۔ [1]

۱۹۳۶ء میں جواہر لال نہرو کی خود نوشت جو خاصی ضخیم ہے شائع ہونے کے بعد اس کے اردو ترجمے کی طرف مکتبہ جامعہ نے فوراً توجہ کی اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں ترجمے سے پہلے ہی اردو میں ترجمہ "میری کہانی" کے نام سے شائع ہوگیا اس کتاب میں جواہر لال نہرو بحیثیت سیاست داں اور ایسی شخصیت کی حیثیت سے حاوی ہیں جو قومی زندگی کے تمام شعبوں میں سماجی اور اقتصادی اصلاح کی شدید خواہش رکھتے ہیں ظاہر ہے کہ ان کی حیثیت ادبی نہیں ہے لیکن ان کی آپ بیتی اور دیگر نگارشات کی ادبی حیثیت بھی ہے۔ ذاتی تذکرے بھی ہیں لیکن ان میں سے بہت سے سیاسی سیاق اور سباق میں ہیں۔ البتہ جیل کے حالات کا تجزیہ انھوں نے نفسیاتی نقطۂ نظر سے کیا ہے۔

---

[1] میری کہانی۔ جواہر لال نہرو ۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ ۱۹۳۶ء صفحہ ۲۸۲، ۲۸۳

جواہر لال نہرو کی یہ کہانی صرف جیل کی چار دیواری کے اندر گزرنے والے شب و روز کی داستان نہیں ہے بلکہ اس میں جگہ جگہ ایسے شاعرانہ نکتے ملتے ہیں کہ پڑھنے والا ان مناظر اور کیفیات میں گم ہو جاتا وہ کہیں شاعر تو کہیں مصور نظر آتے ہیں۔ اپنی دھن میں سرشار اپنی کیفیات میں مست ــــ یہ ان کی شاعرانہ نظر ہے جو جیل کی بے رنگ زندگی میں رنگینی اور شادابی تلاش کر لیتی ہے۔

"پیپل کے وہ چار درخت جو پھاٹک کے سامنے کھڑے تھے پتوں سے قریب قریب خالی ہو گئے تھے اور ان پر ایک افسردگی سی چھا گئی تھی مگر پہاڑ کی ہواؤں نے انھیں پھر گرما دیا اور ان کے رگ و ریشے میں زندگی کی لہر دوڑ گئی دفعتاً ان پیپل کے پیڑوں اور تمام درختوں میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور ایک طلسمات کا عالم نظر آنے لگا جیسے پردے کے پیچھے پراسرار قوتیں کام کر رہی ہوں میں ان شاخوں میں ہری ہری کونپلیں پھوٹتے دیکھ کر چونک پڑتا تھا یہ منظر نہایت ہی خوش گوار اور مسرت خیز تھا کہ دفعتاً لاکھوں کروڑوں پتے بڑی سرعت کے ساتھ شاخوں پر نمودار ہو کر آفتاب کی روشنی میں چمک اٹھے۔ اور پھر ہوا کی تال پر ناچتے ہوئے ان کونپلوں کا دیکھتے دیکھتے پتے بن جانا کتنا عجیب منظر ہے۔"

جیل کی زندگی کی سختیوں کے باوجود جواہر لال اس میں جو دلچسپیاں

ا۵ میری کہانی ــــ جواہر لال نہرو ــــ مکتبہ جامعہ دہلی۔ صفحہ ۱۲۶

تلاش کرتے ہیں، اس کی باریکیاں خود ان کی ذات پر سے بہت سے پردے اٹھا دیتی ہیں اور جواہر لال کو سمجھنا بہ نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ "میری کہانی" میں کہیں کہیں جنگ آزادی کا یہ سپاہی ہمیں ایک معصوم بچہ معلوم ہوتا ہے جس کی آنکھیں فرط حیرت اور تجسس سے جگمگا رہی ہوں اور جسے فطرت کی نیرنگیاں ہر قدم پر اپنا گرویدہ بنا لیتی ہوں۔

"روزمرہ کے مشاغل سے محروم ہونے کے سبب ہمیں فطرت کے مشاہدے کا شوق ہو گیا مختلف قسم کے جانوروں اور کیڑوں کو جو وہاں موجود تھے ہم بہت غور سے دیکھنے لگے جب میری مشاہدے کی قوت بڑھ گئی تو میں نے دیکھا کہ میری کوٹھری اور باہر صحن میں ہر قسم کے کیڑے مکوڑے موجود ہیں اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں تنہائی کی شکایت کرتا تھا اور یہ خبر نہ تھی کہ وہ احاطہ جو بظاہر خالی اور ویران معلوم ہوتا تھا۔ زندگی سے معمور ہے ان رینگنے اور اڑنے والے کیڑوں نے مجھے کبھی نقصان نہیں پہونچایا۔"[1]

جیل کے قیام کے دوران ہی ایک بار نینی جیل سے الموڑے جیل میں تبدیلی کے موقع پر جب جواہر لال باہر کی دنیا کو دیکھتے ہیں تو ان کا قلم مصور کا موقلم بن جاتا ہے۔

"رفتہ رفتہ چوٹیاں بادلوں میں چھپ گئیں درخت بالکل بدل گئے۔ ہر طرف پہاڑیاں۔ دیودار اور صنوبر سے ڈھکی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی سڑک کے موڑ سے

---

[1] میری کہانی صفحہ ۱۲۷

نکل کر ایک نیا منظر سامنے آجاتا تھا۔ پہاڑیوں اور وادیوں کی ایک وسیع فضا اور نیچے کھڈ میں زور شور سے بہتا ہوا دریا، اس نظارے سے میرا جی نہ بھرتا میں اسے ندیدوں کی طرح دیکھ رہا تھا کہ اسے سمیٹ کر حافظے کے خزانوں میں بھر لوں ۔" ۵۱

ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"جیل میں رہ کر مشاہدہ نفس کا بہت موقع ملتا ہے اور اتنے دن قید رہنے سے مجھے اپنی نفسی زندگی کو گہری نظر سے دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ میں خلقی طور پر داخل بیں نہیں ہوں مگر قید کی زندگی میں قہوے کی طرح یا کچلے کی طرح یہ خاصیت ہے۔ کہ وہ انسان کو داخل بین بنا دیتی ہے۔ بعض اوقات میں دل بہلانے کے لیے پروفیسر میک ڈوگل کے کعب کا خاکہ کھینچتا ہوں جس سے داخل بینی اور خارج بینی ناپی جاتی ہے۔ میں اسے نظریں جما کر دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ شکل تیزی سے بار بار بدل رہی ہے ۔" ۵۲

جیل کی زندگی کے بارے میں اپنے مشاہدات اور تجربات، کیفیات اور تاثرات کا جو بیان نہرو جی نے کیا ہے وہ واقعتاً پڑھنے کی چیز ہے ـــ یہ واقعات کا سپاٹ تذکرہ نہیں ہے بلکہ بڑی

---

۵۱ میری کہانی۔ صفحہ ۴۹۴
۵۲ میری کہانی۔ صفحہ ۴۹۹

فکر انگیز باتیں لکھی ہیں۔ نہرو جی میں کرید، تجسس، اور فکر کا مادہ بہت تھا اور اس کی بڑی خوب صورت جھلک آپ بیتی میں ملتی ہے انداز تحریر فلسفیانہ سا ہے۔ لیکن پھر بھی دل چسپ ہے۔ کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟ کا استعمال بیشتر جگہ پر ہوا ہے ـــــ اور پھر ان کے جواب کی بھی تفصیل ہے ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے ذہن کی تمام گرہوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے ـــــ وہ الجھنوں کی نشان دہی کرتے ہیں اور توجیہات بھی پیش کرتے ہیں۔ سیاست کے غالب ہونے کے باوجود نہرو جی کی ذات تقریباً ہر صفحہ پر ابھرتی ہے۔ اور جھانکتی نظر آتی ہے۔ ان کے سائنسی مزاج کے بے شمار نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں کہیں اپنے آپ سے بحث کرتے ہیں۔ کہیں دوسروں سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں لیکن ہر جگہ متانت اور شائستگی نظر آتی ہے۔ ایک اچھی اور کامیاب آپ بیتی ہونے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ نہرو جی کہیں معروضیت سے کنارہ کش نہیں ہوئے ہیں اور کہیں معذرت خواہی نہیں کی ہے۔ افراط و تفریط سے وہ ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔

اعترافات

مُصنّف :۔ روسو

۔۔۔ جب حشر کے دن پرسش کا بازار گرم ہوگا تو میں قادر مطلق کے سامنے بڑی جرأت کے ساتھ یہ کتاب پیش کرتے ہوئے کہوں گا کہ یہ ہے میرے افکار اور اعمال کا نقشہ۔ میں نے اپنی ہر اچھائی اور برائی اس میں پوری صفائی سے بیان کی ہے میں نے خود اپنے بھیدوں کو جنھیں اے خدائے علیم صرف تو جانتا ہے، ظاہر اور آشکارا کر دیا ۔۔۔[1]
یہ عظیم مفکر روسو کی خود نوشت سوانح حیات کے ابتدائی حصے کا ٹکڑا ہے ۔۔۔ روسو نے زندگی کے حقائق اور کمزوریوں کا اظہار جس صاف دلی اور وسیع النظری کے ساتھ کیا ہے اس کے تحت روسو کو مغربی ادب

---

[1] صفحہ ۱۰۷۵ جلد نمبر ۲ ماہنامہ نقوش جون سنہ ۱۹۶۴ء لاہور۔ پاکستان

میں نمایاں اور منفرد مقام حاصل ہے ___ اگرچہ روسو کی رومانی شوریدہ سری سے کسی ایسی ہی چیز کی توقع کی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ زندگی کی ایک ایسی بے باک۔ بے لاگ اور سچی تصویر ہے۔ جو جرأت کا ہی نہیں مصنف کی منصف مزاجی اور صاف دلی کا ثبوت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنھیں روسو کی سی اخلاقی اور فکری جرأت حاصل ہو۔ اسی لیے اکثر جگہوں پر روسو جیسی بے باکی بے وزن اور بے محل ہو جاتی ہے

روسو کے اعترافات Confessions خود نوشت سوانح حیات کی دنیا میں ایک انقلابی شان رکھتے ہیں۔ یہ اعترافات صرف واقعات کی ترجمانی نہیں ہیں بلکہ روسو کی اپنی ذات اور اس کے اتار چڑھاؤ کا آئینہ ہیں۔

"میری زندگی کچھ متضاد خوبیوں کی مالک ہے۔ ایک دن میں مس لمبرسی کے کمرے میں بیٹھا تھا جب یہ خاتون کمرے میں آئیں تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے کنگھے کے سارے دانت ٹوٹے ہوئے ہیں۔ آخر یہ کس کا قصور تھا۔ بظاہر تو صرف میں ہی تھا کمرے میں لیکن یہ میری خطا نہ تھی۔ لمبرسی نے ہر ممکن سزا دے کر مجھ سے اقرار کروانا چاہا کہ خطا میری تھی میں جان دے دیتا مگر ناکردہ گناہ اپنے سر کیوں لیتا۔ آخر جبر و تشدد کو جھکنا پڑا اور میری فتح ہوئی مجھے جسمانی تکلیف ضرور ہوئی لیکن اس سے زیادہ ملال اور دکھ یہ تھا کہ میری مشفق نے مجھ بے گناہ پر یہ ستم توڑا ___ اب یہ بات میرے شعور میں داخل ہو گئی کہ جب کبھی کسی مغرور اور ظالم آقا کی ناانصافی سنتا ہوں تو دل چاہتا ہے کہ ایک خنجر اس ظالم کے جگر کے پار کر دوں۔ اس معمولی واقعے نے مجھ سے میری زندگی کی خوشی چھین لی ___ "[۵۱]

---

۵۱ اعترافات روسو۔ صفحہ ۱۵۷،۱۵۶۔ نقوش آپ بیتی نمبر جون ۱۹۶۴ء (لاہور)

گردِ راہ

مُصنّفہ۔ میکسم گورکی

روس کے مشہور ادیب میکسم گورکی کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا تو انیسویں صدی کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا۔ اس آپ بیتی کو اردو میں منتقل کرنے کا کام ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے انجام دیا۔
مترجم نے جو مقدمہ اس سلسلے میں لکھا ہے اس میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ
"فرد کو وہ پس منظر میں رکھتا ہے اس کی زیادہ توجہ ماحول کی تصویر کشی پر ہوتی ہے تحلیل نفسی سے اسے رغبت نہیں۔۔۔" [1]
مترجم نے اس آپ بیتی پر جو تبصرہ کیا ہے وہ اس آپ بیتی کی معنویت میں اور اضافہ کر دیتا ہے۔

---

[1] آپ بیتی کا پہلا حصہ۔ مقدمہ۔ صفحہ ۵

گورکی نے اپنے بچپن، لڑکپن اور نوجوانی کی داستان خود ہی لکھی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ خوب لکھی ہے ـــــ اس آپ بیتی کا پہلا حصہ گورکی کا شاہکار ہے۔ پیش نظر کتاب ننھے گورکی کو زندگی کی چوٹ پر لا کھڑا کرتی ہے اس کا باپ ایام طفلی میں ہی مر چکا تھا۔ ماں دوسری شادی کر لیتی ہے اور گورکی پرورش نانا۔ نانی کے سپرد ہوتی ہے ابھی یہ نو دس سال کا ہوگا کہ ماں گھل گھٹ کر مر جاتی ہے نانا کنگال ہو جاتا ہے اور گورکی سے کہتا ہے ـــــ اب تمہارے لیے میرے گھر میں کوئی جگہ نہیں جاؤ دنیا میں اپنی جگہ آپ بناؤ ـــــ"

"یہ ایک بے گھر یتیم کی کہانی ہے اور ادب عالم میں ایک خاص مقام رکھتی ہے یہاں پر مبلغ گورکی کو نہیں آرٹسٹ گورکی کو اپنے اوج کمال پر دیکھیں گے یہ اس کے مشاہدے کا کمال ہے ـــــ"[51]

مشاہدے اور حافظے میں بھی کوئی گورکی کا ہم پلہ نہیں ہے اس کی مثال گورکی کی خود نوشت میں ہر جگہ ملتی ہے۔

"میرا بچپن گویا شہد کا چھتا تھا جس طرح شہد کی مکھیاں وہاں شہد لے کر آتی ہیں۔ سیدھے سادے گمنام کسان اپنے تجربے اور مشاہدے لے کر میرے پاس آئے اور اپنے تحفوں سے میری روح کو مالا مال کر گئے ـــــ"[52]

حیرت اس امر پر ہے کہ تیس[32] بتیس[34] سال بعد زار شاہی کے دست برد سے نکل کر اپنے وطن سے کالے کوسوں دور جب وہ اطالیہ کے جزیرے

---

51 آپ بیتی کا پہلا حصہ مقدمہ صفحہ ۵
52 " " " مقدمہ صفحہ ۱۵

کاپری میں یہ آپ بیتی لکھنے بیٹھا تو اسے اپنے بچپن کی ساری باتیں جوں کی توں یاد آ گئیں۔ اس دکھ کی کہانی اور گیت اس کے کانوں میں گونجنے لگے اس کی چال ڈھال تک اسے نہ بھولی۔

گورکی کی خود نوشت پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ گورکی کا اصل میدان سوانح نگاری ہے اس فن کو گورکی نے نئے سانچے میں ڈھالا ہے انقلاب روس سے پہلے جلاوطنی کی حالت میں کاپری میں دن گزارتے ہوئے وہ اپنے ماضی کی ورق گردانی کرنے بیٹھا۔ پہلے تو وہ حیص بیص میں رہا کہ اوائل عمر کے ان جلتے پھپھولوں کو چھیڑ دیا نہیں مگر ضمیر نے دلاسا دیا۔

"جب روس کی اس وحشیانہ زندگی کا خیال آتا ہے تو میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ ان کا ذکر کیوں کیا جائے؟ جواب ملتا ہے کہ یہ ذکر جائز ہے۔ کیونکہ حقیقت پر مبنی ہے وہ بس کا پیڑ ہے جس کی جڑ تک ہمیں پہونچنا ہے — اسے لوگوں کے ذہنوں اور روحوں سے نکالنا ہے اور اپنی مکروہ اور تاریک دنیا سے نکالنا ہے۔"[1]

---

[1] آپ بیتی کا پہلا حصہ۔ مقدمہ۔ صفحہ ۱۱

وطن کے لیے میرے عزائم

مُصنّف۔ شاہ محمد رضا پہلوی

ایران کے شاہ محمد رضا پہلوی نے اپنی آپ بیتی انگریزی میں "Mission for my country" سنہ ۱۹۶۱ء میں لکھی تھی۔ اس کے ایک سال بعد فارسی ترجمہ "ماموریت برائے وطنم" شائع ہوا — دہلی کالج دہلی کے ڈاکٹر یونس جعفری نے سنہ ۱۹۷۱ء میں اس کا اردو ترجمہ "وطن کے لیے میرے عزائم" اور ہندی ترجمہ "دیش کے نام میرا سندیش" کے عنوان سے کیا — شاہ نے دیباچے میں لکھا ہے کہ

"یہ کتاب ایک طرح عام سوانح عمریوں اور یادداشتوں کے موضوع سے الگ ہو کیونکہ اس میں کوشش کی گئی ہو کہ ملک کے سربراہ کے حالات بیان کرنے کے بجائے خود اس ملک کی تاریخ اور اہم واقعات کا ذکر کیا جائے"[1]

---

[1] وطن کے لیے میرے عزائم صفحہ ۱۵

شاہ نے اپنی سرگزشت ضرور بیان کی ہو اور اپنے ذاتی حالات کا بھی ذکر کیا ہے لیکن اصلاً اس کی حیثیت تاریخی اور سیاسی ہے۔ ابتدائی زندگی کے تذکرے میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہو۔ وہ ان کے والد رضا شاہ کبیر کی مضبوط شخصیت ہے یہ کتاب اس اعتبار سے بہرحال اہم اور دلچسپ ہے کہ جس شخص نے شاہی محل میں آنکھ کھولی اس کی پرورش اور اٹھان کس طور پر ہوئی۔ اُسے کیسی تعلیم و تربیت ملی اور کس طور پر فرماں روائی سنبھالنے کے لیے تیار کیا گیا۔ شاہ بہت سنجیدہ طبیعت کے انسان تھے۔ حالانکہ انھوں نے اپنے مغرور ہونے کی تردید کی ہے آپ بیتی میں اس کی گنجائش توقع کے مطابق نہیں نظر آئی کہ وہ اپنے حالات دل اور واردات قلبی بیان کرنے کی کوشش کرتے وہ اپنے کو لئے دئے رہتے ہیں کسی متین فرماں روا سے امید بھی یہی کی جاتی ہو۔ ایران ماضی میں کیا تھا اور اب انھوں نے اسے کہاں پہونچا دیا اس کی پوری تفصیل انھوں نے اپنے نقطۂ نظر سے پیش کی ہے۔ سیاسی ریشہ دوانیوں وغیرہ کے تذکرے بھی بڑی تفصیل سے کئے گئے ہیں۔

شاہ ایران کی خود نوشت ان کی پرشکوہ اور عملی زندگی کا شاندار جائزہ تو ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ خود نوشت کی "پوری زندگی کا احاطہ کرنے والی تحریر" کی تعریف کو غلط بھی ثابت کرتی ہو۔

اس خود نوشت کی اشاعت کے کئی سال بعد شاہ ایران کی زندگی میں جو حیرتناک انقلاب آیا اور وہ جس طرح نیرنگئ دہر کا شکار ہوئے اس کا علم اپنی زندگی کے پراسرار رموز کو بیان کردینے

والے شاہ کو ظاہر ہے کہ نہ تھا۔

شاہ کے عبرتناک انجام کے پس منظر میں شاہ کی خود نوشت "وطن کے لیے میرے عزائم" جب پڑھی جاتی تو قدرت کے ڈرامائی طنز کا احساس شدت سے ہوتا اور پڑھنے والا یہ تسلیم کرنے پر مجبور سا ہو جاتا ہے کہ زندگی اتنی زیادہ پہلودار ہے کہ اس کا بیان کرنے اور اس پر تبصرہ کرنے کے بعد بھی وہ اس کی مکمل تصویر کشی سے قاصر ہو۔

ذکرِ میرؔ

مصنف میر تقی میرؔ

اردو تذکرہ نویسی میں میر تقی میرؔ کو یک گونہ تقدم حاصل ہے۔ اب تک جتنے تذکرے دریافت ہوئے ہیں ان میں "نکات الشعرا" بالعموم قدیم ترین مانا جاتا ہے۔ اسی طرح میرؔ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے آپ بیتی لکھی۔ اس کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے۔ فارسی کی اصل کتاب کے تین نسخے ملتے ہیں۔

۱۔ سنہ ۱۲۲۳ھ (سنہ ۱۸۰۸ء)
۲۔ سنہ ۱۲۳۱ھ (سنہ ۱۸۱۶ء)
۳۔ سنہ ۱۲۴۶ھ (سنہ ۱۸۳۰ء)

ان تینوں میں ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ فرق ملتا ہے۔
میر کی ولادت غالباً سنہ ۱۱۳۶ھ میں ہوئی اور ذکرِ میرؔ کی تصنیف کا

آغاز بہ روایت مترجم نثار احمد فاروقی و قاضی عبدالودود ۱۱۸۵ھ کے آس پاس کا ہے یعنی اس وقت میر کی عمر کم و بیش پچاس سال رہی ہوگی محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں جو باتیں میر کے متعلق لکھی ہیں ان میں کم از کم بعض باتیں ایسی ہیں جو میر ہی بہتر سمجھتے تھے۔ اور اس اعتبار سے ذکرِ میر کی باتیں آبِ حیات سے زیادہ مستند ٹھہرتی ہیں۔

کتاب کے ترجمے کے ابتدائی ۵ صفحات ایسے ہیں جن کا رنگ مضمون اور انداز بقیہ ایک سو صفحات سے اتنا مختلف ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی ۵ صفحات کسی اور مقصد سے لکھے گئے ہیں اور پھر یہ خیال آیا کہ اپنی اصلی سرگزشت اس میں جوڑ دی جائے ___ بہرحال مصنف نے چونکہ اس فرق کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے اس لیے اسے ایک ہی سلسلے کی کڑی مان لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

اس ضمن میں مترجم نے "ابتدائیہ" میں جو رائے دی ہے وہ عام پڑھنے والے کی اس رائے کی آئینہ دار ہے جو وہ اس آپ بیتی کو پڑھ کر قائم کرے گا۔

"___ اس کتاب میں ابتدائی حصہ میر کے والد اور منہ بولے چچا کی تعریفوں اور مسائل تصوف سے بھرا ہوا ہے اس میں نہایت شاعرانہ مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ میر کے والد یا چچا امان اللہ اتنے بڑے صوفی اور بزرگ نہ تھے کہ خلقِ خدا ان کے آستانے کی خاک بطور تبرک لے جاتی یا وہ آسمانِ درویشی کے آفتاب و ماہتاب ہوں اس میں میر نے

جی کھول کر مبالغے سے کام لیا ہے۔" ۵۱

اس کے آگے وہ لکھتے ہیں۔

"میر کو اپنے باپ اور چچا کا سایہ ۱۱۔۱۲ برس سے زیادہ نصیب نہیں ہوا لیکن انھوں نے میر امان اللہ کے ساتھ بعض درویشوں کی صحبتوں میں جانے کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے اقوال اور اشعار نقل کئے ہیں مگر جن دنوں کی یہ باتیں ہیں اس وقت میر کی عمر سات۔ آٹھ سال سے زیادہ نہیں تھی پھر یہ ممکن ہی نہیں کہ اتنا کم سن بچہ درویشوں کے صوفیانہ اقوال کو اس طرح سمجھ سکے کہ تقریباً تیس۔ چالیس سال کے بعد وہ اپنی سوانح عمری لکھنے بیٹھے تو انھیں من و عن نقل کر دے میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ سارے واقعات میر کے اپنے ذہن کی اختراع ہیں۔" ۵۲

میر بد دماغ مشہور رہے ہیں لیکن ان کی خود نوشت سے اس کا کوئی خاص ثبوت نہیں ملتا ہے۔ ویسے یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ خود دار اور غیرت مند تھے۔ اور دست سوال دراز نہیں کرتے تھے اسی وجہ سے وہ ہمیشہ پریشان رہے۔ میر اگر زمانہ سازی سے کام لیتے تو دولت کی کمی نہ تھی۔ جن لوگوں سے انھوں نے مدد لی بھی تو انتہائی مجبوری کی حالت میں اور اس کا ذکر بھی کر دیا ہے۔

---

۵۱ میر کی آپ بیتی ــ از نثار احمد فاروقی صفحہ ۲۱

۵۲ " " " " صفحہ ۲۱

"میری سرگذشت" والے حصے میں ذاتی حالات ضرور ہیں لیکن اس دور کے سیاسی حالات کا تذکرہ حاوی ہے ان واقعات کی کہانی تاریخ کے ماخذ کی بھی حیثیت رکھتی ہے۔ بیرونی حملہ آوروں کی غارت گری ___ سلطنت کے امیروں کی ریشہ دوانیاں اور جوڑ توڑ۔ مغل سلطنت کی کمزوری۔ بادشاہ کی بے بسی۔ افغانوں مرہٹوں اور جاٹوں کی جارحانہ سرگرمیاں۔ افراتفری اور تاراج کی عام کیفیت کا حال میر نے کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے، دہلی کے علاوہ لکھنؤ کے حالات پر بھی اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے

عشق نامہ

مُصنّف واجد علی شاہ اختر

"عشق نامہ" واجد علی شاہ کی آپ بیتی بلکہ عشق بیتی فارسی نثر میں ہے۔ جس کا اردو ترجمہ سب سے پہلے میر فدا علی خنجر نے اور اس کے بعد تحسین سروری نے کیا۔ ان کی ایک اور آپ بیتی "حزن اختر" مثنوی کی شکل میں ہے جو اردو زبان میں ہے۔

فارسی خود نوشت سوانح حیات "عشق نامہ" کا ترجمہ ۱۹۱۴ء میں مرزا فدا علی خنجر نے کیا۔ اس کتاب کے پانچ اڈیشن منظر عام پر آئے۔ خنجر کے ترجمہ سے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے تحسین سروری نے ازسرنو اس کتاب کا ترجمہ کیا اور اس دفعہ یہ کتاب "پری خانہ" کے نام سے شائع ہوئی۔

۱۲۶۵ھ میں آٹھ سے اٹھائیس سال تک عمر کی جو آپ بیتی

عشق نامہ کے نام سے لکھی گئی۔ اس میں نام کی مناسبت سے واجد علی شاہ نے صرف اپنے وہی واقعات درج کیے جو ان کی عاشقانہ طبیعت کی عکاسی کرتے تھے۔ اس تصنیف کی نمایاں خصوصیت صاف گوئی ہے اس میں متعدد معاشقوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ واجد علی شاہ سے پیشتر بھی دیگر بادشاہوں کی عیش پرستی کی بے شمار باتیں مشہور ہوئیں مگر فرق صرف اتنا ہے کہ واجد علی شاہ نے کسی اور کو لکھنے کا موقع ہی نہ دیا۔ گفتنی ناگفتنی خود ہی سب کچھ لکھ ڈالا۔

کتاب کا اصل موضوع عشق و عاشقی ہونے کے باوجود اس میں مذہب اور خدا ترسی کے نمونے بھی ملتے ہیں اگرچہ ان باتوں کی حیثیت ضمنی ہے لیکن عمارتوں، باغوں کی تعمیر۔ رشتہ داروں اور بعض دوسرے لوگوں کی اموات کا ذکر بھی ہے۔ کہیں کہیں ناصحانہ انداز بھی اختیار کیا گیا ہے۔ واجد علی شاہ کی یہ خود نوشت اپنی متنوع خصوصیات کی بنا پر ایک الگ مقام رکھتی ہے۔

اَلاَیّام

مُصنّف ڈاکٹر طہٰ حسین

عربی ادب کے مشہور عالم طہٰ حسین کی خود نوشت سوانح حیات اُلایّام آپ بیتی کی دنیا میں ایک نرالی اہمیت رکھتی ہے یہ ایک ایسے شخص کی داستان حیات ہے جو بچپن میں ہی دنیا کو دیکھنے کے حق سے محروم ہو گیا تھا۔ مگر اپنی بند آنکھوں سے وہ نہ صرف دنیا کو دیکھتا ہے بلکہ قاری کو بھی ان نظاروں اور کیفیات کا شریک بناتا ہے

ڈاکٹر طہٰ حسین مصر کے ایک قدامت پرست گھرانے میں پیدا ہوئے ان کی تعلیمی زندگی کی ابتدا ایک چھوٹے سے مدرسے سے ہوئی۔ بصارت سے محرومی ان کے علمی ذوق و شوق میں کبھی رکاوٹ نہیں بنی اور یہی شوق انہیں جامعہ ازہر تک لے گیا۔ جامعہ ازہر میں طہٰ حسین نے نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کی بلکہ جامعہ قاہرہ میں قدیم یونانی اور رومن تاریخ

اور کچھ عرصے کے بعد عربی ادب کے پروفیسر ہو گئے۔ اور اپنے فکر و فلسفے سے مصر اور پورے عالم اسلام میں ایک طوفان برپا کر دیا۔

طٰہٰ حسین کی خود نوشت "الایام" کا اردو ترجمہ اسی نام سے انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا۔ "الایام" کا اردو ترجمہ سید عبدالباقی شطاری نے کیا ہے۔ اس خود نوشت کا اسلوب انوکھا ہے۔ مصنف نے اپنی آپ بیتی اس طرح سنائی ہے جیسے وہ کسی اور پر بیتی ہو۔ بچپن کے بے لوث واقعات۔ بھائی بہنوں کی سہانی یادوں کے علاوہ تعلیمی زندگی کے اتار چڑھاؤ کی خوب صورت تصویریں اس تصنیف میں یکجا ہیں۔

ایک بچہ جو بصارت جیسی اہم حس سے محروم ہو اس کے جذبات بڑے متاثر کن ہیں۔

"اس کا گمان غالب ہے کہ یہ وقت اس روز کے فجر یا عشا کا تھا اپنے اس خیال کو وہ اس لیے ترجیح دیتا ہے کہ اس وقت اس کے چہرے کو جو ہوا لگ رہی تھی وہ کس قدر ٹھنڈی تھی اور اس میں دھوپ کی گرمی نہیں پائی جاتی تھی۔"

"۔۔۔ وہ اس گری ہوئی حالت میں بھی نابینا ہونے کے باوجود کشادہ پیشانی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے اور وہ اپنے رہنما کے ساتھ ازہر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اس کے قدم نہیں لڑکھڑاتے اور اس کی چال نہیں بگڑتی اور نہ اس کے چہرے سے وہ تاریکی ظاہر ہوتی ہے جو عموماً نابیناؤں کے چہرے سے ظاہر ہوتی ہے وہ آنکھوں کو حقیر دکھائی دے گا

تیسرا باب

اردو میں آپ بیتی کے اظہار کی مختلف نوعیتیں

ا۔ روزنامچہ
ب۔ خطوط
ج۔ سفرنامہ
د۔ رپورتاژ
ہ۔ متفرق تحریریں

(اس بحث سے قطع نظر کہ ہمارا افسانوی ادب دراصل ہمارے تجربات کا ہی دوسرا نام ہے اور افسانوی اشخاص دراصل ہماری ذات کا ہی حصہ ہوتے ہیں۔)

وہ تحریریں جن سے فن کار کی ذات باہر جھلکتی ہے، اور باوجود پردہ پوشی کے پردہ دری ہو ہی جاتی ہے۔ وہ روزنامچے خطوط سفرنامے۔ شخصی تاثرات اور زندگی کے کسی مخصوص دور کی مختصر روداد یں ہیں۔ جب وہ ان تحریروں میں بار بار "میں" کا استعمال کرتا ہے۔ اور غیر شعوری طور پر اپنے بارے میں اظہار خیال کرتا ہے۔
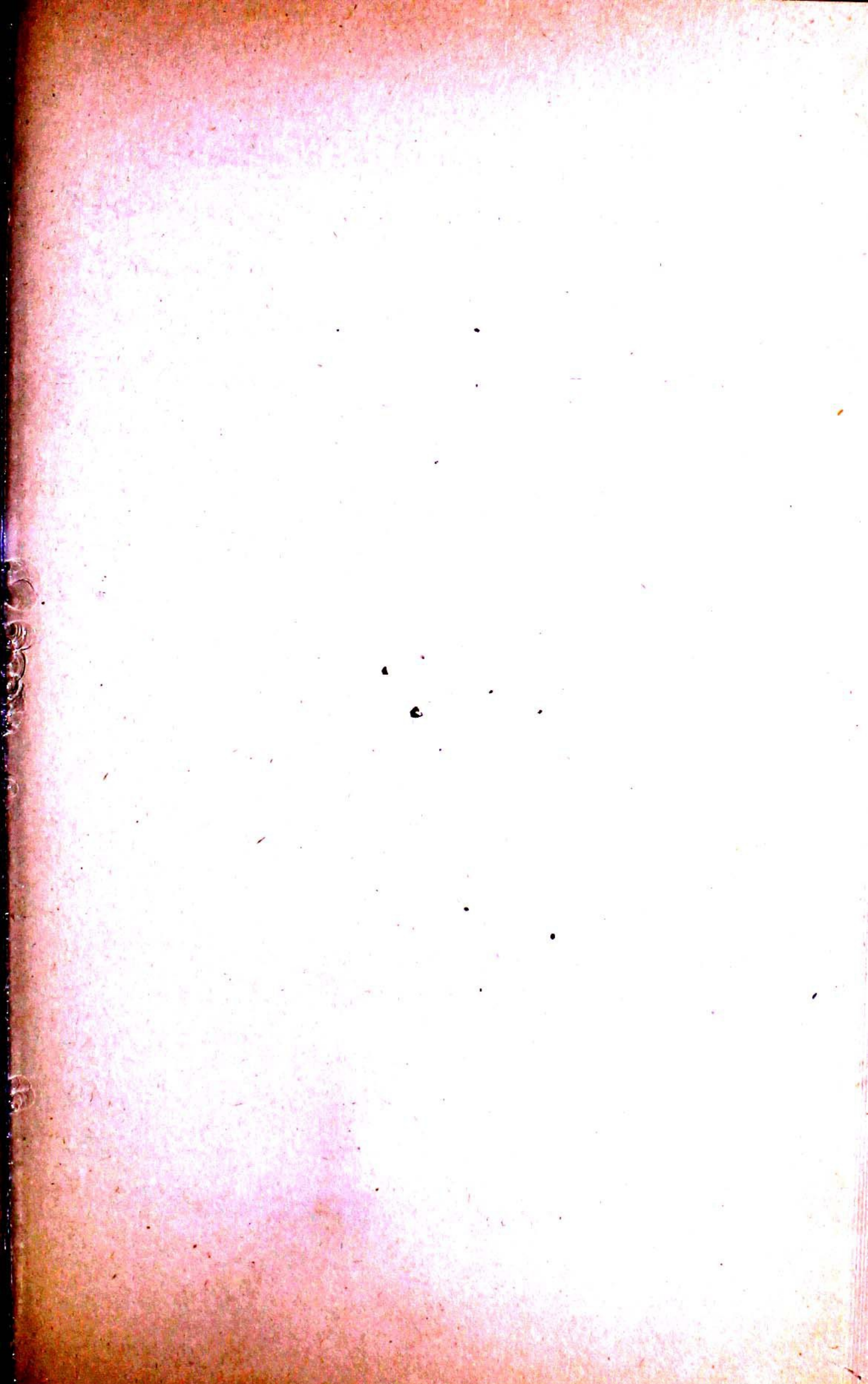
روزنامچہ

روزنامچہ ایک ایسی چیز ہے جو آپ بیتی کے قریب ترین پہنچتی ہے اور اس میدان میں سفرنامہ۔ رپورتاژ۔ خطوط۔ ملفوظات وغیرہ کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔ روزنامچہ ایک حد تک غیر مدون خود نوشت کا خاکہ کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں روزنامچے کو مدون کر کے آپ بیتی مرتب کی جا سکتی ہے روزنامچے اور آپ بیتی دونوں کے لکھنے کے محرکات میں مماثلت پائی جاتی ہے دونوں میں لکھنے والا اپنے ارد گرد کے حالات کو اپنی ذات کی عینک سے دیکھ کر قلم بند کرتا ہے۔ یہ دونوں اصنافِ ادب میں تحلیل نفسی کے شائقین کو صاحب تحریر کے محرکات کا پوسٹ مارٹم کرنے کا ایک اچھا موقع فراہم کرتی ہیں۔ روزنامچے اور خود نوشت

دونوں کا ماخذ ایک ہی ہے لیکن دونوں کا اختلاف بھی دل چسپ ہے۔ بعض اوقات جزئیات کی دل چسپی اور پرکاری میں روزنامچے خودنوشت سے بھی بازی لے جاتے ہیں۔ جیسا کہ انگریزی میں ایولن (Evelyn) اور پیپس (Pepys) اور اردو میں مولوی مظہر علی سندیلوی کے روزنامچہ سے ظاہر ہے۔ ان میں روزانہ حرکات اور واقعات جو لکھنے والے کے مشاہدے یا علم میں آتے ہیں قلم بند کیے جاتے ہیں۔ ان کی خوبی یہی ہے کہ یہ ذاتی تاثرات کو جبکہ وہ ابھی تازہ ہی ہوتے ہیں قلم بند کر کے اسے ایک نعمت غیر مترقبہ کے طور پر محفوظ کر لیتے ہیں۔ اور تجربات مابعد کی روشنی میں ان کے از سر نو جائزے کا موقع دیتے ہیں۔ در اصل آپ بیتی اور روزنامچے کا ایک اہم فرق یہ بھی ہے کہ آپ بیتی بغرض اشاعت لکھی جاتی ہے اور اشاعت کی نیت اس کے خلوص کو کم کر دیتی ہے۔ آپ بیتی لکھنے کا مقصد اپنی وضاحت کرنا۔ برتری جتانا یا دوسروں کی رہبری کرنا ہو سکتا ہے۔ لیکن روزنامچے کا محرک صرف ایک خلش ہے۔ روزنامچے اور آپ بیتی میں ایک خفیف سا فرق یہ بھی رہتا ہے کہ اول الذکر نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ اس میں اہم ترین باتوں کے ذہن سے اتر جانے کا امکان نہیں رہتا۔ خود نوشت سوانح حیات چونکہ عموماً عمر کے آخری حصے میں ترتیب دی جاتی ہے اس لیے مصروف زندگی کے ہزارہا واقعات میں سے بعض باتوں کے ذہن سے فراموش ہو جانے کا امکان یقیناً رہتا ہے جو آپ بیتیاں روزنامچوں کو بنیاد بنا کر لکھی جائیں گی وہ یقیناً ان تمام باتوں کا احاطہ کر سکیں گی۔

روزنامچے کا زندگی سے بڑا قریبی تعلق ہے۔ اس کا تسلسل اور بے ربطی اور نشیب و فراز بھی زندگی کی طرح ہے۔ یوں تو خطوط بھی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں مگر خطوط لکھتے وقت مخاطب کا تصور ذہن میں ضرور رہتا ہے لیکن روزنامچے میں لکھنے والا خود اپنی ذات سے مخاطب ہوتا ہے۔ اس لیے آخر الذکر سے صحت بیان کی زیادہ توقع کی جاتی ہے۔

روزنامچہ خود نوشت کے لیے خام مواد مہیا کرتا ہے۔ یہ یادوں کا ایک وسیع ذخیرہ ہوتا ہے جس میں سے خود نوشت کے لیے انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ ردّ و قبول کی بڑی گنجائش ہوتی ہے مولوی مظہر علی سندیلوی اور خواجہ حسن نظامی دو ایسی شخصیتیں گزری ہیں جنھوں نے روزنامچہ بھی لکھا ہے اور آپ بیتی بھی لکھی۔ خواجہ صاحب کا شمار ہمارے ادب کے مشاہیر میں ہوتا ہے انھوں نے مختلف النوع موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اور ان کا مقام اردو ادب میں مسلم ہے۔ مگر مولوی مظہر علی صاحب کے لیے یہ بات نہیں کہی جا سکتی لیکن ضخامت اور جزئیات کی تفصیل نگاری ایسی باتیں ہیں جن سے ان کا روزنامچہ خواجہ صاحب کے روزنامچوں پر بازی لے جاتا ہے۔

آپ بیتی میں کسی قدر منصوبہ بندی ضرور ہوتی ہے اور ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ لوگوں نے مسودہ مرتب کیا اور اس کو قلم زد کر کے پھر سے لکھا۔ لیکن روزنامچے کے لیے کسی ترتیب کی بھی ضرورت نہیں ہوتی یہ انتشار کا مظہر ہوتا ہے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پیش آمدہ واقعا فوراً اور اگر ممکن ہو تو اسی دن قلم بند کر لیے جائیں۔ پہلا واقعہ آخر میں اور

آخری واقعہ شروع میں بھی آسکتا ہے۔

روزنامچہ نویسی بھی کیا کوئی فن ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اردو میں روزناموں کا ذخیرہ اس قدر قلیل ہے کہ اس کے بارے میں کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں۔

انگریزی زبان میں روزناموں کا ایک تفصیلی سلسلہ ملتا ہے اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ انگریزوں کی زندگی میں بڑی باقاعدگی ہے۔ وہ ہر کام بڑے سلیقے سے کرتے ہیں۔ انگریزی زبان کی یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ وہی ڈائریاں کامیاب ہیں جو غیر معروف لوگوں نے لکھی ہیں۔

انگلستان میں ڈائری رکھنے کا آغاز روحانی زمرے سے ہوا Jhon Bcadle (وفات ۱۶۶۷ء) نے اپنے عقیدے کے مسیحوں کو تلقین کی وہ اپنے روحانی تجربات کا ریکارڈ رکھا کریں Bcadle نے اپنے پیغام کی تشریح ایک کتاب* میں کی۔ یہ کتاب ۱۶۵۶ء میں شائع ہوئی یہ ذاتی ڈائری نہیں بلکہ Calvinish مسلک والوں کے لیے مذہبی طرزِ عمل کا ہدایت نامہ ہے اس ہدایت نامے میں ساری باتیں مذہبی نوعیت کی ہیں لیکن ان کے اندراجات سے غیر مذہبی معاملات سامنے آسکتے ہیں مثلاً ایک ہدایت یہ بھی ہے۔

"خدا نے تمھاری دعاؤں پر جو کچھ کیا ہو ان کو سپردِ قلم کیا جائے"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی لبادے میں ذاتی نوعیت کی بہت سی باتیں احاطہ تحریر میں آسکتی تھیں اور واقعتاً آئیں —— آرتھر ولسن نے دراصل ایک خود نوشت لکھ ڈالی اور یہ غیر مذہبی امور کا ایک ریکارڈ

---

* The Journal or diary of a thankfull christian"

ہے جس پر اخلاقی غلاف چڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہمارے یہاں آپ بیتی اور روزنامچے کو لوگ عموماً شہرت کی بنیاد نہیں بناتے اور ایک عام رجحان اسے "مدِ فاضل" سمجھنے کا رہا ہے۔

خواجہ حسن نظامی چونکہ معروف شخصیت کے مالک تھے ان کی اور دوسری تصانیف تھیں۔ اس لیے ان کے روزنامچے کی موجودگی سے لوگ واقف ہیں اس کے برخلاف مولوی منظر علی سندیلوی کا روزنامچہ ۱۹۱۱ء میں تمام ہوا اور چالیس سال تک ادبی دنیا کو ۹۹۷ صفحات پر پھیلے ہوئے اس روزنامچہ کا علم نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے ۱۹۵۴ء میں اس کا تعارف کرایا اور اس کے اقتباسات پونے دو سو صفحات میں پیش کیے یقیناً ایسے روزنامچے اور بھی لکھے گئے ہوں گے لیکن یا تو کرم خوردگی کا شکار ہو گئے یا زمانے کی ناقدری کے ہاتھوں تلف ہو گئے۔

ایک نادر روزنامچے کے تعارف کے ذیل میں ڈاکٹر ہاشمی نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ:

"یہ بیک وقت ایک تاریخ بھی ہے ایک سوانح عمری بھی اور زندگی کی داستان بھی ہے" [1]

اس روزنامچے میں آپ بیتی کے جزو کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ

"تاریخی اور تمدنی حیثیت سے قطع نظر یہ ایک مکمل سوانح عمری ہے مولوی صاحب کی زندگی کے تمام پہلو مثلاً سعی روزگار، ترقی کی کوشش زمانے کی سازگاریاں اور ناسازگاریاں۔ اپنا کریکٹر، خیالات۔ عادات و اعتقادات اپنی خوبیاں اور کمزوریاں غرضیکہ ان کی

---

[1] ایک نادر روزنامچہ۔ نور الحسن ہاشمی صفحہ ۲۰ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۴ء

زندگی کا ہر گوشہ اجاگر ہو۔ مولوی صاحب سال کے اختتام پر اپنی زندگی
کا محاسبہ اور دنیا کے حالات پر تبصرہ ضرور کرتے یہ تبصرے بھی
دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔" [۵۱]

کبھی کبھی یہ روزنامچے انسانی زندگی کے کسی مخصوص پہلو پر زور دیتے ہیں جیسے کہ اختر انصاری کی ادبی ڈائری ہے جو مصنف کی ادبی دنیا اور معاصر ادیبوں سے مصنف کے تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے

خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے خودنمائی کے باوجود اپنی منفرد شان رکھتے ہیں۔ ان کے روزنامچے کو ایک مخصوص عہد میں بڑی مقبولیت ملی تھی اس لیے خودنوشت سوانح حیات اور روزنامچے کے درمیانی ربط کو واضح کرنے کے لیے خواجہ حسن نظامی کا یہ قول کافی مددگار ثابت ہوتا ہے۔

"میں نے جب کبھی اپنی زندگی کا روزنامچہ لکھا تو محسوس
ہوا گویا اپنے عرفان ہستی کا کھاتہ لکھ رہا ہوں کیونکہ
جب اس کو دیکھتا ہوں آمد و خرچ کا حساب یاد آتا ہے" [۵۲]

---

۵۱ ایک نادر روزنامچہ۔ نور الحسن ہاشمی صفحہ ۱۸ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ سنہ ۱۹۵۴ء
۵۲ آپ بیتی۔ خواجہ حسن نظامی صفحہ ۱۳۴ سنہ ۱۹۱۹ء

خطوط

خطوط کو اگر اظہارِ ذات کا وسیلہ سمجھ کر پڑھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تحریر و نگارش کے ذخیروں میں یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں ظاہرداری کی آمیزش کی کم سے کم گنجائش ہے بلکہ کہیں کہیں اپنی اسی خوبی میں وہ خود نوشت سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے ایک اچھے خط کی کامیابی یہی ہے کہ وہ "نصف ملاقات" بن جاتا ہے لیکن خطوط اپنی بے ریائی اور سادگی کی وجہ سے کہیں تو ملاقات سے بھی بازی لے جاتے ہیں بعض اوقات خطوط کے ذریعے وہ باتیں کہی جا سکتی ہیں جو یوں کہنا بہت مشکل ہوں گی۔ بقول غلام رسول مہر۔

"کبھی خاص قسم کے جذبات اور تاثرات کا سیل متلاطم ضبط و احتیاط۔ فکر و تأمل کے اس حصار کو توڑ ڈالتا ہے جو انسان کی دانش آرائی اور عاقبت اندیشی، تحفظ شخصیت کے لیے بڑے

اہتمام سے تعمیر کرتی ہو۔ سیل گزر جائے یا اس کا زور و تلاطم و تموج ختم ہو کر حالات طبعی صورت اختیار کر لیں تو ممکن ہو ان نگارشات پریشانی کا احساس ہو۔ لیکن جو گوشہ سیرت ایک یا رب نقاب ہو جائے پھر اس پر تاویلات کے پردے ڈالنا بے کار ہو ہمارے بعض بلند مرتبت اکابر کے مجموعوں میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ اگر یہ مثالیں محفوظ نہ ہو جاتیں تو ہم ان کی سیرت کے بعض اہم پہلوؤں کی نظارہ آشامی سے محروم رہ جاتے۔ محرمی کی یہ تقریب خطوط اور مکاتیب کے ذریعے سے میسر آئی۔ تصانیف کی طوالت میں اس کا سراغ کہاں ممکن تھا۔" [۵]

یہی وجہ ہو کہ اکابر اور مشاہیر کے خطوط فراہم کرنے کی طرف ارباب علم و ادب ہمیشہ سے متوجہ رہی ہیں اور خطوط کے سرمائے کو ہمیشہ سے ایک قیمتی اندوختہ سمجھا گیا ہو۔

ایک سوانح نگار کا قلم اپنے ہیرو کی زندگی کا جو مرقع کھینچتا ہو وہ صرف اس کے ظاہری خدوخال کی نقاشی ہوتی ہو عمق قلب کے اندر جو اسرار و رموز ہیں اور جن سے اصل میں انسانیت عبارت ہو اس کی تصویر کشی کے لیے جو رنگ درکار ہو وہ دوسروں کو میسر نہیں آ سکتا ہو۔ خود نوشت سوانح عمریاں ایک حد تک اس کی تلافی کرتی ہیں۔ لیکن چونکہ لکھنے والا یہ سمجھ کر اپنے حالات حوالہ قلم کرتا ہو کہ ایک دن یہ مجموعہ لوگوں کے ہاتھ میں جائے گا اسی لیے تصویر میں جہاں جہاں داغ ہیں وہاں رنگ بھر دینے کے امکانات

---

[۵] غلام رسول مہر۔ صفحہ ۱۳ نقوش خطوط نمبر

بھی ہیں اور اسی بنا پر کبھی کبھی خود اس کا بنایا ہوا مرقع اس کی سچی شبیہ نہیں ہوتا۔ جو شے انسان کی حقیقی شکل وصورت کا آئینہ ہو سکتی ہے وہ اس کے ذاتی اور نجی خطوط کا ذخیرہ ہے چونکہ لکھنے والے کو کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس کے پوشیدہ اعترافات منظر عام پر آئیں گے اور پھر بہت سے مکتوب الیہ ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے کوئی پردہ نہیں رہتا۔ اس لیے وہ نہایت سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنا ہر حال اور خیال بے پس و پیش حوالہ قلم کرتا جاتا ہے اس لیے اس آئینے میں انسان ویسا ہی نظر آتا ہے جیسا کہ وہ درحقیقت ہے۔

مگر افسوس ہے کہ ہمارے یہاں خطوط کی نقلیں رکھنے کا تقریباً کوئی اہتمام نہیں ملتا ہے نتیجے میں بیشتر مکتوب ضائع ہو جاتے ہیں اور کسی بھی مخصوص مسئلے پر تسلسل کی امید نہیں کی جا سکتی — ایسے مشاہیر بھی ہیں جو موصول ہونے والے خطوط سے عاجز رہتے ہیں۔ فراق گورکھپوری کا شمار ہمارے ادب کی اہم شخصیتوں میں ہوتا ہے لیکن ان کو بڑی شکایت ہے کہ اس قسم کے خطوط سے جو ان کے پاس ملک کے کونے کونے سے آتے ہیں ان کا بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔ جو خطوط تلف ہو جائیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک گوشہ گم ہو گیا اور اب اس کی بازیابی کی کوئی صورت نہیں۔

سر راس مسعود نے محمد معین زبیری کے نام ۲۵ مئی ۱۹۲۲ء کے ایک خط میں سر سید احمد خاں کے خط کے بارے میں لکھا تھا۔

"بہتر یہی ہے کہ سب صاحبوں کے خطوط سیریز کی طرح پبلک کے سامنے پیش ہوں۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کے بیٹے کو تسلسل کی اہمیت کا احساس تھا ظاہر ہے کہ بے ترتیب خطوط کی حیثیت اس زنجیر کی سی ہے جس کی کڑیاں ٹوٹی ہوئی ہوں۔

اردو خطوط نگاری میں مرزا غالب ایک منفرد مقام کے مالک ہیں ان خطوط میں مرزا کا رنگِ طبیعت، نجی زندگی کی تنگائیں احساسِ تنہائی کی بے کیفی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہے۔ مرزا غالب کے خطوط ان کی زندگی میں شائع ہوئے مرزا نے خود اپنے اندازِ تحریر پر ناز کیا یہ وہ خطوط ہیں جن میں ذاتی معاملات کے علاوہ ان کی مے نوشی اور عشق بازی کے تذکرے ہوئے ہیں اور اگر دیکھا جائے تو پہلی بار ان خطوط میں ہی کوئی بلند و بالا انانیت پسند اپنی کمزوریوں پر سے چپکے سے پردہ اٹھاتا ہے۔

"روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں کبھی حقہ پی لیا کبھی روٹی کا کوئی ٹکڑا ابھی کھا لیا۔" [۵۱]

"ابر گھرا ہے ترشح ہو رہا ہے ہوا سرد چل رہی ہے پینے کو کچھ میسر نہیں ناچار روٹی کھائی ہے" [۵۲]

پردہ داری کے اس دور میں یہ پردہ دری صرف مراسلت میں ہی ممکن ہے۔ غالب کے وہ خطوط جن میں غالب نے فکرِ روزگار کا تذکرہ کیا ہے۔ ہمارے سامنے اجڑی ہوئی دلی میں رہنے والے اس مرزا نوشہ کی تصویر کھینچتے ہیں جو اگرچہ افراسیاب کا پوتا ہے جو اپنی شاعری میں خدا۔ روح الامین جنت دوزخ، حور و غلماں، عیسیٰ

---

۵۱ عودِ ہندی صفحہ ۱۱۵ ۵۲ صفحہ ۱۷۴

موسیٰ، یوسف۔ لیلیٰ، مجنوں اور فرہاد کو خاطر میں نہیں لاتا ہے مگر جب ہم غالب کی اس شاعری کو ان خطوط کو سامنے رکھ کر پڑھتے ہیں تو غالب کی قدر و قیمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

"برسات کا حال نہ پوچھو خدا کا قہر ہے قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیگ خاں کے کٹرہ کی طرف کا دروازہ گر گیا مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں صبح بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں مینھ گھڑی بھر برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے کتابیں قلمدان سب توشہ خانہ پر فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا کہیں چلپچی دھری ہوئی خط کہاں بیٹھ کر لکھوں؟" [1]

"میرا حال سنو بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا اس طرف رمضان کا مہینہ روزہ کھا کھا کر کاٹا آیندہ خدا رزاق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے بس ایک چیز کھانے کو ہوئی اگرچہ غم ہی ہو تو پھر کیا غم ہے" [2]

ان خطوط میں ایک نئے غالب کا انکشاف ہوتا ہے جس کی طبیعت کی صاف گوئی اور بے ریائی ان الفاظ سے جھانک رہی ہے۔ اپنے بیش تر خط خود غالب نے مرتب کے حوالہ کیے تھے اگر وہ چاہتے تو آسانی سے وہ عبارتیں نکال سکتے تھے جن سے ان کی ذات اور شہرت پر حرف آتا ہو۔ مگر انھوں نے ایسا نہ کیا۔ آج انھیں خطوط کی بنا پر

---

[1] [2] عود ہندی۔ صفحہ ۱۲۲۔ مطبوعہ۔ رام نرائن لعل بینی مادھو

پر لوگ غالب پر حملے کرتے ہیں لیکن ان دنیوی مصلحتوں اور بشری کمزوریوں کی وجہ سے غالب ہمیں اور زیادہ عزیز ہو جاتا ہے غالب کے خطوں میں ہم کلامی کی جو آرزو موجزن ہے وہ خود کہے دیتی ہے کہ غالب اپنے عہد میں کتنا اکیلا تھا ـــ اسے کوئی رفیق تنہائی میسر نہ تھا۔ یہ خطوط اس کی ذات کی خود انجمنی کے گواہ ہیں۔

غرضیکہ خطوط غالب میں وہ تمام لوازمات پائے جاتے ہیں جو آپ بیتی لکھنے کے لیے ضروری خیال کیے جاتے ہیں نظامی بدایونی نے ان خطوط کی مدد سے نکات غالب[1] کے عنوان سے ایک خود نوشت سوانح حیات مرتب کی ہے۔

مکاتیب غالب کے بعد شہرت کے اعتبار سے مولانا شبلی کے خطوط اہم ہیں جو "مکاتیب شبلی" اور "خطوط شبلی" کے عنوان سے شائع ہوئے "مکاتیب شبلی" میں وہ خطوط ہیں جو مولانا شبلی نے دوستوں احباب اور شاگردوں کو لکھے۔ یہ ایک عالم کے مکتوب ہیں لیکن ان میں کوئی خاص بات نہیں "خطوط شبلی" میں شبلی کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے کلکتے کی دو تعلیم یافتہ خواتین عطیہ فیضی اور زہرہ فیضی کے نام لکھے۔

مکاتیب شبلی کا مقدمہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے سید سلیمان ندوی. مولانا سے بہت انسیت اور قربت رکھتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مجموعہ تقریباً بے کیف ہے شاید ایک خط بھی ایسا نہیں جس میں شبلی کی ذات کی جھلکیاں مل سکیں ـــ اس کے مقابلے میں خطوط شبلی کے نام سے شائع ہونے والا دوسرا مجموعہ پر کیف اور رنگین ہے۔

مکاتیب شبلی کے مقدمے میں سید سلیمان ندوی نے (ایم مہدی حسن

---

[1] نکات غالب۔ مرتبہ نظامی بدایونی۔ نظامی پریس بدایوں سنہ ۱۹۲۰ء

افادی کی یہ رائے نقل کی ہے۔

"نج کی تحریروں میں چونکہ اہتمام کو دخل نہیں ہوتا یعنی اظہار خیال میں صنعت گری کی جگہ صرف آمد جذبات ہوتی ہے اس لیے لٹریچر کا یہ ایک ایسا اضطراری حصہ ہے جو کہ لکھنے والے کے مرتبۂ انشاپردازی کی صحیح غمازی کرتا ہے۔"

شبلی سید سلیمان ندوی کے استاد تھے اور موخرالذکر کی کوشش یہی تھی کہ استاد کا جو پیکر عوام کے سامنے آئے وہ ایک عالم دین اور ثقہ بزرگ کا ہو اسی لیے مکاتیب شبلی میں ایک بھی خط ایسا نہ ملے گا جس میں مولانا کی طبیعت کا اشارتاً بھی اظہار ہو سید سلیمان ندوی کا خط مورخہ ۸ مارچ ۱۹۴۳ء بنام مولوی عبدالرزاق صاحب اس سلسلے میں کافی دلچسپ اور اہم ہے۔

"یادِ ایام کی اصل کا پیاں واپس مرسل ہیں۔ میں دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ آپ نے مولانا شبلی کے حال میں غایت بے تکلفی سے بعض ایسے واقعات نقل کیے ہیں جو احباب کے لیے اور وہ بھی آغاز شباب کے لیے ہوتے ہیں۔ دورِ جوانی افتد۔ چنانچہ دانی مگر اب جو وہ آخر عمر میں ایک مقدس کام کے بانی ہوئے اس کا تذکرہ کرنا اور لکھنا بالکل نامناسب ہے۔ گناہ کا ستر چاہیے نہ کہ اس کی تشہیر۔ اس لیے ازراہِ عنایت بلکہ اس دوستی کے واسطے سے جو آپ کو مولانا مرحوم سے تھی یہ عرض کرتا ہوں کہ ان حالات پر پردہ ڈالیے تاکہ ان کے نیک نام ضائع نہ ہوں اور یوں

بھی عیب و گناہ کا برملا اظہار اور فخر مسلمان کے لیے زیبا نہیں
آپ کا یہ فرمانا کہ عطیہ فیضی صاحبہ کی علمی قدردانی نے
مولانا کی فارسی شاعری میں نئی روح پھونک دی بالکل
غلط واقعہ ہے۔ غزلوں کا آغاز ۱۹۰۵ء سے ہوا ہے اور خطوط
وملاقات کا سلسلہ ۱۹۰۸ء سے ہے۔" ۵۱
شبلی کسی پر عاشق تھے یا نہ تھے مگر یہ تسلیم ہے کہ ان کے وہ مکتوبات
جو خطوط شبلی میں ہیں عاشقانہ خط ہیں اور قدرے جذباتی بھی ہیں
ان کے لہجے اور شخصیت کے رس نے ان خطوں کو بڑا رسیلا بنا دیا ہے
"مولوی مشیر حسن نے تمہارے ارادۂ سفر کی خوش خبری سنائی
لیکن یاد رہے کہ تم بمبئی میں سیر کر رہی ہو تو کہیں اور ٹھہرو گی تو میں لکھنؤ
سے نکل جاؤں گا۔" ۵۲
"عطیہ بار بار جی چاہتا ہے کہ تم کوئی چیز طلب کرو اور میں
یہاں سے بھیجوں کیا لکھنؤ میں کوئی چیز تمہارے قابل نہیں
ہے؟" ۵۳
ایک خط کے آخر میں شبلی اپنا نام اس طرح لکھتے ہیں۔
"میں وہی شبلی نعمانی ہوں ۔۔۔" ۵۴
ان خطوں میں ایک بے ریا شخصیت جھانک رہی ہے وہ شخصیت

---

۵۱ نقوش۔ خطوط نمبر صفحہ ۵۱۳
۵۲ خطوط شبلی۔ صفحہ ۵۷
۵۳ خطوط شبلی۔ صفحہ ۴۲ (مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور)
۵۴ خطوط شبلی۔ صفحہ ۱۸ (مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور)

جو شائد سیرت نبوی۔ موازنہ انیس و دبیر۔ الفاروق اور بہت سی دوسری عظیم تحریروں میں گم ہو جاتی ہے شبلی فرشتہ نہ تھے انسان تھے ان کی رومانیت شخصیت کا ننگ نہیں جوہر ہے ان کے کردار کی عظمت ان کے انسان ہونے میں ہے انسان کی بشری کمزوریاں ہی اسے قابل تقلید بناتی ہیں مرمریں مجسموں کی کوئی تقلید نہیں کرتا۔

اردو خطوط نگاری میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی ایک خاص مقام رکھتے ہیں مولانا اپنی انانیت کے لیے مشہور ہیں۔ ان کو اپنی علمی قابلیت کا شدت سے احساس تھا۔ لیکن انانیتی ادب کی قسم اول یعنی آپ بیتی کے قسم کی کوئی چیز انھوں نے نہیں چھوڑی یا تو وہ خود کو اپنی ذات کے اظہار سے بہت بلند و بالا تصور کرتے تھے۔ یا سیاست نے فرصت ہی نہ دی۔ کیونکہ اظہار ذات ایسی چیز نہیں جس کی طرف آزاد بالکل غافل ہوں۔ انانیتی ادب کی اصطلاح کا شائد پہلی بار استعمال غبار خاطر میں ہوا۔ غبار خاطر میں اس کی تشریح انھوں نے ان الفاظ میں کی ہے۔

"انانیتی ادب سے مقصود تمام اس طرح کی خامہ فرسائیاں ہیں جن میں ایک مصنف کا ایغو (Ego) یعنی "میں" نمایاں طور پر سر اٹھاتا ہے مثلاً خود نوشتہ سوانح حیات۔ ذاتی واردات مشاہدات و تجارب شخصی اسلوب اور فکر و نظر" [۵]

"اس انانیت کا یہ شعور کچھ اس صورت کا واقع ہوا ہے کہ ہمارا انفرادی انانیت اپنے اندرونی آئینہ میں جو عکس ڈالتی ہے بیرونی

---

[۵] غبار خاطر صفحہ ۲۳۲

آئینے میں اس کا الٹا عکس دکھائی دیتا ہے اندر کے آئینے میں
ایک بڑا وجود دکھائی دیتا ہے باہر کے آئینوں میں چھوٹی سے
چھوٹی شکل ابھرنے لگتی ہے۔ یہی صورت حال ہے جہاں سے
مصنف کی جو خود اپنی نسبت کچھ کہنا چاہتا ہے ساری شکلیں
ابھرنا شروع ہوتی ہیں ــــ وہ خود جبکہ اپنے عکس کو جو اس
کے اندرونی آئینے پر پڑ رہا ہے جھٹلا نہیں سکتا۔ تو اچانک
دیکھتا ہے کہ باہر کے تمام آئینے اسے جھٹلا رہے ہیں جو "میں
آپ کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے وہی دوسروں کی نظر میں
بالکل غیر اہم ثابت ہو رہی ہے ــ" [1]

غبار خاطر آزاد کے خطوط کا مجموعہ تو ہے ہی اس میں ادب، انشا
علم اور بلندی ضروری ہے۔ لیکن وہ اس قبیل کے خط نہیں ہیں جیسے
مرزا غالب اپنے دوستوں کو لکھا کرتے تھے ــ آزاد نے یہ خط جیل
میں لکھے اور وہ مکتوب الیہ تک نہ پہونچ سکے اور ان کو ملے بھی تو
کتابی شکل میں۔

پرانے زمانے میں مکتوب کے سلسلے میں عام طور پر لوگوں کو یہ خیال
نہیں ہوتا تھا کہ ان کی اشاعت ہوگی جب تک یہ خیال نہ ہو اسی
وقت تک خطوط، ذات کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں لیکن جہاں یہ معلوم
ہوا کہ اب اشاعت کی نوبت آئے گی وہیں آمد کے بجائے آورد کا احتمال
پیدا ہو جاتا ہے اور آمد والی معصومیت اور بے ساختگی ختم ہو جاتی ہے،
یہ بات بہرحال تسلیم کرنا ہوگی کہ خود نوشت سوانح عمری کے ساتھ

---

[1] غبار خاطر۔ صفحہ ۱۱۱

ساتھ اگر کسی کے خطوط بھی ملتے ہیں تو مقابلہ خاصہ دلچسپ ہوگا اس سلسلے میں ایک مثال کا اظہار بے محل نہ ہوگا۔

سرسید رضا علی کو اپنی زباں دانی پر جو ناز تھا اس کا اظہار اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنی سرگزشت "اعمال نامہ" پر ایک غیر زبان داں کے ریویو سے بپھر کر لکھا تھا۔ رضا علی نے اپنی آپ بیتی میں بڑی سنجیدگی کا ثبوت دیا ہے لیکن اس خط میں وہ سنجیدہ شخصیت کہیں نظر نہیں آتی ہے۔

سرسید رضا علی نے سید الطاف بریلوی کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۹ر جولائی سنہ ۱۹۴۴ء میں اس ریویو پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی ہے۔ جو ان کی آپ بیتی "اعمال نامہ" پر رسالہ "مصنف" میں شائع ہوا تھا رضا علی کا خاص گلہ یہ ہے کہ ریویو کرنے والا زبان سے خاص واقفیت نہیں رکھتا۔

"حیدرآباد اور پنجاب والے اردو کی جو خدمت کر رہے ہیں اس سے انکار کرنے والا کافر"
لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں:۔

"ہائے ہندوستان کی علمی اور ادبی ناداری ٹھیٹ ہندوستانی کی لکھی ہوئی کتاب مرادآباد سے دہلی ٹھیک سو میل اور لکھنؤ پورے دو سو میل اور اس پر تبصرہ کریں حیدرآباد دکن کے ایک اخبار کے نائب مدیر۔"

اعمال نامہ کے پہلے حصہ میں ہی رضا علی نے بتا دیا تھا کہ دوسرا حصہ تکمیل کے قریب ہے اس خط سے اس کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔

"ـــ اگر کتاب کا دوسرا حصہ میں نے ریویو کے لیے آپ کے
پاس بھیجا تو اس کی یہ شرط ہو گی کہ ریویو۔ پشاور چیگام یا پورٹ
بلیئر کے کسی صاحب سے نہ لکھا یا جائے ـــ"
خطوط نگاری کے ضمن میں مشہور شاعر فیض احمد فیض کا تذکرہ کرنا
اس لیے ضروری ہوگا کہ فیض احمد فیض اپنی ذاتی زندگی میں بے حد
شرمیلے اور منکسر مزاج انسان واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ مدیر نقوش
محمد طفیل صاحب کی آپ بیتی کی فرمائش کے جواب میں لکھتے ہیں

"مجھے دوستوں کی خوشنودیٔ خاطر کا بہت پاس ہے لیکن بدقسمتی
سے آپ نے ایسی فرمائش کی ہے جس کی تعمیل نہ ہو سکے گی۔
اسے خودی کی پستی سمجھئے یا کچھ اور لیکن مجھ سے اپنے بارے
میں لکھا نہیں جاتا میں تو شعر میں بھی حتی الامکان واحد
متکلم کا صیغہ نہیں استعمال کرتا ہوں یہ کوئی اصولی بات نہیں
بس اپنی طبع کا تقاضہ ہے ـــ" [۵۱]

مگر یہ خطوط کی ہی کرشمہ سازی ہے کہ تمام پردے اپنے آپ چپکے
چپکے اٹھتے جاتے ہیں۔ اپنے خطوط کے مجموعہ "صلیبیں میرے دریچے میں"
اپنی بیوی ایلس کے نام ایک خط میں وہ اپنے بھائی کی موت کا
تذکرہ اس طرح کرتے ہیں کہ سوز و غم ہی نہیں اس سے متاثر شخصیت
کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے (فیض کے بڑے بھائی طفیل احمد کا
جب وہ حیدر آباد جیل میں فیض سے ملاقات کرنے آئے تھے
نماز پڑھتے میں انتقال ہو گیا تھا۔)

---

[۵۱] نقوش آپ بیتی نمبر صفحہ ۲۷

"آج صبح میرے بھائی کی جگہ موت میری ملاقات کو آئی سب لوگ بہت مہربانی سے پیش آئے۔ یہ لوگ میری زندگی کی عزیز ترین متاع مجھے دکھانے لائے وہ متاع جو اب خاک ہو چکی ہے پھر اپنے ساتھ لے گئے ـــــ میں نے اپنے غم کے غرور میں سر کو اونچا رکھا اور کسی کے سامنے نظر نہیں جھکائی یہ کتنا مشکل اور اذیت ناک تھا میرا دل ہی جانتا ہے۔ اب میں اس کوٹھری میں اپنے غم کے ساتھ تنہا ہوں اب مجھے سر اونچا رکھنے کی ضرورت نہیں یہاں اس غم کے لیے بے پناہ ظلم سے ہار مان لینے میں کوئی تذلیل نہیں ہے۔ میں اس کے بیوی بچوں اور اپنی اماں کے خیال کو دل سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں ـــ" [1]

ان خطوط میں فیض کی زندگی کے اس ذاتی اور نجی پہلو پہ روشنی پڑتی ہے جو اور کہیں ممکن نہ تھی ـــ

"کل عید کا دن تھا جب صبح میں کپڑے بدل رہا تھا تو بہت سی پرانی باتیں اور بھولے بسرے خواب و خیال اپنی کمین گاہوں سے نکلے اور میں نے دیکھا عیدگاہ میں گھنے پیڑوں تلے میرے ابا خطبہ دے رہے ہیں اور میں نے دیکھا کہ اگلی صف میں میں اور طفیل مخمل کا کوٹ پہنے بیٹھے ہیں اور پھر نماز کے بعد ہماری فٹن عیدگاہ سے چلی گھوڑوں کی گردن میں بندھی

---

[1] صلیبیں میرے دریچے میں۔ از فیض احمد فیض صفحہ ۱۰۱ و ۱۰۲
اعتقاد پبلشنگ ہاؤس۔ نئی دہلی۔ ۱۹۷۵ء بار اول

ہوئی گھنٹیاں بج رہی ہیں پھر وہ گھڑی یاد آئی کہ ہم زنان خانے
کے صحن میں داخل ہوئے جو بہت سی عورتوں سے کھچا کھچ
بھرا ہے۔ میری سگی بہنیں ہیں ان کے بچے ہیں اپنے گاؤں کی
غریب مہمان عورتیں ہیں ـــــ ہماری دادی راستہ ٹٹولتی
ہوئی اپنے کمرے سے نکلتی ہیں اور ہمارے اباماں کی دعا کے
لیے اپنا بارعب سر جھکا دیتے ہیں۔ وہ ان کے سر پہ ہاتھ پھیرتی
ہیں۔ ابا مردانے میں چلے جاتے ہیں سکوت ٹوٹ جاتا ہے
سب لوگ شور و غل ہنسی مذاق سے آسمان سر پہ اٹھا لیتے ہیں
سب مجنیں سارے غم سب خوشیاں یاد آئیں اور دل نے چاہا
سب کو گلے لگا کر آہ و زاری کرے لیکن آہ و زاری شروع
ہونے سے پہلے ہی میں نے ان کو رخصت کر دیا ـــــ "[1]

"اردو میں سوانح نگاری" کے مصنف احمد شاہ علی نے خطوط
کی افادیت کے سلسلے میں A hand book of English biography
by Edward and cole. سے یہ قول نقل کیا ہے۔

"سیراٹ وہ پہلا شخص ہے جس نے خطوط کی اشاعت اور خطوط
کی روشنی میں سوانحی خاکہ تیار کرنے کی مخالفت کی ہے کیونکہ
اس کا خیال ہے کہ ان خطوط میں انسانی روح بے لباس
نظر آتی ہے۔ اور اس غفلت کے عالم میں وہ کمرے میں ایک
دو کے دیکھنے کی چیز ہو تو ہو ـــــ لیکن باہر گلی کوچوں میں
پھرنے کے لائق ہرگز نہیں ـــــ لیکن اسی سلسلے میں ڈرائیڈن

---

[1] صلیبیں میرے دریچے میں ـــــ صفحہ ۱۵۸ از فیض احمد فیض

کا قول ہے کہ ہیرو اسی عالم میں دیدنی ہے۔ آپ ہیرو کو اس کی رہائش گاہ میں دیکھئے اس کی بے لباسی۔ اس کے پوشیدہ ترین اعمال و افعال میں اور پھر زندگی کی طمطراق سے عاری آپ اس عزیب اور معقول جانور کو ایسا ہی دیکھتے ہیں جیسا کہ قدرت نے اسے بنایا ہوتا ہے اس کے جذبات اور حماقتوں سے آشنا ہوتے ہیں اور اس دیوزاد کو انسان بناتے ہیں ــــــ" لہ

خطوط نگاری کا فن انسانی تہذیب کے ارتقا کا فن ہے ایک اچھا خط جس جذبے سے ابھرتا ہے وہ ایک انسانی جذبہ ہے اسی لیے جب خط کا نام آتا ہے تو ایک پر اسرار قسم کا تجسس طبیعت میں پیدا ہوتا ہے جو عام تحریروں میں نہیں ہوتا ہے کیونکہ ایک تو خطوط بالکل ہی ذاتی قسم کی چیزیں وہ پیغام جو کسی اور کے لیے تھا مگر اتفاقی طور پر ہم کو اس سے آشنا ہونے کا موقع مل گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ دوسروں کے خطوط پڑھ کر ایک حد تک انسان اپنے تجربات کا ہی اعادہ کرتا ہے۔ انسانی مزاج کے رنگا رنگ تاثرات کی عجوبہ کاری سے ایک خیال انگیز مسرت ہوتی ہے اسی لیے ان تحریروں میں جو اپنے اندر خود نوشت سوانح حیات کی طرح لکھنے والے کی ذات سے قربت رکھتی ہوں خطوط نگاری بہت اہم ہے۔

لہ صفحہ ۲۳

سفرنامہ

لائبریری سائنس کے اصول اور ضابطے کے بموجب سفرنامے جغرافیہ کے ساتھ جگہ پاتے ہیں۔ گویا ادب پارے ہونا تو کجا ان کی گنتی تخلیقی اضافے میں ہی نہیں ہوتی ہے اس کی بھی علت ہے کہ پرانے زمانے میں بیرونی سفر کا چونکہ رواج کم تھا اس لیے واپس آنے والوں میں سے بھی گنتی کے چند لوگ اپنے سفر کے جو حالات قلم بند کرتے تھے ان کی حیثیت محض جغرافیائی البم کی سی ہوتی تھی لیکن زمانہ کہیں سے کہیں آ پہونچا ہے اور اس ذیل میں نئی نئی موشگافیاں ہو رہی ہیں اور نئے نئے گوشے سامنے آرہے ہیں یہاں اس بحث میں پڑنے کا موقع نہیں ہے کہ سافر اور سیلح کے سفرنامے اور سیاحت نامے کے فرق کی باریکیاں کیا ہیں؟

سفرنامہ ایک تسلیم شدہ اصطلاح ہے اور ہماری توجہ صرف اس

پہلو پر مرکوز ہے کہ سفرنامے اور آپ بیتی کے ڈانڈے کیا کہیں ملتے ہیں مل سکتے ہیں یا ملائے جا سکتے ہیں۔ اس کا بہت کچھ انحصار مسافر یا سیاح کی مزاجی کیفیت سرشت و جبلت اس کے انداز مشاہدہ اور طرز تحریر اسی قبیل کی باتوں پر ہوگا۔ عازم سفر کے لیے یہ دلاسہ ہوتا ہے کہ باہر تو نکلو مسافر نواز بہتیرے ملیں گے اور ہزاروں شجر سایہ دار راہ میں منتظر ہوں گے۔ کچھ لوگوں کا سفر کسی مجبوری۔ کسی ضرورت یا کسی سرکاری و غیر سرکاری فرض و مقصد کی ادائیگی کے لیے ہوتا ہے۔ کچھ محض آوارہ گردی کی لذت کے لیے جہانیاں جہاں گشت بن جاتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے حالات سفر لکھنے کا پابند نہیں ــــ بہرحال جو لکھتے ہیں ان کی تحریر کو اس رخ سے دیکھنا ہوگا کہ وہ دیار غیر کی عمارتوں۔ مقامات اور دیگر خصوصیات کا ذکر سپاٹ انداز میں کر کے وہی معلومات فراہم کر دیتے ہیں جو "رہنمائے سیاحت" کی طرح کے کتابچوں میں ہوتی ہیں یا اپنے کردار کو بھی ابھار کر نمایاں کرنے کے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں وارداتِ قلبی و ذہنی کی بھی کچھ پھلجھڑیاں چھوٹتی ہیں یا نہیں؟

ابن بطوطہ آٹھویں صدی ہجری کا مشہور سیاح گزرا ہے اس نے کم و بیش ربع صدی مشرق مغرب کی سیاحت میں بسر کی اس نے جو دلچسپ اور دلآویز سفرنامہ "تحفۃ النظار" کے نام سے لکھا تھا اس کا خلاصہ اردو میں شائع ہو چکا ہے ــــ مسلمانوں میں بہت سے سیاح ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اپنے سفرنامہ کا آغاز حج اور

زیارت کی غرض سے کیا۔ ابن بطوطہ بھی اپنی دیگر دلچسپیوں کے علاوہ اس قسم کا سفر کرنے والوں میں شامل تھا۔ فریضۂ حج سے واپس آنے والے بہت سے لوگوں نے اپنی توجہ ارضِ حرم کے حالات بیان کرنے پر مرکوز کی لیکن ایسے حاجی بھی ہوئے جنھوں نے دوسروں ملکوں کا سفر اس کے علاوہ کیا اور اس کی روداد لکھی۔ اردو میں حاجیوں کے سفرنامے ان گنت ہیں۔ ان میں اچھا۔ اوسط اور معمولی قسم کا ہر انداز تحریر ملے گا۔ لیکن جو چیز خالصتہً یا بنیادی طور پر مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہو وہ ادب میں بہ مشکل بار پاتی ہے اگر لکھنے والا ادیب ہے مثلاً شبلی اور عبدالماجد دریابادی تو وہ اپنے حج نامے میں انشاپردازی کے موتی بکھیرتا ہے۔

اس بحث میں انشاپردازی سے زیادہ آپ بیتی کے عناصر کی جستجو ہے۔ حجاج کے سفرناموں کی اہمیت بہرکیف رہے گی کہ وہ ان میں اپنے دل اور اپنی ذات کے حالات مذہبی رنگ میں گھول کر بیان کرتے ہیں۔

سفرنامے پر مبنی بعض آپ بیتیاں آپس میں گڈمڈ ہوجاتی ہیں اسی قسم کی ایک مثال ظفر حسن ایبک کی خودنوشت ہے یہ مہم جوئی طویل سفر اور واقعات وحادثات کی داستان ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے تو ملک کے باہر جانے والوں کی تعداد برابر بڑھتی جارہی ہے تاہم اس سے پہلے سفر و سیاحت کرنے والوں کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنی اور ان کے سفرنامے بڑی توجہ سے پڑھے جاتے تھے۔

یوسف خاں کمبل پوش کا سفرنامہ "عجائبات فرنگ" سوا سال کی سیاحت کے ۹ سال بعد ۱۸۴۷ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ یوسف خاں کمبل پوش کے سفرنامے عجائبات فرنگ کو اس لحاظ سے اردو کا اولین سفرنامہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۴۷ء سے پہلے سفرنامہ قسم کی کوئی تحریر دستیاب نہیں ہوتی ہے۔ یوسف خاں کمبل پوش کا سفرنامہ مولانا جعفر تھانیسری کی تصنیف کالا پانی۔ محمد حسین آزاد کی "سیر ایران" اور سرسید احمد خاں کی مسافران لندن سے کئی اعتبار سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

کالا پانی میں جعفر تھانیسری کے حالات زندگی زیادہ ہیں اور حالات سفر کم ہیں آزاد اور سرسید نے اپنے سفرناموں کو مرتب بھی نہیں کیا اور ان کے اجزا، ان کی زندگی میں پریشان ہی رہے جنھیں وفات کے بعد ان کے اقربا، اور دوستوں نے جمع کیا اور انھیں سفرناموں کی صورت دے دی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جعفر تھانیسری۔ محمد حسین آزاد، سرسید احمد خاں تینوں کے سفر مخصوص مقاصد کے لیے تھے۔ سیاح کی غیر جانبدار نظر

لہ یوسف خاں کمبل پوش نے ۳۰ مارچ ۱۸۳۷ء کو سفر کا آغاز کیا اور ۲۵ جولائی ۱۸۳۸ء کو واپس کلکتے پہونچے۔ اس سفرنامے کا دوسرا ایڈیشن ستمبر ۱۸۷۳ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے طبع ہوا۔

(ماہنامہ اوراق۔ لاہور ۱۹۷۸ء صفحہ ۲۶ چوک بازار لاہور)

ان لوگوں کے سفرناموں میں نہ کھل سکی ان پر اصلاحی جذبہ اس قدر طاری ہوا کہ قاری کو اپنے مشاہدے کی لطیف کیفیات میں شامل کرنے کے بجائے احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے۔

اس کے برعکس یوسف خاں زندگی پر ایک آزادہ فکر سیاح کی نظر ڈالتا ہے اور اسے اپنی آنکھوں اور حافظے میں سمیٹ لینا چاہتا ہے تاکہ اپنی مسرت میں دوسروں کو شریک کر سکے۔

اردو ادب کے ابتدائی سفرناموں پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جب قاری داستان کے فوق الفطرت ماحول اور محیر القول کرداروں میں دلچسپی لے رہا تھا تو یوسف خاں کمبل پوش نے اپنے دلچسپ سفرنامے سے اہل ادب کی توجہ حقیقی مشاہدے کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی یوسف خاں نے حقیقی سفر کو اس دلچسپ انداز میں پیش کیا کہ قاری کو اس کے سفرناموں میں داستانوں جیسی حیرت جاگتی ہوئی نظر آئی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کا یہ ابتدائی سفر آج بھی تاریخی اعتبار سے زندہ ہے۔

سرسید احمد۔ شبلی نعمانی۔ محمد حسین آزاد۔ مولوی مسیح الدین علوی میرزا نثار علی بیگ۔ مولانا جعفر تھانیسری محمد حامد علی خاں وغیرہ نے سفرنامے لکھ کر اردو میں سفرنامے کی روایت کو مضبوط کیا۔

بیسویں صدی میں جب سفر کی سہولتیں میسر آنے لگیں تو نہ صرف سفر کرنے والوں میں اضافہ ہوا بلکہ حالات سفر بیان کرنے میں بھی نسبتاً دلچسپی لی جانے لگی چنانچہ منشی محبوب عالم کا سفرنامہ یورپ۔ شیخ عبدالقادر کا سفرنامہ مقام خلافت۔ خواجہ حسن نظامی

کا سفرنامہ سفرنامہ مصر و فلسطین ۔ شاہ بانو کا سیاحت سلطانی ۔ فتح علی قزلباش کا سیاحت فتح خوانی ۔ قاضی عبدالغفار کا نقش فرنگ ۔ قاضی ولی محمد کا سفرنامہ اندلس' اور ابوظفر ندوی کا سفرنامہ برما وغیرہ منظر عام پر آئے ان سفرناموں میں دنیا کی مختلف اکناف کا ہی احاطہ نہیں کیا گیا بلکہ ہر سفرنامہ اپنے مصنف کی پسند ناپسند کے ذریعہ اس کی ذات کی تصویر کشی بھی کرتا ہے۔ چنانچہ منشی محبوب عالم عجائبات یورپ کو ایک صحافی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ محمد علی قصوری نے یورپ کا سفر ایک سیاسی ضرورت کے تحت کیا تھا اس لیے ان کے سفرنامے پر تاریخ غالب ہے۔ بیگم حسرت موہانی کا سفرنامہ عراق ممالک اسلامیہ پر عقیدت و احترام کی نظر ڈالتا ہے جبکہ شاہ بانو کے سفرنامے سیاحت سلطانی میں ماحول پابند فضا میں اسیر نظر آتا ہے۔ چنانچہ وہ منظر جو یوسف خاں کمبل پوش پر مسرت کی کیفیت طاری کر دیتا ہے جب پردہ پوش شاہ بانو کی نگہ کے سامنے آتا ہی تو گھٹن اور جبر کا احساس طاری کر دیتا ہے۔ ان سفرناموں کو اگر غور سے پڑھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں سفرنامہ صرف مشاہدات اور واقعات کا بیان نہیں بلکہ سفرنامہ نگار کے ذاتی رجحانات کا آئینہ بھی ہوتا ہے۔

جدید سفرناموں میں محمود نظامی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ محمود نظامی نے سفر کو وسیلۂ ظفر بنانے کے بجائے اپنے داخل سے ہم آہنگ کر کے دیکھے ہوئے مناظر کو دوبارہ اپنی روح کے مرغزاروں سے دریافت کیا ــــــ آغا محمد اشرف نے لندن سے آداب عرض میں

تہذیب کی وسعتوں میں سفر کیا۔ اختر ریاض الدین نے دھنک پر قدم اور سات سمندر پار میں منظر کو تخلیقی نظر سے دیکھا۔

علمی نوعیت کے دو سفر نامے ساحل اور سمندر از سید احتشام حسین اور ارض پاک سے دیار فرنگ تک از ڈاکٹر عبادت بریلوی شائع ہوئے لیکن ان دونوں سفر ناموں کی تاثیر اور کیفیت الگ الگ ہیں — سید احتشام حسین اپنے سفر نامے میں ایک فطری سیاح بن کر نہیں ابھر پاتے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب لندن کی تہذیبی سماجی زندگی کا بھرپور نقشہ کھینچتے ہیں۔ یہ صرف ایک بیانیہ تحریر ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں زندگی کا حسن بھی موجود ہے۔

نسبتاً نوجوان ادیبوں میں مستنصر حسین تارڑ کو یہ اہمیت حاصل ہو کہ انھوں نے سفرنامے پر اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کی ہیں — مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں "نکلے تیری تلاش میں" اور اندلس میں اجنبی" کا شمار اردو کے کامیاب سفرناموں میں ہوتا ہے۔

اردو سفرنامے میں مزاح کو شامل کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ابن انشا کا تذکرہ اس لیے ضروری ہے۔ کہ اگرچہ اخباری ضرورتوں کے لیے کیے گئے سفر میں سفرنامہ مقصود بالذات نہیں ہے لیکن ابن انشا نے اپنے شگفتہ انداز بیان سے سفر کے بیانیہ میں مسکراہٹوں کو دریافت کیا۔

سفرنامے کی صنف کو زمانہ حال میں جو فروغ حاصل ہوا ہے وہ شائد اس سے قبل کبھی نہیں ہوا اس ضمن میں قدرت اللہ شہاب کا اے نبی اسرائیل۔ سید ابو الحسن علی ندوی کا دو ہفتے ترکی میں۔

فضل الحق شیدا کا نیا چین۔ جمیل صبا کا سفر ہے شرط۔ عزیز بیگ کا یہ امریکہ ہے۔ شریف فاروق کا اتاترک کے وطن میں۔ سفرنامے کو نہ صرف ایک سنجیدہ ادبی تحریر کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں بلکہ سفر کی غربت میں یہ سفرنامے ایک ساتھی کا حق ادا کر کے اظہار ذات کے نئے نئے مواقع فراہم کرتے ہیں۔

اردو سفرناموں میں رام لعل کے سفرنامے۔ خواب۔ خواب سفر اور زرد پتوں کی بہار۔ بے کراں فاصلوں پر محیط ہیں۔ رام لعل نے ان سفرناموں میں ان فاصلوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ رام لعل کا پاکستان کا سفر کئی اعتبار سے ایک جذباتی سفر تھا۔ اس سفرنامے میں جا بجا مصنف کی ذات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

سفرنامے کی کئی جہتیں ہیں۔ ذہنی سفر۔ مشاہداتی سفر اور مادی سفر۔ موجودہ سفرنامہ نگار اپنی سفری سرگرمیوں کو فقط مادی سفر تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اس مادی سفر میں اس کا اپنا ذہن بھی سفر کر کے باطنی احوال اور کیفیات کے گوناگوں مرحلوں سے گزرتا رہتا ہے۔

"ماضی کا سیاح واقعات کو ضبط تحریر میں لاتے وقت اپنی ذات کو خارج کر دیتا ہے یوں وہ شہروں اور واقعات کا ایک غیر جذباتی بیان بن جاتا تھا۔ جبکہ آج کا سیاحت نگار آغاز ہی اپنی "میں" سے کرتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ اپنی نرگسیت کے پاسپورٹ پر سفر کرتا ہے۔ نرگسیت مشکوک سہی لیکن تخلیق کے لیے بہ حیثیت نفسی محرک اس کی اہمیت کم نہیں

کی جا سکتی ہے اس لیے آج کا سیاح جب قلم اٹھاتا ہے تو وہ محض
ایک ٹورسٹ گائیڈ ثابت نہیں ہوتا بلکہ تخلیقی فن کار کی
مانند واقعات، افراد پر جذبات و احساسات اور حیات کے
زاویے سے روشنی ڈالتا ہے اور ایک ماہر فن کی مانند
ایڈیٹنگ کرتے ہوئے حسب منشاء کمی اور بیشی سے کام
لیتا ہے ۔" ۵۱

" سفر نامہ نگار ایک ایک لمحے کی کیفیات کو اپنے قلب کی
گہرائیوں میں اتارنے میں منہمک رہتا ہے۔ سفر نامے میں
لمحوں کے ساتھ ساتھ جو قلبی کیفیات متغیر ہوتی رہتی ہیں اسکا
تدریجی ارتقاء ملتا ہے ۔۔۔" ۵۲

ایک سفر نامہ چونکہ مشاہدات اور تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے اسی
لیے سفر نامے کا شمار ذاتی بیان، بے ساختگی اور خلوص کی وجہ سے
کسی حد تک آپ بیتی کے ساتھ ہو سکتا ہے ۔

---

۵۱ مرزا ادیب۔ سفر نامہ کیا ہے؟ صفحہ ۲۰
ماہنامہ اوراق لاہور۔ جنوری۔ فروری ۱۹۷۸ء

۵۲ عطا الحق قاسمی۔ سفر نامہ کیا ہے؟ جنوری۔ فروری ۱۹۷۸ء صفحہ ۲۴
ماہنامہ اوراق۔ لاہور

رپورتاژ

ہندوستان نے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے وسط سے ترقی پسند تحریک کو ابھرتے دیکھا۔ تحریکوں اور کانفرنسوں کے زمانے میں اخباری رپورٹوں کو سپاٹ اور غیر دلچسپ تصور کر کے رپورتاژ کا وسیلہ اختیار کیا گیا۔ انداز افسانے کا مگر واقعات حقیقی ہوتے۔ اسے آپ بیتی سے ملتا جلتا مگر جگ بیتی کا ایک جز دکھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ آپ بیتی کا ذاتی عنصر اس میں کم ہوتا ہے۔ تجزیہ کے بنیادی مقصد کے آگے لکھنے والا اپنی شخصیت کو ابھرنے نہیں دیتا ہے۔

ترقی پسند یا نیم ترقی پسندوں کے یا ان لوگوں کے جو رجعت پسند کسی طرح بھی نہیں کہے جا سکتے جو رپورتاژ بہت اہم ہیں ان میں چند اہم نام درج ذیل ہیں۔

کرشن چندر: "پودے"۔ سجاد ظہیر: "یادیں"۔ رضیہ سجاد ظہیر: اس کا کارواں۔ عصمت چغتائی: بمبئی سے بھوپال تک۔ قرۃ العین حیدر: ستمبر کا چاند۔ پرکاش پنڈت: کہت کبیر سنو بھئی سادھو۔ عادل رشید: خزاں کے پھول۔ نکر توبنسوی: چھٹا دریا۔ تاجور سامری: اور خدا دیکھتا رہا۔ زہرہ جمال: ۵ دسمبر کی رات۔ قدرت اللہ شہاب: یا خدا

رپورتاژ بیک وقت کئی چیزوں کا مرکب ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب اس میں "ادبیت، صحافت اور افسانویت کا امتزاج" ہے۔ لیکن رپورتاژ نگار کو یہ آزادی بہرحال ہوتی ہے کہ وہ واقعات کا بیان کرنے کے ساتھ ان جذبات کو بھی سمیٹ لے جن پر عام طور سے لوگوں کی نظر نہیں گئی ہے یا جن کو درخود اعتنا نہیں سمجھا گیا ہے واقعہ نگاری ہو یا افسانہ نویسی یا صحافت ان کو صرف "خود نوشت" تو کہا جا سکتا ہے لیکن آپ بیتی کے مفہوم کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ لکھنے والے کے مخصوص انداز تحریر کی چھاپ تو بہر حال رہتی ہے۔

متفرق تحریریں

یوں تو ہم انسان کی پوری زندگی کے ہر فعل کو اظہار ذات یا ترجمان شخصیت کہہ سکتے ہیں لیکن یہ وسیع موضوع آپ بیتی کے محدود دائرے سے باہر ہے آپ بیتی کی تعریف میں وہی مستقل تصانیف آتی ہیں جس میں مصنف نے اپنے قلم سے اپنے حالات زندگی لکھے ہوں۔ اکثر مصنفین نے اپنے صرف کچھ تجربات یا ہنگامی حالات یا کسی مخصوص صورت حال میں یا کسی دوسری شخصیت کے بارے میں لکھتے ہوئے اپنے کردار کی بابت بھی کچھ لکھا ہے ان تحریروں پر خود نوشت سوانح حیات کا پوری طرح تو اطلاق نہیں ہوتا ہے لیکن بہرکیف ان نگارشات سے مصنف کی زندگی اور مخصوص حالات کی جھلکیاں ضرور دیکھنے کو مل جاتی ہیں بعض نگارشات ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں مصنف اپنے

مشاہدے اور تجربات کا تذکرہ اس انداز میں کرتا ہے کہ آپ بیتی کے جلوے نظر آجاتے ہیں۔ یہ علی الاعلان لکھی ہوئی آپ بیتی نہیں ہوتی اور اس پر کوئی حتمی نوعیت کا لیبل بھی چسپاں نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اس میں خود نوشت کی جھلکیاں جزوی طور پر مل جاتی ہیں۔

ایک مکمل خود نوشت لکھنے والے کو بہت سی چیزوں کا پابند بنالیتی ہے۔ اسی لیے اردو میں ایسے لوگوں کی تعداد کم ہی جنھوں نے اس میدان میں اترنے کی ہمت کی ـــــ بہت سے لکھنے والے زندگی بھر کے حالات کو سمیٹ لینے کا تصور ہی نہیں کرتے یا اپنے اندر ہمت ہی نہیں پاتے پھر بھی زندگی کے بعض ادوار یا بعض منازل کے حالات پیش کرنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ اس قسم کی تحریریں خود نوشت کے سانچے میں تو ظاہر ہے کہ سما نہیں سکتی ہیں پھر بھی مصنف کے لیے شخصیت کے اظہار کا ایک وسیلہ ضرور ہو سکتی ہیں۔ ایسے ناول بھی لکھے گئے ہیں جن میں کسی کردار کی وساطت سے ناول نگار نے آپ بیتی بیان کر دی ـــــ اس میں حقیقت کے ساتھ افسانے کے امتزاج کی بڑی گنجائش رہتی ہے۔ اور گرفت بھی نہیں ہو سکتی۔

مثلاً مرزا محمد ہادی رسوا اپنے مشہور ناول "امراؤ جان ادا" میں صرف ایک داستان گو کی حیثیت سے ہی سامنے نہیں آتے بلکہ ان کی اہمیت اور وجود کا احساس ہر لفظ میں سمویا ہوا ہے لیکن "امراؤ جان ادا" کے علاوہ مرزا رسوا کی شخصیت کا عکس انکے

ناول "شریف زادہ" میں زیادہ بھرپور ملتا ہے۔ مرزا رسوا نے اپنی زندگی کے بیشتر واقعات اور مشاہدات کو ناول کی دلچسپیوں میں اتنی خوب صورتی سے ضم کر دیا ہے کہ کئی جگہ "شریف زادہ" پر مرزا رسوا کی آپ بیتی کا گمان ہوتا ہے۔

عصمت چغتائی کے مشہور ناول "ٹیڑھی لکیر" میں بڑے واضح انداز میں اس ماحول اور معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے جس میں عصمت کا بچپن اور لڑکپن گزرا — "ٹیڑھی لکیر" کو اگرچہ عصمت چغتائی کی آپ بیتی تو نہیں کہا جا سکتا — لیکن اس ناول کا پس منظر عصمت چغتائی کی آپ بیتی کا ہی ہے۔

خواجہ احمد عباس کے ناول "انقلاب" کا ہیرو نہ صرف خواجہ احمد عباس کی طرح دنیا کو دیکھتا اور سمجھتا ہے بلکہ اکثر جگہ وہی تجربات اسے بھی پیش آتے ہیں جو خواجہ احمد عباس کی زندگی میں گزرے ہیں

قرۃ العین حیدر نے آپ بیتی لکھنے سے ایک قسم کا گریز کیا ہے لیکن ان کے بعض ناول خود بخود ان کی گزری ہوئی زندگی کے سامنے آئینہ رکھ دیتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا ناول "میرے بھی صنم خانے" اس کا بین ثبوت ہے قرۃ العین حیدر کا سوانحی ناول "کار جہاں دراز ہے" ان کے وسیع مشاہدے اور یادداشت کا مظہر ہے۔ اگر آپ بیتی میں مصنف اپنی ذات پر بیتے ہوئے دنوں کو دہراتا ہے تو "کارِ جہاں دراز ہے" ایک کامیاب آپ بیتی ہے — اس سوانحی ناول میں صرف لفظی خاکے نہیں ہیں بلکہ قرۃ العین نے اپنے الفاظ میں گزرے ہوئے زمانے کے لباس۔ رسم و رواج۔

زبان۔ یہاں تک کہ ذائقے اور خوشبو کو دہرایا ہے۔ یہ تصنیف اس بات کا بھی ثبوت ہو کہ جب مصنف اپنے ذہن کے پردوں پر ماضی کو یاد کرتا ہے تو بیتے ہوئے شب و روز خود بخود صفحات پر اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ سمٹ آتے ہیں۔

مصنفہ اسے سوانحی ناول کہتی ہیں جہاں تک ان کرداروں کا سوال ہو جن کا ناول نگار کے تہذیبی نشو و نما میں نمایاں حصہ رہا ہے وہ کسی نہ کسی پہلو سے اس ناول میں ابھرتے ہیں۔

یہ ناول ایک خود نوشت سوانح حیات کے علاوہ مصنفہ کے خاندان کی تاریخ بھی ہے۔ کیونکہ یہ کہانی بارہویں صدی سے شروع ہو کر ہمارے زمانے تک رہتی ہے۔ اس کے ضمن میں سماجی پیچیدگیوں کے ساتھ ساتھ مصنفہ کی خود اپنی ذات اور اس کے انسانی روابط بھی سامنے آتے ہیں۔

مندرجہ بالا تحریریں اس ضمن میں آتی ہیں جب نادانستہ طور پر شخصیت کا پرتو مصنف کے قلم پر پڑنے لگتا ہو وہ بظاہر تو حقیقت نگاری سے گریز کرتا ہے مگر لاشعوری طور پر دلی کیفیات کا اظہار کر جاتا ہے۔

مندرجہ بالا تحریروں سے قطع نظر کچھ تحریریں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اگرچہ آپ بیتی نہیں کہی جاسکتی ہیں لیکن لکھی آپ بیتی کے ہی طرز پر جاتی ہیں۔ اس میں زندگی کے اس مخصوص دور کی عکاسی ہوتی ہے جس میں مصنف نے کوئی کارنامہ یا خدمت انجام دی ہو جو اس کی زندگی میں قابل اظہار اہمیت رکھتا ہو۔

"دربار دُربار" کے مصنف صدق جائسی ایک طویل عرصے تک نظام حیدرآباد کے دربار سے وابستہ رہے۔ دربار نظام کی رنگین مجالس اور ثقافتی گہما گہمیوں کا صدق جائسی کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس تصنیف میں صدق جائسی نے دربار کے چشم دید حیرت انگیز واقعات بڑے خوب صورت انداز میں بیان کئے ہیں اردو نثر میں بیانیہ طرز تحریر کا یہ ایک نادر نمونہ ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اپنی طالب علمی کی یادوں کو "آشفتہ بیانی میری" کے عنوان سے سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ یادیں ہیں جو نہ صرف مصنف کی شخصیت پر روشنی ڈالتی ہیں بلکہ اس ماحول کو بھی اجاگر کرتی ہیں جس میں مصنف کی شخصیت کی تشکیل ہوئی تھی ـــــ اگرچہ یہ رشید صاحب کی زندگی کے ایک مختصر دور کی روداد ہے۔ مگر رشید صاحب کو علی گڑھ سے جو لگاؤ اور وہاں کی تہذیب سے جو عشق تھا جس کا اظہار ان کی تحریروں میں جابجا ملتا تھا اسے سمجھنے میں بہت آسانی ہوجاتی ہے۔

"آزادی کی چھاؤں میں" محترمہ انیس قدوائی صاحبہ نے ۱۹۴۷ء کے انسانیت کش فسادات کے بارے میں اپنے مشاہدات اور تجربات قلم بند کئے ہیں۔ ایک محب وطن ہونے کے علاوہ انیس قدوائی صاحبہ کے تاثرات کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ہی ان کے شوہر شہید ہوئے تھے لہٰذا ان کے تجربات میں کسی فنیادار ی کی آمیزش کے امکانات نہیں ہیں اپنی تصنیف "آزادی کی چھاؤں میں" انھوں نے اس پرآشوب عہد کا جائزہ لیا ہے۔ اور اپنی یادوں کے پس منظر میں ہندوستانی تاریخ کے خونیں باب کی تصویر کھینچی ہے۔

"لکھنؤ کی پانچ راتیں" ـــــ علی سردار جعفری کی صرف پانچ راتوں کی یادیں نہیں بلکہ مصنف نے اس عنوان کے تحت لکھنؤ سے متعلق اپنی یادوں کا بیان کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی زمانے کی رو داد پر اثر اور دلچسپ ہے ـــــ اپنے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے سردار جعفری نے اپنے بچپن کی مخصوص باتوں کا ذکر بھی کیا ہے جنھوں نے ان کی فکر کی تشکیل میں حصہ لیا ہے۔ زندگی کے ایک مختصر زمانے میں محدود ہونے کے بعد بھی اس تحریر کی موجودگی میں مصنف کی فکر اور شخصیت کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ اس تحریر کو آپ بیتی کی ہی ایک شعوری کوشش سمجھنا چاہیئے۔

"بجنگ آمد" ـــــ کرنل محمد خاں کے عہد لفٹنٹی کی خوش گوار یادوں کے مجموعے کا نام ہے۔ پاکستان میں فوج کا عمل دخل سرکاری زندگی میں زیادہ رہا ہے ـــــ اور اہم فوجی حیثیتوں نے اکثر اپنی آپ بیتیاں قلم بند کی ہیں۔ کرنل محمد خاں بھی فوج سے تعلق رکھتے ہیں ـــــ مگر ان کی سرگزشت اردو خود نوشت میں مزاح کی لطیف چاشنی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جنگ کے ہولناک واقعات کو مزاح کے دھیمے پن سے مسکرانے کے لائق بنا کر پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں ـــــ اپنی سرگزشت بیان کرنے کا یہ الوکھا انداز ہے۔ اس سرگزشت میں فوجی ٹریننگ کی ستم ظریفیوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔

شعیب اعظمی نے اپنی یادیں "صحبت یار آخر شد" کے عنوان سے قلم بند کی ہیں۔ یہ یادیں شعیب اعظمی کے ایران کے سفر کی ہیں مگر

ہم اس سرگزشت کو سفرنامے کی صنف میں نہیں بلکہ خود نوشت کی صنف میں پاتے ہیں کیونکہ ذاتی احساسات اور تجربات کو بیان کرتے وقت مصنف آپ بیتی کے زیادہ قریب ہے۔

جن چند کتابوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان کے علاوہ بے شمار ایسی تحریریں ملتی ہیں جس میں مصنف نے اپنی زندگی کے کسی قابل ذکر زمانے کی سرگزشت مرتب کی ہو ــــ ان یادوں کو دہرانے کے محرکات آپ بیتی کے محرکات سے بہ نسبت دوسری اصناف ادب کے قریب تر ہیں۔ چونکہ ظاہری اعتبار سے بھی یہ آپ بیتی سے ملتی جلتی تحریریں ہیں۔ اس لیے اس طرح کی تمام تحریروں کو آپ بیتی کی ہی ایک شاخ سمجھنا چاہیئے۔
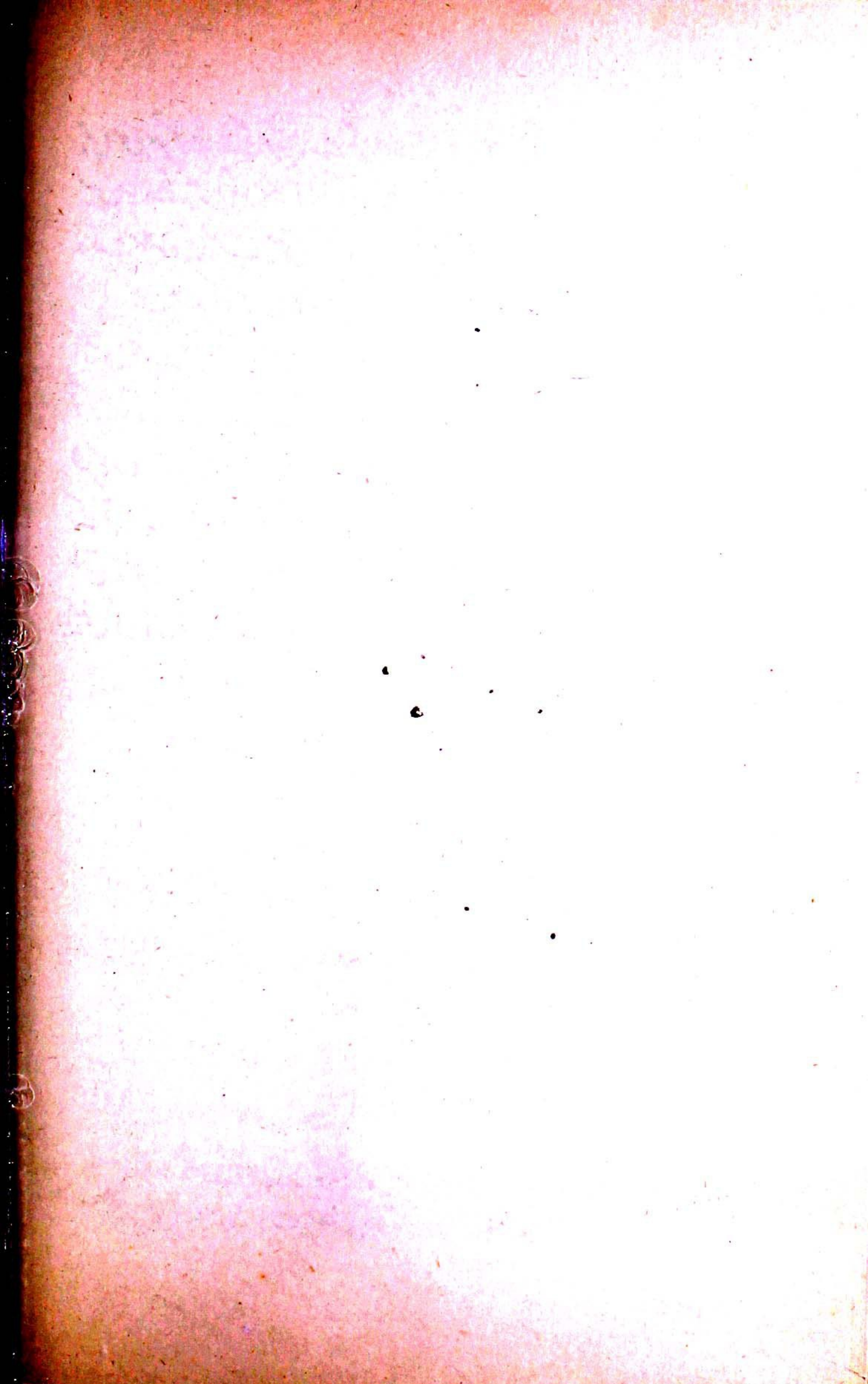
چوتھا باب

اردو خود نوشت سوانح حیات
ایک جائزہ

فہرست

۱۲	مشاہدات	ہوش بلگرامی ۱۹۵۵ء
۱۳	شاد کی کہانی شاد کی زبانی	شاد عظیم آبادی ۱۹۵۸ء
۱۴	سرگزشت	عبدالمجید سالک ۱۹۶۶ء
۱۵	یادوں کی دنیا	یوسف حسین خاں ۱۹۶۷ء
۱۶	شاہراہ پاکستان	چودھری خلیق الزماں ۱۹۶۷ء
۱۷	بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل	شورش کاشمیری ۱۹۷۲ء
۱۸	یادوں کی برات	جوش ملیح آبادی ۱۹۷۰ء
۱۹	مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں	خواجہ غلام السیدین ۱۹۷۴ء
۲۰	اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد ۱۹۷۵ء
۲۱	جہانِ دانش	احسان دانش ۱۹۷۵ء
۲۲	زرگزشت	مشتاق احمد یوسفی ۱۹۷۲ء
۲۳	آپ بیتی	عبدالماجد دریابادی ۱۹۷۹ء

تواریخ عجیب

(جعفر تھانیسری)

اردو میں صورت کچھ ایسی رہی کہ نثر سے پہلے نظم نے قابل لحاظ ترقی کی۔ ولی۔ میر۔ سودا۔ غالب اور ذوق نے جب اپنی شاعرانہ عظمت کے جھنڈے گاڑے تو نثر میں اس قسم کی پیش رفت نہیں ہوئی تھی جب عام نثر کی یہ کیفیت تھی تو سوانح عمریوں اور آپ بیتیوں کی جن کے لیے قلم آسانی سے نہیں اٹھتا کی سمجھ میں آجاتی ہے۔

۱۸۵۷ء میں غدر کے آس پاس کے زمانے میں واجد علی شاہ کی منظوم آپ بیتی اور اس کے بعد مولانا جعفر تھانیسری کی تواریخ عجیب (کالا پانی) کے سوا اور کوئی چیز اس قبیل کی نظر نہیں آتی انڈمان میں جسے کسی زمانے میں کالا پانی بھی کہا جاتا تھا قید کے ۱۸ سال کے دوران جعفر تھانیسری نے جو تین کتابیں لکھیں

ان میں تواریخ عجیب بھی ہے۔ ان کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تواریخ عجیب کے نام سے اردو نثر میں نہ صرف اولین آپ بیتی لکھی بلکہ تحریک جہاد کے رہنمائے اعظم سید احمد بریلوی کی سوانح عمری (سوانح احمدی) بھی قلم بند کی۔

مولانا جعفر تھانیسری کی حیثیت اردو میں ادبی نہیں ہے ان کی دل چسپی قانون۔ مذہب اور تحریک جہاد سے تھی لیکن یہ بات بہرکیف تسلیم کرنا ہوگی کہ تواریخ عجیب کی حیثیت ایک باضابطہ اور شعوری خود نوشت سوانح حیات کی اگر نہیں ہے تو اس چیز کی ضرور ہے جسے انگریزی میں Partial autobiography (جزوی آپ بیتی) کہا جاتا ہے خود مصنف نے اسے اپنی آپ بیتی نہیں بتایا ہے۔ اردو نثر کا چونکہ بہت ابتدائی دور تھا اس لیے اس صراحت کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

قید و زنداں کے حالات پر مشتمل تصانیف اور بھی موجود ہیں لیکن انڈمان کی دنیا ہماری دنیا سے اور ہمارے ماحول سے بالکل مختلف تھی۔ اپنی ذات کی جھلکیوں کے ساتھ وہاں کے حالات کی تصویر کھینچ کر جعفر تھانیسری نے اردو کے ذخیرے میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ یہ ایک ہنگامہ خیز طوفانی زندگی کی روداد ہے۔ پڑھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلیج بنگال کے اس جزیرے میں پہونچ کر خود تماشائی بن گیا ہو۔ انڈمان کے قدیم باشندوں کی بول چال۔ رہن سہن

عادات و اطوار۔ رسم و رواج اور ہندوستان سے عمر قید کی سزا پا کر وہاں جانے والے لوگوں کی کیفیات کا یہ دلچسپ مرقع ہے۔

انھوں نے اپنی زندگی کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں وہ نہ صرف حیرت انگیز ہیں بلکہ زندگی کی نیرنگی اور عجوبہ کاری کا نمونہ بھی ہیں، ان کی روداد شروع سے آخر تک دلچسپیوں سے بھری ہوئی ہے۔

اخیر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۲۸۰ھ سرحد غربی ہند۔ بر ملک یاغستان میں خود انگریزی سرکار کی زبردستی سے ایک جنگ عظیم شروع ہو گئی۔

۱۱ر دسمبر ۱۸۶۳ء کو ایک سوار پولیس متعینہ چوکی پانی پت کرنال مسمی غزل خاں نام ایک ولایتی افغان نے کسی ذریعے سے میرے حال سے واقف ہو کر ایسے وقت میں اپنی دنیوی بھلائی کا موقع جان کر ایک لمبی چوڑی اور جھوٹی کیفیت خیر خواہانہ کے ساتھ بحضور صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کے حاضر ہو کر یہ مخبری کی کہ یہ جنگ جو ہندوستانی مجاہدوں کے ساتھ سرحدوں پہ ہو رہی ہے ان لوگوں کو محمد جعفر نمبردار تھانیسری روپیہ اور آدمیوں سے مدد دیتا ہے ــــــ تین بجے رات کے سپرنٹنڈنٹ پولیس معہ وارنٹ خانہ تلاشی کے میرے دروازے پر موجود ہیں انھوں نے اول مجھ کو وارنٹ دکھایا بعدہٗ کہا کہ اپنے گھر کی تلاشی دو۔ اس وقت میں سمجھا دال میں کچھ کالا ہے۔ بیٹھک کی تلاشی ہونے لگی اور وہی خط جس کا ڈر تھا سب سے پہلے پولیس کے ہاتھ لگا۔''[ل۵]

ل۵ صفحہ ۱۷۶

اس کے بعد پولیس کی زیادتیوں اور جسمانی اذیتوں کی طویل فہرست کے بعد یہ حصہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

"جج صاحب اپنی تجویز حسب ایما گورنر صاحب گھر پر بیٹھ کر لکھ لائے تھے سب سے پہلے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم نے سوائے بحث اور انکار کے حیلتہً خیر خواہی سرکار کا دم نہیں بھرا باوجود فہمائش کے کچھ ثابت کرنے کی کوشش نہ کی ـــــ اس واسطے تم کو پھانسی دی جائے گی۔ باقی آٹھ مجرموں کو دائم المحبس بہ عبور دریائے شور معہ ضبطی جائیداد کی سزا ملی ـــــ اب اس مقلب القلوب کی ظاہری کارروائی سنیئے جب بہت سے صاحب اور میم ہم کو پھانسی گھروں میں شاداں اور فرحاں دیکھ گئے تو چرچا سب صاحب لوگوں میں پھیلا تب ان صاحب لوگوں نے جو ہمارے دشمن جانی تھے یہ خیال کیا کہ ایسے جانی دشمنوں کو منھ مانگی موت شہادت۔ جس کے واسطے وہ ایسا خوش ہیں نہیں دینا چاہیے۔ بلکہ ان کو کالے پانی بھیج کر وہاں کی مصیبتوں اور مسائل سے ہلاک کرنا چاہیے۔ ڈپٹی کمشنر انبالہ ۶ ار دسمبر کو پھانسی گھروں میں تشریف لائے اور چیف کورٹ کا حکم ہم کو پڑھ کر سنایا کہ تم لوگ پھانسی پڑنے کو بہت دوست رکھتے ہو۔ اس واسطے سرکار تمھاری دل چاہی سزا تم کو نہیں دے گی۔" [51]

مولانا جعفر تھانیسری نے اپنی زندگی کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں ان میں سے ازدواج کے بارے میں ایک اقتباس دلچسپی

---

[51] صفحہ ۱۷۷

سے خالی نہیں ہے جب گرفتار ہوئے تو شادی ہو چکی تھی اولاد بھی تھی، انڈمان میں انھوں نے دو شادیاں کیں۔ اس سلسلے میں ان کا بیان ملاحظہ ہو۔

"ٹاپو بدو عورتوں سے بھرا ہوا تھا اور میں اس ٹاپو میں افسر تھا بہت سی عورتوں نے مجھے اپنا شکار کرنا چاہا۔ میں نے یہ کیفیت دیکھ کر اپنی بیوی کو پانی پت سے بلانا چاہا مگر اس وقت وہ راضی نہ ہوئیں جب ایک دفعہ اس کی کچھ رضامندی بھی ہوئی تو میری درخواست حاکم وقت نے نامنظور کر دی اس واسطے مجبوراً کسی نیک عورت سے وہیں عقد کرنے کی صلاح ٹھہری ایک ہندو عورت قوم برہمن ضلع الموڑہ کی رہنے والی نئی قید ہو کر وہاں پہنچی اور بارک عورات ہندو میں ہمارے حوالے ہوئی حاکم وقت سے اطلاع کرکے ۱۵ اپریل ۱۸۷۰ء کو اس سے نکاح کر لیا۔ اس بیوی سے مجھ کو دس بچے پیدا ہوئے اور یہی پورٹ بلیئر سے میرے ساتھ ہندوستان آئی۔" [۵۱]

مصنف نے چھوٹے سائز کی کھلی کتابت کے صرف کم و بیش ڈیڑھ سو صفحات کا احاطہ کر سکنے والی اس کتاب میں انگریزی جبر و استبداد، پھانسی کی سزا پانے اور پھر اس کے عمر قید میں تبدیل ہونے، انڈمان میں فرقہ وارانہ مسئلہ موجود ہونے بقرعید میں بیل کے ذبیحہ پر ہندو مسلم فساد کی نوبت آجانے پر اپنی کمزوری اور استقامت دونوں واقعات کا تھوڑا تھوڑا تذکرہ

---

[۵۱] صفحہ ۱۹۷

کر دیا ہے انھوں نے اپنے انگریزی سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کا حال بتایا ہے اور چالیس مختلف قوموں کی آبادی والے اس جزیرے کے بارے میں خصوصیت سے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہاں ہندوستانی کے بغیر کام نہیں چلتا۔ یہ وہی زبان ہے جسے اردو کہا جاتا ہے۔

داستان غدر
سنہ ۱۹۱۰ء
(ظہیر دہلوی)

ظہیر دہلوی شاید پہلے شخص ہیں جنھوں نے شعوری طور پر صراحت کے ساتھ ذکر کرکے آپ بیتی لکھی۔ اس کتاب میں سنہ ۱۸۵۷ء کے غدر کی کیفیت چونکہ تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے اس لیے پبلشر نے مختصر نام "داستان غدر" رکھا۔ اس کتاب کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے۔

"داستان غدر یا طراز ظہیری یعنی حضرت راقم الدولہ ظہیر دہلوی شاگرد رشید حضرت ذوق علیہ الرحمۃ کے چشم دید حالات غدر اور اپنی سوانح عمری ۔۔۔" [۱]

ظہیر دہلوی نے کتاب کی ابتدا ہی میں اپنی تحریر کی خصوصیات ان الفاظ میں ظاہر کی ہیں۔

---

[۱] سرورق داستان غدر۔ از ظہیر دہلوی۔ مطبوعہ مطبع کریمی دہلی۔

"تمامی سرگزشت بطور سوانح عمری روز ولادت تا زمانہ شیخوخیت راست، راست بے کم و کاست بلا تصنع اور بلا مبالغہ۔ بلا تصرف اور بلا تحریف جو حوادث سر پر گزرے اور جو واقعات مدت العمر میں پیش آئے ہیں قلم بر داشتہ بقید تحریر لائے جاتے ہیں۔ کسی کی توہین و مذمت و ستائش و مدحت سے سروکار نہیں۔" لے

ظہیر دہلوی کی تصنیف داستان غدر اگرچہ سنہ ستاون کے واقعات کی مکمل روداد نہیں۔ لیکن سنہ ستاون کے حادثات اور تجربات زندگی کے اجزا میں مل کر اس طرح نمایاں کیے گئے ہیں کہ الم انگیز واقعہ پر روشنی تو پڑتی ہی ساتھ ہی ساتھ لکھنے والے کی سرگزشت غم اس کے تاثر کو دو چند کر دیتی ہے۔ لہذا یہ غدر کی داستان بھی ہے اور آپ بیتی بھی۔ جسے اردو کی اولین آپ بیتی نہ بھی کہا جائے تب بھی اس کو چند اولین آپ بیتیوں میں ضرور شامل کیا جا سکتا ہے۔

غدر کے وقت ظہیر دہلوی کی عمر ۲۲ سال تھی۔ چنانچہ اس وقت کے مجلسی روابط اور سماجی احوال کی بڑی معلومات افزا تصویر سامنے آتی ہے خصوصاً دہلی کی معاشرت کے خوبصورت نقشے کھینچے گئے ہیں۔ یہ کتاب ان جزئیات سے بھرپور ہے جو سوانح کے بے رنگ خاکوں میں زندگی کا رنگ بھرتے ہیں۔

ظہیر نے چار سال کی عمر میں روزہ رکھا اس کے افطار کی

لے داستان غدر۔ از ظہیر دہلوی۔ مطبوعہ مطبع کریمی دہلی۔ صفحہ ۱

دلچسپ رسم کا بیان ہے۔ اس کے علاوہ نوشت وخواند کا دور قرآن مجید۔ پندنامہ۔ سعدی نامہ۔ گلستان و بوستان اور دوسری کتابوں سے تحصیل علم کا زمانہ اور بارہ سال کی عمر میں تعلیم سے فراغت کا دلچسپ بیان ہے اسی طرح اپنی شعر گوئی کا حال بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ شہر میں مشاعروں کی کثرت۔ شاہ نصیر کے مکان پر خصوصی شاعرے اور دہلی کے اکابر شعرا مثلاً غالب، آزردہ، عیش وحشت اور بعد میں داغ وغیرہ کے ادبی جلسے اور محفلیں جو غدر کے بعد درہم برہم ہو گئیں۔ ان سب واقعات کا ذکر صرف تفصیلی نہیں بلکہ بھرپور ہے۔ دہلی کی "پھول والوں کی سیر" کے علاوہ اس وقت کی شہری زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے جس سے اس زمانے کے ذوق اور میلان کا پتہ چلتا ہے۔ مشاعروں کے انوکھے اور دلچسپ طریقے، داد وتحسین کے نرالے ڈھنگ جو وقت کے ساتھ مٹ گئے۔ "داستان غدر" میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثلاً بعض شعرا دوسرے شاعروں کی غزل سن کر داد وتحسین کے طور پر اپنی غزلیں چاک کر ڈالتے تھے۔ اسی طرح ایک شعر کے بدلے پورا دیوان نذر کرنے کی رسم کا بھی ذکر ہے،

"داستان غدر" میں جیسا کہ اس کتاب کا عنوان ہے غدر کے قیامت خیز واقعات بڑی جان سوزی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ کا یہ واقعہ ظہیر دہلوی کی زندگی میں بڑے بڑے انقلابات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اسی کے باعث ظہیر کو دہلی چھوڑنا پڑی۔ اور گردش روزگار کا شکار ہوئے جگہ جگہ دربدر۔ کوچہ بہ کوچہ ہر ملک اور ہر خطہ کی خاک چھاننی پڑی۔

چنانچہ اپنے متعلق ایک شعر لکھا ہے جس سے ان کی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

۵ چہ پرسی از سروساما نیم عمریست چوں کاکل
پریشاں روزگارم، خانہ بردوشم

"مظلوم شرفائے دہلی پر جو ظلم وستم ہوئے۔ ان کی دردناک کہانی اس لیے بھی زیادہ دردناک ہوگئی کہ لکھنے والے کی اپنی داستان غم بھی اس میں شامل ہے کیونکہ مصنف کو خود بھی بڑے مصائب اور آلام کا شکار ہونا پڑا تھا۔" ۵[1]

ظہیر دہلوی کی یہ آپ بیتی کوئی مکمل اور مفصل آپ بیتی نہیں ہے مگر آپ بیتی لکھنے کے لیے جس قلم اور جس دل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے وہ قدرت کی طرف سے ظہیر کو حاصل تھا۔ ظہیر کو بیانیہ نگاری پر اچھی خاصی قدرت حاصل تھی — وہ جزئیات کے حسن ترتیب سے مکمل مرقع بنا لیتے ہیں — انھیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ اپنی کہانی کو دل کش اور خیال انگیز کس طرح بنایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں صرف ایک فقرے سے ذہنی حالت کی خوبصورت تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ مثلاً خون آشام سانڈرس کے شکی اور جنونی مزاج کا اندازہ صرف ایک جملے سے ہوتا ہے۔ سانڈرس کے بے چین دماغ کو ہر طرف بغاوت ہی بغاوت دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ مولا بخش ہاتھی کو دیکھ کر کہا گیا اس کا

---

[1] میرامن سے عبدالحق تک ڈاکٹر سید عبداللہ صفحہ ۸۰ مطبوعہ چمن بکڈپو اردو بازار دہلی ۶ء

ایک جملہ اس کی ذہنی کیفیت کی غمازی کر رہا ہے۔

"یہ ہاتھی باغی ہو سے نیلام کر دو" [51]

یا ایک جگہ تلنگوں کی زیادتی کا بیان کرتے ہیں کہ اپنی سیہ کاری کے عالم میں تلنگوں نے شرفائے دہلی کو تنگ کرنے کے لیے میموں کے روپوش ہونے کا بہانہ بنایا تھا ــــ جس گھر کو لوٹنا چاہتے اس کی طرف اشارہ کر دیتے کہ یہاں میم چھپی ہوئی ہے اس کا حال یوں بیان کیا ہے۔

"شہر کی یہ کیفیت تھی کہ بدمعاش شہر کو پوربیوں کو ہمراہ لیے ہوئے بھلے مانسوں کے گھر لٹواتے پھرتے تھے اور جس کو مالدار دیکھا ان کے گھر پوربیوں کو لے جا کر کھڑا کر دیا کہ یہاں میم چھپی ہوئی ہے" [52]

یہاں پر یہ جملہ کہ "یہاں میم چھپی ہوئی ہے" صرف ایک جملہ نہیں ہے ظلم اور سینہ زوری کی علامت ہے جو اس سرگزشت کو خون غم کے چھینٹوں سے رنگین بناتی ہے۔

خود نوشتہ سوانح عمری کا مسودہ ظہیر دہلوی کے نواسے میر اشتیاق حسین شوق کے پاس تھا۔ ان ہی سے حاصل کر کے طاہر نبیرۂ آزاد نے شائع کیا۔ پبلشر کا بیان ہے کہ غدر کے حالات اور واقعات معلوم کرنے کی کھوج اور کرید میں اس مسودے کا پتہ چلا اور اس طرح یہ کتاب عالم وجود میں آئی ــــ اس کتاب میں فارسی آمیز زبان استعمال کی گئی ہے مگر کوئی دشواری نفس

---

51 داستان غدر۔ ظہیر دہلوی صفحہ ۲۵
52 " " " صفحہ ۳۷

معاملہ کو سمجھنے میں نہیں آتی ہے ظہیر نے یہ بات بھی واضح کر دی ہے
کہ انھوں نے غدر کے بارے میں کسی سنی سنائی بات پر یقین
نہیں کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں ان کا اپنا مشاہدہ اور تجربہ ہے
یا پھر باغی فوجیوں سے تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔

"اپنی جانب سے تبدیل اور تحریف کو روا نہیں رکھا جو
واقعات میری نظر سے گزرے اور بیانات کہ میں نے اپنے
کان سے سنے اسی طرح درج صحیفہ کیے ہیں — مثلاً ایام غدر
میں جو معرکہ جنگ کے حالات زبانی مردمان فوج باغیہ
میرے گوش گزار ہوئے وہ ہی لکھتا ہوں اور بازاری گپوں
کا اعتبار نہیں اس سے مجھے احتراز ہے۔"[1]

---

[1] داستان غدر۔ ظہیر دہلوی صفحہ ۲

عبدالغفور خاں نساخ

عبدالغفور خاں نساخ کی آپ بیتی ابھی تک مخطوطے کی شکل میں ہی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال لائبریری کلکتہ میں موجود ہے۔ یہ آپ بیتی نامکمل ہے نساخ کی وفات ۱۸۸۹ء میں ہوئی تھی[1] نساخ نے اپنے چوتھے اور آخری دیوان ارمغانی[2] میں جو ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا تھا اپنی خود نوشت کا تذکرہ کیا تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ نساخ کی سوانح عمری تکمیل کے قریب تھی مگر ناگزیر حالات کے باعث نساخ اسے مکمل نہ کر سکے اور نہ ہی یہ طباعت کے مراحل سے گزر سکی۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نساخ نے اپنی خود نوشت ۱۸۸۶ء تک ہی لکھی تھی کیونکہ ۱۸۸۶ء سے آگے کے حالات یا واقعات نہیں

---

[1] بحوالہ نقوش۔ ادارہ فروغ اردو (لاہور) پاکستان جون ۱۹۶۴ء

[2] "ارمغانی" مطبوعہ مطبع نامی لکھنؤ ۳ صفر ۱۳۰۴ھ ۱۵ نومبر ۱۸۸۶ء

ملتے ہیں لہذا ۱۸۶۰ء اس نامکمل آپ بیتی کا سال ترتیب قرار دیا جاسکتا ہے ۔[1]

اپنی خود نوشت میں نساخ نے واقعات کے بیان کرنے میں کسی ترتیب یا تسلسل کو مد نظر نہیں رکھا ہے واقعات کا انحصار زیادہ تر یادداشت پر ہے جو واقعہ جس طرح اور جتنا یاد آیا ہے ۔ ویسے ہی درج کر دیا ہے۔ اس لیے واقعات کی کڑیاں اکثر بیچ سے ٹوٹی ہوئی ہیں اور ان کی کہانی جگہ جگہ پر بے ربط ہو جاتی ہے ۔

مثلاً اپنے خاندان کے بزرگوں میں حضرت خالد بن ولید اور حضرت مہاجر اور حضرت عبدالرحمن کے مختصر ذکر کے بعد عبداللہ القیرانی کا ذکر کرتے ہیں جن کا ۴۲ھ میں دمشق میں انتقال ہوا اس کے بعد اپنے جدامجد شاہ عین الدین صاحب کا ذکر کرتے ہیں جو ۱۳۲۰ء میں دہلی آئے اُس درمیانی خلا کو پر کرنے کی وہ کوئی ضرورت نہیں سمجھتے ہیں کہ ان کے بزرگوں کا خاندان دمشق اور پھر بغداد کیسے آیا ؟ اپنی تعلیمی زندگی کے تجربات تفصیل سے بیان کرتے ہیں مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ کب فارغ تحصیل ہوئے اور کہاں تک علم حاصل کیا۔ اور اسی طرح بے شمار گوشے وضاحت طلب ہیں ۔

اکثر جگہ ان کی تفصیلات دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ اپنے بچپن کے استادوں کا ذکر بہت لطف کے ساتھ کرتے ہیں ۔

"گھر پر پڑھانے کے لیے ایک مولوی مسمی ازہر علی سلہٹی

---

[1] نساخ حیات اور تصنیف ڈاکٹر محمد صدرالحق مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۷۰ء

مقرر کیے گئے، یہ نہایت تیز مزاج اور چڑچڑی طبیعت کے
آدمی تھے بچوں کو اکثر بے قصور پیٹا کرتے تھے"۔ [۵۱]

ناسخ کے ساتھ بھی ان کا یہی سلوک تھا شروع شروع میں تو انھوں نے برداشت کیا ایک روز یہ روتے ہوئے سیدھے اپنے عم بزرگوار قاضی محمد صابر کے گھر چلے گئے ان کے کمرے میں ایرانی تلوار لٹک رہی تھی۔ اتنے میں مولوی صاحب بھی آ پہونچے اور برا بھلا کہنے لگے۔ مگر ناسخ اپنی جگہ سے نہ ہلے مولوی صاحب سے یہ کہاں برداشت ہوتا۔

"وہ بید لے کر مجھے مارنے آئے میں نے جلد شمشیر میان سے نکال کر ان پر حملہ کیا۔ وہ بھاگے یہاں تک کہ دکان کے دروازے سے سڑک پر نکل گئے اور شمشیر عریاں بکف تھاؤ کرتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے دو تین سو قدم گیا بعد ازاں پھر آیا — استاد ایک لنگی پہنے ہوئے تھے اور ننگے پاؤں ننگے سر تھے ان کے ہاتھ میں ایک بید تھا۔ اس روز کے بعد سے میں نے ان کو نہیں دیکھا —" [۵۲]

ناسخ کو شاعری کے علاوہ علم رمل اور علم نجوم اور فن خطاطی سے بھی لگاؤ تھا ان کو سیکھنے کے سلسلے میں جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ان کے ساتھ ساتھ ان فنون کے کرشمات کا ذکر بھی موجود ہے۔

---

۵۱ نقوش، جون ۱۹۶۴ء ادارہ فروغ اردو لاہور پاکستان صفحہ ۵۲۴
۵۲ نقوش " " " صفحہ ۵۲۹

علم نجوم کے بارے میں ایک واقعہ ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۰ء کا ہے۔

"قیام بریال (ضلع باقر گنج معروف بریال شرقی بنگال)

میں نے بہت سے مقدمات بذریعہ نجوم فیصل کیے۔"[۵۱]

"ایک دن ایک مقدمہ میرے پاس آتش زدگی کا پیش ہوا

اس میں ایک شخص نے مدعا علیہ پر دعویٰ کیا تھا کہ

مدعا علیہ نے بہ سبب عداوت اس کے گھر میں آگ لگا دی

اور آٹھ ہزار روپیہ مدعی کا برباد ہوا میں نے جو نجوم سے

دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مدعی کا مکان معہ اسباب

کے بے شک جل گیا ہے مگر مدعا علیہ نے نہیں جلایا ہے

بلکہ آپ سے آپ آگ لگ کے جل گیا۔ پھر تحقیق کی گئی

تو معلوم ہوا کہ بات ٹھیک تھی چنانچہ اسی کے مطابق

فیصلہ ہوا۔"[۵۲]

ناسخ کی زندگی کے گوناں گوں تجربات میں ان کے سفر بھی شامل ہیں انھوں نے بنگال، بہار کے اکثر بیشتر علاقوں کے علاوہ لکھنؤ اور دہلی کا سفر بھی کیا اور ان مقامات میں سے بعض جگہ کے لوگوں کے رہن سہن اور عادات اطوار کا بھی اختصار سے ذکر کیا ہے۔

"بریال میں جتنے پیچیدہ اور مشکل مقدمات میں نے

دیکھے آج تک ایسا مقدمہ کہیں نہیں دیکھا وہاں جعل کی بڑی کثرت ہے"[۵۳]

---

[۵۱] نقوش جون سنہ ۱۹۶۳ء ادارۂ فروغ اردو لاہور پاکستان صفحہ ۵۲۹

[۵۲] نقوش " " " " صفحہ ۵۲۹

[۵۳] خود نوشت سوانح عمری ناسخ صفحہ ۱، مخطوطہ سکشن ۴۰، ۹ فولیو ع ۱۰۲ / ۱

لکھنؤ کے اشخاص کے متعلق ان کی رائے ہے۔

"یہاں کے اکثر لوگ زبانی محبت بہت دکھلاتے ہیں لیکن دل میں کچھ نہیں ہے۔ لکھنؤ کے لوگ باتیں خوب بناتے ہیں"[۵۱]

"ڈھاکہ سلہٹ بریسال وغیرہ پورب کے ضلع کے لوگوں کو نہ خدا کا خوف ہے نہ رسول کا خوف ہے نہ آدمیوں کا خوف ہے اور نہ محبت نہ مروت۔ سب کو نقط روپے کی فکر ہے[۵۲]"

اس خود نوشت سوانح حیات کا سب سے دلچسپ پہلو اس زمانے کی معاصرانہ چشمکوں اور مشاعروں کا احوال ہے۔ اسی سلسلے میں نساخ نے اپنے شاگردوں اور معاصروں کا ذکر بھی کیا ہے۔ ۱۸۶۶ء میں بغرض علاج نساخ دہلی گئے تھے۔ یہاں نساخ کی ملاقات مفتی صدر الدین آزردہ، ضیاء الدین خاں نیر درخشاں۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ مولانا الطاف حسین حالی اور مرزا اسد اللہ خاں غالب سے ہوئی تھی۔ مرزا غالب سے ملاقات کا تذکرہ خاصہ طویل ہے۔

"مرزا غالب نے ایک دن مجھ سے کہا مولوی معلوم ہوتا ہے کہ میری طرح تم بھی سات آٹھ برس کے سن سے شعر کہتے ہوگے" میں نے کہا کہ "ہاں" اور عید کے روز مرزا صاحب نے اپنی "مثنوی گہربار" کے تین چار سو شعر میرے سامنے پڑھے اس پر اہل دہلی کو بڑا تعجب ہوا کہ مرزا صاحب نے پانچ

---

۵۱ خود نوشت سوانح عمری نساخ صفحہ ۱۲۹۔ ایشیاٹک لائبریری کلکتہ۔
۵۲ " " " صفحہ ۲۲ بحوالہ نساخ حیات اور تصنیف ڈاکٹر صدر الحق

چھ برس سے کسی کے سامنے شعر نہیں پڑھے تھے۔ بلکہ اگر کوئی
ان سے شعر پڑھنے کے لیے کہتا تھا تو ناراض ہو جاتے تھے[1]
مرزا غالب کے سلسلے کا یہ واقعہ مرزا غالب کے ساتھ ساتھ ناسخ
کے ذوق اور علمی استعداد پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ کہ مرزا کو بھی
ناسخ کی صلاحیتوں اور ذوق کی پختگی کا علم تھا۔

شاعری اور علمی تذکروں کے علاوہ ناسخ کے یہاں اس عہد
کے سماجی اور معاشرتی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور قابل غور
حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس زمانے میں مولانا جعفر
تھانیسری جلا وطنی کے عالم میں انگریزی ظلم اور استبداد کی
داستان لکھ رہے تھے۔ علامہ فضل الحق خیر آبادی اور ظہیر دہلوی
لال قلعے کی زوال پذیر تہذیب کے دھندلے نقش اجاگر کر رہے
تھے اسی زمانے میں ناسخ جب کلکتے میں اپنی یادیں مرتب
کرتے ہیں تو ان کے احساسات قطعاً مختلف ہیں ___ وہ غدر
کا تذکرہ تو کرتے ہیں مگر اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں یا تو یہ
انگریزی حکومت کی ملازمت کی وجہ تھی یا پھر دہلی سے دور ہونے
کی وجہ سے وہ حقیقت کی اس تابناکی سے آگاہ ہی نہ ہو سکے تھے
جس نے دہلی والوں کے دل میں آگ لگا دی تھی۔

"دوسرے دن میں ایک بجے دن کو گھر سے نکلا گرمیوں
کے دن تھے میں نے دو جوڑ کپڑے پہن لیے یعنی
دو انگرکھے اور دو پاجامے اور دو موزے اور اپنا دیوان

---

[1] عبد الغفور ناسخ صفحہ ۵۳۴۔ نقوش ماہ جون ۱۹۶۴ء۔ لاہور

جو اس وقت تک مرتب نہ تھا اس کو بھی لے لیا اور جتنے روپے میرے پاس تھے سب لے لیے اور گھر سے نکلا اس انتظام کا سبب یہ تھا کہ اگر باغی سپاہی شہر میں آ گئے تو شاید میرا گھر میں آنا نہ ہو۔ میں جو گھر سے نکلا تو دیکھا کہ شہر میں گرد اڑ رہی ہے۔ ہر طرف انگریز پیدل اور سوار دریا کی طرف جا رہے ہیں۔ ایسا حال شہر کا میں نے کبھی دیکھا نہ تھا میں اسی طرح کاول صاحب کی کوٹھی پر گیا تو معلوم ہوا کہ چار بجے تحقیق حال معلوم ہو جائے گا کہ باغیوں نے ہتھیار دیے دیئے یا نہیں۔ چار بجے سنا کہ باغیوں نے ہتھیار دے دیئے ہیں اس کے سنتے ہی ایسی خوشی ہوئی کہ کہہ نہیں سکتا۔" ۵۱

غدر کے بارے میں اپنے بیان کو وہ یہ کہہ کر ختم کر دیتے ہیں کہ "شہر میں ہر طرف امن و امان ہو گیا۔" ۵۲

ناسخ کی خود نوشت سے ان کی معاشی تگ و دو۔ ان کے زمانے کی اہم ہستیوں کے نام۔ ڈپٹی کلکٹری کے تجربات۔ مختلف علاقوں میں تبدیلی اور قیام کی مدت دلی لکھنؤ اور عظیم آباد کے سفر کا حال دیانت داری۔ ایمان داری اپنے شاعرانہ کمال اور معاصروں سے چشمکوں اور دیگر فنون مثلاً علم نجوم۔ علم رمل اور فن خطاطی وغیرہ کے سیکھنے کا حال معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ مگر ان

---

۵۱ خود نوشت عبدالغفور نساخ (نقوش لاہور جون ۱۹۶۴ء) صفحہ ۵۲۹
۵۲ " " " " صفحہ ۵۲۹

تمام تفصیلوں کے ساتھ ایک اور جذبہ جو ہر جگہ کام کر رہا ہے کہیں منھ چھپا لیتا ہے اور کہیں سامنے آن کھڑا ہوتا ہے وہ ہے ناسخ کا خود پسندی اور خودستائی کا جذبہ ___ اس کے علاوہ لہجہ میں شدت پسندی پائی جاتی ہے۔ جن کی تعریف کرتے ہیں اسے سر پہ چڑھا لیتے ہیں اور جسے ناپسند کرتے ہیں اس میں زیادتی کا رنگ آجاتا ہے۔

"مولوی رمضان اللہ شرح ملا پڑھانے میں بے مثل تھے ان سے بہتر شرح ملا پڑھانے والا نظر نہیں آیا۔" ۵۱

اپنے استاد ضیغم کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ایسا جامع کمالات آدمی نظر نہیں آیا بلکہ شاید ان کے عہد کیا ساری دنیا میں ایسا آدمی نہ تھا۔ کوئی علم کوئی حرفہ کوئی فن ایسا نہ تھا جس میں ان کو معقول دخل نہ تھا۔" ۵۲

مولوی نجف علی کے متعلق فرماتے ہیں۔

سر آمد علمائے زمان مولوی نجف علی خاں متخلص بہ خستہ باشندہ جھجھر سے ملاقات ہوئی ان کو زبان عربی میں ایسا دخل تھا کہ شاید ہند میں اور کسی کو نہ تھا۔ آپ کی تصنیفات میں سینکڑوں کتابیں ہیں ___" ۵۳

---

۵۱ خود نوشت عبدالغفور نساخ (نقوش لاہور جون ۱۹۶۲ء) صفحہ ۱۰

۵۲ " " " صفحہ ۴ بحوالہ حیات اور خدمات۔ ڈاکٹر صدر الحق

۵۳ " " " " صفحہ ۱۰ " " " "

ان تعریفوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناسخ کی طبیعت اعتدال پسند نہ تھی وہ اچھائی اور برائی کے اظہار میں ہمیشہ حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔ یہی چیز ان کی سیرت کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے،

لیکن باوجود انتہا پسندی اور خود ستائی ناسخ کی خود نوشت پڑھنے کے بعد ان کی ہمہ گیری کا قائل ہونا پڑتا ہے ان کے مراسم اس عہد کے تقریباً ہر اہم اور ذی علم ہستی سے تھے۔ شاعروں، عالموں اور مشہور شخصیتوں کے تذکرے کے علاوہ ناسخ نے ہندستان کے جن علاقوں کا دورہ کیا تھا۔ اپنی آپ بیتی میں وہ ان کے نام ہی نہیں گنواتے ہیں بلکہ ان علاقوں کے رسم و رواج لباس اور پھلوں تک کا ذکر تے ہیں۔ مثلاً لکھنؤ کے خربوزے۔ الہ آباد کے امرود۔ سلہٹ کے اناناس اور چائے۔ بنگال کا کیلا امرت ساگر وغیرہ

ناسخ کی خود نوشت سوانح حیات سے ان کی تالیفات اور تصنیفات کا پتہ چلتا ہے ان میں "دفتر بے مثال"۔ "اشعار ناسخ" "ادمعانی"۔ "سخن شعرا"۔ "گنج تاریخ"۔ "چشمہ فیض" اور "انتخاب نقص" وغیرہ شامل ہیں۔ چند خامیوں کے باوجود اردو خود نوشت سوانح حیات کی فہرست میں ناسخ کی خود نوشت اپنی معلوماتی خصوصیات کے سبب ایک الگ اہمیت کی حامل ہے۔

آپ بیتی

(خواجہ حسن نظامی)

سنہ ۱۹۱۹ء

خواجہ حسن نظامی نے جو "ادیب انشاء پرداز" کی حیثیت سے مشہور تھے
سنہ ۱۹۱۹ء میں "آپ بیتی" کے نام سے اپنے حالات زندگی شائع کئے
اس کتاب پر لکھے جانے والے دو دیباچوں سے اندازہ ہوتا ہے
کہ اس وقت تک "آپ بیتی" کی اصطلاح عام طور پر مستعمل نہ تھی۔
اڈیٹر اخبار خطیب و رسالہ "نظام المشائخ" دہلی کا بیان ہے۔

"خود نوشت سوانح عمری کا ہمارے یہاں رواج ہی کہاں
ہے علاوہ ازیں آپ بیتی خواجہ حسن نظامی جیسی بایوگرافی
تو قطعی اپنی زبان میں کسی کی نہیں پیش کر سکتے ہیں۔"

مولوی شیخ احسان الحق قادری ایڈیٹر رسالہ "اسوۂ حسنہ" دہلی
نے دیباچے میں لکھا ہے کہ

"جہاں تک مجھے علم ہے اردو کے کسی مشہور مصنف یا باکمال

شاعر و انشا پرداز نے اپنی مبسوط سوانح عمری خود لکھ کر
ایک مستقل کتاب کی صورت میں شائع نہیں کی اس لحاظ
سے "آپ بیتی" کی اشاعت اردو علم و ادب میں ایک
نئی اور قیمتی دل چسپی کا اضافہ کرے گی۔" ۵۱

یہ دو شہادتیں اس تحقیق کو تقویت پہونچاتی ہیں کہ اس سے قبل اردو کے کسی جانے پہچانے ادیب نے اپنے حالات زندگی قلمبند نہیں کیے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کے سامنے کوئی مثال ایسی نہ تھی جس کی وہ تقلید کرتے۔ انگریزی سے وہ واقف نہ تھے عربی اور فارسی سے واقفیت تھی لیکن کوئی ذکر اس بات کا نہیں ملتا ہے کہ کوئی تحریر آپ بیتی کا محرک بنی ہو۔

"میں نے جب کبھی اپنی زندگی کا روزنامچہ لکھا تو محسوس ہوا
کہ گویا اپنی ہستی کے عرفان کا بہی کھاتہ لکھ رہا ہوں کیونکہ جب
اس کو دیکھتا ہوں آمد و خرچ کا حساب یاد آجاتا ہے۔ پس یہ
آپ بیتی یہ خود نوشت بھی مجھ کو آگے چل کر زندگی کا حساب
بتائے گی۔ ناظرین کچھ ہی سمجھیں میں نے تو یہ کتاب لکھ کر
عرفان نفس کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔" ۵۲

خواجہ حسن نظامی کی تحریریں بہت ہیں۔ اور بعض موضوعات تو ایسے ہیں جن پر عام انشا پرداز قلم بھی نہیں اٹھاتا۔ حسن نظامی اصلاً ایک پیر تھے اور چونکہ خانقاہی نظام سے ان کا لگاؤ تھا۔ اس لیے

۵۱ آپ بیتی ۔ خواجہ حسن نظامی ۔ صفحہ ۴ دیباچہ
۵۲ آپ بیتی ۔ خواجہ حسن نظامی ۔ صفحہ ۱۲۴

یہ کتاب انھوں نے خاص طور پر اپنے مریدوں کے لیے تیار کی تھی اس کی تیاری میں ازابتدا تا انتہا مریدان کے سامنے رہے ہے۔ لیکن غیر مرید بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں خواجہ حسن نظامی نے اپنی ذاتی محنت سے ترقی کی تھی اس کے بے شمار جھلکیاں کتاب میں مل جاتی ہیں۔ زندگی کے بے شمار تجربات ہر صفحے پر بکھرے ہوئے ہیں۔

"سالہ ۱۹۱۱ء میں پورٹ سعید سے بمبئی آرہا تھا راستے میں طوفان آیا اور افسران جہاز نے خطرے کا اعلان کر دیا اور جان بچانے کی تدبیریں بتانی شروع کر دیں میرے قریب چند یہودی عورتیں بیٹھی تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگیں۔ مجھے ہنسی آ گئی کیونکہ ان کا رونا ہی کچھ اس قسم کا تھا ایک عورت نے مجھ کو ہنستا دیکھ کر کہا "تم کو اپنے مرنے کی خبر نہیں جو ہنستے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے معلوم ہے کہ جہاز خطرے میں ہے مگر میں ہنس کر مرنا چاہتا ہوں۔ اور تم رو کر مرنا چاہتے ہو۔ مرنا دونوں کو پڑے گا۔" [۵۱]

"بے خوفی کا سبق مجھ کو دمشق میں ملا تھا میں نے ایک بدو ترکی پولیس کا مقید دیکھا وہ سردار خوش اور بے فکر تھا میں نے پولیس سے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ اور اس کا جرم کیا ہے؟ اس نے کہا یہ ڈاکو ہے اس نے ریل کی

---

۵۱ خواجہ حسن نظامی۔ آپ بیتی صفحہ ۱۲۴

پٹریاں اکھاڑی تھیں اور ڈاکے بھی بہت مار چکا ہے اب
اس کو قتل کیا جائے گا۔ اور مجھے بھی بہت تعجب ہوا کہ
مرنے کو جاتا ہے اور خوش ہے۔ پولیس کی اجازت سے میں
نے بدو سے پوچھا کہ تم خوش معلوم ہوتے ہو۔ شاید تم کو
پھانسی پانے کی خبر نہیں۔ بدّو نے ہنس کر جواب دیا مجھے
معلوم ہے کہ کل دوپہر کو میں اس سامنے والے رسی کے پل پر
موت کی رسی پر لٹکا دیا جاؤں گا۔ مگر میں نے اپنے باپ
سے سنا ہے کہ خوشی کی ایک ساعت ہزار موتوں سے خریدی
جائے تب بھی سستی ہے پھر میں کئی ساعت کی خوشی
کو ایک موت کے ہاتھوں کیوں فروخت کروں۔[۵۱]

خواجہ حسن نظامی نے سفلی عملیات اور مسمریزم کی بھی مشق کی
تصوف کے تجربے بھی بیان کیے۔

اس کتاب کی ضخامت صرف ۱۴۴ صفحات کی ہے، لیکن ایک
اہم انکشاف خود صاحب کتاب نے یہ کیا ہے کہ انھوں نے اپنی
زندگی کے ہر اچھے برے واقعہ کو کتاب میں لکھ دیا ہے لیکن بہت
سے مریدوں نے برے واقعات کو شامل کرنے کی مخالفت کی۔
دوستوں میں خصوصیت کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریابادی۔ مُلّا
واحدی اور بھیّا احسان الحق اس بات کے حق میں تھے کہ سب
کچھ چھپے لیکن بالآخر اکبر الہ آبادی اور ایک عارفہ کے کہنے
پر "برے واقعات" حذف کر دیئے گئے۔

---

[۵۱] خواجہ حسن نظامی۔ آپ بیتی۔ صفحہ ۱۲۵

مرنے کے بعد شائع ہونے والی آپ بیتیوں میں دوستوں اور رشتہ داروں کی تحریف تو بالکل ممکنات میں سے ہے۔ لیکن مذکورہ واقعہ سے پتہ چلا کہ زندگی میں آپ بیتی چھپے تو بھی دیگر لوگ تحریف کرا سکتے ہیں۔ اور اگر متعلقہ لوگ ذکر نہ کریں تو پتہ چلنے کی بھی کوئی صورت نہ ہو گی۔

آپ بیتی قلم بند کرتے وقت خواجہ حسن نظامی کی عمر ۱۲ سال تھی اور وہ خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے ان کے دوست شیخ محمد احسان الحق نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے دیباچہ لکھنے میں کوئی تامل نہیں کیا ہے۔ اس کی اہمیت اس اعتبار سے اور بھی زیادہ ہے کہ وہ مصنف کی زندگی کے ہر پہلو سے بخوبی واقف تھے ـــــ ان کی رائے ملاحظہ ہو۔

"جو لوگ خواجہ صاحب سے عرصے سے دوستانہ یا نیازمندانہ تعلقات رکھتے ہیں وہ بلا تامل کہہ دیں گے کہ حالات مکمل نہیں ہیں اور ان میں کچھ قطع و برید بھی ہوئی ہے اور یہی میرے نزدیک آپ بیتی میں وہ سب سے بڑا نقص ہے جس نے گو اس کی نفع رسانی اور دلچسپی پر زیادہ مضر اثر نہیں ڈالا۔ لیکن اس کے موضوع تالیف یعنی تاریخی اہمیت کو گھٹا دیا میں مانتا ہوں کہ یہ حالات موجودہ بھی خواجہ صاحب نے عیب نمائی میں بہت غیر معمولی جرائت اور صداقت سے کام لیا ہے اور آج کل ان کی حیثیت کے کسی شخص

سے اتنی جرأت اور صداقت کے" اظہار کی بہت کم توقع ہوسکتی ہے لیکن میں آپ بیتی کو بہت زیادہ قابل قدر بلکہ دنیا کی ایک بہترین کتاب سمجھتا اگر وہ حصے بھی جو مسودے سے خارج کر دیے گئے ہیں ان میں شائع کیے جاتے مشہور لوگوں کو اسے پڑھ کر سوانح عمریاں خود لکھنے کا شوق پیدا ہوگا۔" [1]

---

[1] خواجہ حسن نظامی ۔ آپ بیتی ۔ دیباچہ

تذکرہ

(مولانا ابوالکلام آزاد)

۱۹۱۹ء

کم و بیش اس زمانے میں جب خواجہ حسن نظامی اپنی آپ بیتی مرتب کر رہے تھے یا مرتب کر چکے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم کی سحر کاری اور ان کی علمیت ملک بھر میں مشہور ہو چکی تھی ہر چند کہ خود نوشت سوانح حیات کی روایت اس وقت اردو میں عملاً مفقود تھی کم از کم ایک صاحب ایسے ضرور تھے جنھوں نے مقدور بھر کوشش کر ڈالی کہ مولانا سے ان کے حالات زندگی لکھوا لیں لیکن ناکام رہے۔ یہ صاحب تھے فضل الدین احمد مرزا جنھوں نے مولانا کے رشحاتِ قلم کو یکجا کر کے "تذکرہ" کے عنوان سے شائع کیا۔

"اعتذار" کے ذیل میں مولانا نے اس کتاب کے لیے جو دیباچہ لکھا اس سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کے اپنے حالات ہیں۔ اعتذار والی تحریر اکتوبر ۱۹۱۹ء کی ہے جب مولانا کی عمر صرف تیس سال تھی

فضل الدین احمد کا مقدمہ کسی قدر مفصل ہے اور اس میں سنہ اشاعت ۱۹۱۹ء بتایا گیا ہے مقدمے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مرتب نے کیسا کیسا اصرار مولانا آزاد سے کیا کہ وہ خود اپنے قلم سے اپنے حالات زندگی قلم بند کر دیں لیکن مولانا نے اول تو کئی بار اپنی عادت کے مطابق مذاق میں بات ٹال دی اور پھر صاف صاف انکار کر دیا اور کہا کہ

"کتنی بزرگ اور عظیم الشان زندگیاں ہمارے سامنے ہیں جن کے سوانح اور حالات نہیں لکھے گئے ان کو چھوڑ کر میری زندگی کے حالات مرتب کرنا محض ایک تمسخر انگیز حرکت ہو گی۔" [۵۱]

تذکرہ کے ابتدائی حصے میں مولانا نے اپنے خاندان کا تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ کیا ہے مولانا لکھتے ہیں کہ

"اگر خاندان واقعی کوئی فخر و شرف کی چیز ہے تو یہ واقعات کچھ نہ کچھ وزن ضرور رکھتے ہیں۔" [۵۲]

لیکن فوراً یہ صفائی بھی پیش کر دیتے ہیں کہ

"ایک لمحے کے لیے بھی طبیعت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ نسب فروشی کی دوکان آراستہ کر کے نقد عزت و شرف کی جستجو کی جائے۔" [۵۳]

مولانا آزاد کی تصنیف "تذکرہ" کو اگر ہم آپ بیتی کے ذیل

---

۵۱ تذکرہ۔ مولانا آزاد صفحہ ۱۴

۵۲ تذکرہ۔ " " صفحہ ۲۴

۵۳ تذکرہ۔ " " صفحہ ۲۴

معنوں میں دیکھیں کہ آپ بیتی صرف اپنی ذات کے تجربات تک محدود نہیں ہوتی ہے بلکہ ایک فرد کی شخصیت مزاج و اطوار میں کئی نسلوں کے تجربات کا نچوڑ ہوا کرتی ہے۔ تو یقیناً آزاد کے تذکرے کو ہم ایک اچھی خود نوشت سوانح کہہ سکتے ہیں۔ مولانا نے تذکرہ میں اپنے اسلاف" ارباب صدق و صفا" کا تصور حیات بہت تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ ہندوستان اور حجاز کے تین مختلف اصحاب ارشاد و ہدایت کی کہانی ہے۔ جس کے اسلاف کرام کے اعمال صالحہ کا پاک ورثہ یکے بعد دیگرے اخلاف تک منتقل ہوتا آیا ہے۔

"یہ انھیں لوگوں کی داستان حیات ہے جنھوں نے کانٹوں کے فرش کو اپنے عقیدے اور تخیل کی مدد سے نہ صرف شبستان راحت بنا لیا بلکہ جن کی ساری زندگی سچائیوں کے اعلان اور توسیع حیات میں گزری اور جنھوں نے اپنی طبع شورش آشنا اور فطرت جنون دوست کے ساتھ ابوالکلام آزاد کو عقیدت کی استواری اور ضبط و انقیاد کی محکمی بھی عطا کی۔"[51]

در اصل اسلاف کی زندگی وہ سانچہ تھی جس میں مولانا کی اپنی زندگی ڈھالی گئی۔ اسی لیے مولانا نے اپنی سوانح حیات سے زیادہ صفحات علمائے حق کی سوانح حیات میں صرف کیے ہیں ۔۔۔ مولانا نے اگر اپنا تذکرہ چھیڑا بھی ہے تو استعارات اور

---

[51] ابوالکلام آزاد فکر و فن۔ ملک زادہ منظور احمد صفحہ ۲۴۵

کنایات کے پیرایے میں شاعرانہ اسلوب کے ساتھ۔ وہ بھی کچھ اس خوب صورتی کے ساتھ کہ پڑھنے والے کی توجہ مولانا کی ذات سے ہٹ کر ان کی طرز تحریر کی دلچسپیوں میں کھو جاتی ہے تذکرے کے آخری ابواب میں مولانا نے اپنی ذات پر قلم اٹھایا ہے۔ کیونکہ تذکرے کے ناشر فضل الدین احمد مرزا مولانا سے اسی حصہ کو قلم بند کرانے پر زیادہ مصر تھے۔ روشن دلان سلف کا تذکرہ اور آثار و مناقب سے زیادہ ان کی دلچسپی مولانا کی خود نوشت سوانح حیات میں تھی۔ مولانا نے ان کے اصرار پر یہ حصہ لکھا تو ضرور مگر اپنی ذات کو شاعرانہ اشارات کے مزین پردوں میں اس طرح چھپایا ہے کہ مادی زندگی کسی حد تک موضوع کلام سے بالکل خارج ہو گئی ہے۔

"جتنی زندگی گزر چکی ہے گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک نمود غبار سے زیادہ نہیں اور جو کچھ سامنے ہے وہ بھی جلوہ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ قلم درماندہ تذکرہ و نگارش سے عاجز اور فکر گم گشتہ، حیران اظہار و تعبیر اپنی سرگزشت اور روداد عمر لکھوں تو کیا لکھوں؟ ایک نمودِ غبار و جلوہ سراب کی تاریخ حیات قلم بند ہو تو کیونکر ہو؟ دریا میں حباب تیرتے ہیں۔ ہوا میں غبار اڑتا ہے طوفان نے درخت گرا دئے سیلاب نے عمارتیں بہا دیں۔ مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے تنکے تنکے جمع کئے۔ خرمن و برق کا معاملہ۔ آتش و خس

کا افسانہ۔ ان سب کی سرگزشتیں لکھی جا سکتی ہیں تو لکھ لیجئے۔ میری پوری سوانح عمری بھی انھیں میں مل جائے گی۔ نصف افسانہ امید اور نصف ماتم یاس ہے[1]
شاعرانہ اشاریت سے لبریز ان پوری دو فصلوں میں جس میں خرمن و برق کا معاملہ اور آتش و خس کا افسانہ بیان کیا گیا ہے اگر مولانا کی مادی زندگی کے بارے میں کوئی واضح تفصیل ملتی ہے تو محض اتنی ہے کہ

"غریب الدیار و نا آشنائے عصر، بیگانہ خویش نمک پروردۂ ریش، معمورۂ تمنا و خرابہ حسرت کہ موسوم بہ احمد مدعو با بی الکلام ہے ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ ہستی عدم سے اس ہستی عدم نما میں وارد ہوا والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا اور مصرعہ ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا[2]

جواں بخت جواں طالع جواں باد

آبائی وطن دہلی مرحوم ہے مگر مادری وطن سرزمین مطہر طیبہ و دار الہجرت سید الکونین و شہرستان نبوت و وحی ہے"[3]

مولانا نے مشاہدہ حق کی گفتگو بادہ ساغر کے پردوں میں ضرور

---

[1] تذکرہ	ابوالکلام آزاد	صفحہ ۲۹۹
[2] تذکرہ	ابوالکلام آزاد	صفحہ ۲۹۷
[3] تذکرہ	ابوالکلام آزاد	صفحہ ۲۹۸

کی ہے مگر ان کی انانیت کے جذبے سے لبریز انفرادیت کا احساس رکھنے والی شخصیت ایک ایک لفظ سے چھلکتی ہے۔

"جس حال میں رہے نقص و ناتمامی سے دل کو ہمیشہ
گریز رہا اور شیوہ تقلید و روش عام سے پرہیز جہاں کہیں
رہے اور جس حال میں رہے کبھی کسی دوسرے کے نقش قدم
کی تلاش نہ ہوئی۔ اپنی راہ خود نکالی اور دوسروں کے لیے
اپنا نقش قدم رہنما چھوڑا رندی اور ہوسناکی کا عالم رہا
تو اس کو بھی ناتمام نہ چھوڑا۔ عشق کی خود فراموشیاں
رہیں تو وہاں بھی کسی وادی اور گوشے سے اپنے قدم
ناآشنا نہ رہے"۔ [1]

تذکرہ کا بہ حیثیت سوانح حیات جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد اپنے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں۔

"جب ہم مولانا کے تذکرہ کا بحیثیت خود نوشت سوانح حیات
کے جائزہ لیتے ہیں —— تو ابتدائی حصے میں شیخ جمال الدین
کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے اس عہد کے پیچ در پیچ
واقعات کا سلسلہ اس قدر طویل کر دیا ہے کہ خود شیخ
موصوف کی شخصیت دب کر رہ گئی ہے اور تھوڑی دور
آگے چل کر قاری یہ بالکل فراموش کر دیتا ہے کہ آخر اس
سرگزشت کا مرکزی کردار اور بنیادی موضوع کون سی
ذات یا کون سی بات تھی ——" [2]

---

[1] تذکرہ۔ مولانا ابوالکلام آزاد ص ۳۱۳ [2] مولانا آزاد فکر و فن ملک زادہ منظور احمد ص ۲۸۷

مصنف نفس مضمون سے دور واقعات اور حالات کے دھارے میں بہتا چلا جاتا ہے۔ ایک مسئلہ حل نہیں ہو پاتا کہ دوسرا مسئلہ در پیش ہو جاتا ہے۔ بات اتنی زیادہ پھیل جاتی ہے کہ آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے اور قاری کی نظر کسی ایک نقطے پر جم نہیں پاتی ہے۔ سوانح حیات کے نقطۂ نظر سے ایک اور چیز جو نظروں میں کھٹکتی ہے۔ وہ مولانا کا سبق سکھلانے اور تلقین کرنے کا مقصد ہے۔ کسی کہانی سے اگر از خود کوئی سبق مرتب ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ——— لیکن جب شعوری طور پر خیر و شر ظاہر و باطن سے نصیحتیں وضع کی جائیں تو قاری کی طبیعت الجھنے لگتی ہے اور وہ تاثر جو قاری پر خود بخود پیدا ہو جاتا ہے ——— زائل ہونے لگتا ہے، تذکرے کے حصے ادبی نگاہ سے ہمارے ادب میں خاصے کی چیز ہیں جذبات کی شدت، شاعرانہ رموز و علائم الفاظ کا خوب صورت آہنگ قاری کی توجہ کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ مگر یہ شاعرانہ انداز بیان آپ بیتی کی جرأت مندانہ بے باک حقیقتوں سے میل نہیں کھاتا ہے۔ آپ بیتی کے لیے حقائق کی ضرورت ہوتی ہے۔ خود نوشت سوانح نگار کو پہیلیاں بجھوانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مطلب کو چھپانا۔ رندی و ہوس پرستی کی کہانی پر پردے ڈالنا اور اس کی تاویل کرنا یہ باتیں اچھی نثر میں تو اضافہ حسن کر سکتی ہیں ۔ مگر واقعات کی تفصیل بیان نہیں کر پاتی ہیں

بقول ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد۔

"سوانح نگاری کی تاریخ میں یہ تجریدی آرٹ ہے یہ بذات خود مولانا کی داستان حیات کی تفصیل کو مرتب نہیں کرتی۔ ان کی روشنی میں ہم کو ان کی زندگی کے واقعات کی تلاش ہوتی ہے مگر وہ تذکرے کے صفحات پر نہیں ملتے یہ روشنی ہم کو ساتھ لے کر دوسرے دسیلوں کی طرف بڑھنا پڑتا ہے۔"[۵]

شائد اسی لیے تذکرہ کا مطالعہ اگر ایک طرف قاری کو مولانا آزاد کے منفرد طرز تحریر سے متعارف کراتا ہے۔ تو دوسری طرف اس کے دل میں یہ خیال بھی سر اٹھاتا ہے کہ مصنف میں اس اخلاقی جرائت کی کمی ہے جو بیرونی ملامت اور تحسین سے بے نیاز ہو کر ہر واقعہ کی صحیح صحیح نشان دہی کراتی ہے۔

---

[۵] مولانا ابوالکلام آزاد۔ فکر و فن ۔ ملک زادہ منظور احمد صفحہ ۲۹۳

اعمال نامہ

(سر سید رضا علی)

۱۹۴۳ء

بظاہر ایک طویل سکوت کے بعد بیسویں صدی کے دوسرے ربع کے آخری حصے میں ایک ایسی خود نوشت سوانح حیات زیور طبع سے آراستہ ہو کر لوگوں کے سامنے آئی جسے ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہوئی۔ یہ سر سید رضا علی کے حالات زندگی "اعمال نامہ" ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت کئی اعتبار سے ہے اس میں بڑی محنت منصوبہ بندی۔ باقاعدگی اور محنت کی چھاپ ملتی ہے۔ مصنف نے انگریزی کی خاصی تعلیم حاصل کی تھی، انھوں نے انگریزی آپ بیتیوں کا مطالعہ کیا تھا جس کا ذکر بھی اشارتاً کر دیا ہے۔

قدرے بڑے سائز کی ۵۲۷ صفحات پر پھیلی ہوئی اس کتاب کی اولین طباعت دسمبر ۱۹۴۳ء میں اس وقت ہوئی جب

دوسری عالم گیر جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اس خود نوشت کے دوسرے حصے کا مسودہ بھی بہت کچھ تیار ہو چکا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امتدادِ زمانہ اور مصنف کی موت نے مہلت نہ دی دوسرے حصے میں اپنی ذات اور دل کے معاملات کا تذکرہ کچھ زیادہ ہی تھا جس کی طرف انھوں نے اشارہ کر دیا تھا پہلا حصہ پڑھنے والا یقیناً دوسرے حصے کے دستیاب نہ ہونے پر تشنگی محسوس کرے گا۔

رضا علی نے اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "مغربی ممالک میں سوانح حیات لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ بیتی کے ساتھ ساتھ جگ بیتی بھی بیان کی جاتی ہے دنیا میں واقعات کا سلسلہ بسا اوقات ایسا مربوط ہوتا ہے کہ اپنی کہانی اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے جب دوسروں کے حالات بھی درج کیے جائیں میں نے اسی طریقہ پر عمل کیا ہے اس سلسلہ میں اور متعلقہ واقعات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔" [1]

یہ آپ بیتی ۱۱۴ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے اور تین سو سے کچھ زیادہ ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ خاندانی حالات، خاندانی منصوبہ بندی کی افادیت، مشاعروں میں ترنم اور تحت کی بحث اردو ہندی تنازعہ کی ابتدا، مشہور شعرا کے دواوین میں غلطیاں اور تصرفات، کتابوں کی صحیح کتابت اور طباعت، موازنہ انیس و دبیر

---

[1] رضا علی۔ اعمال نامہ دیباچہ (دہلی ۱۹۴۳ء)

رسوم محرم کی اصلاح۔ کان پور کی مسجد۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سیاسی اور سازشی پیچ و تاب اور بے شمار تذکرے بڑے دلچسپ انداز میں ملتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک جو کہ روسی انقلاب سے متاثر ہو کر ۱۹۳۰ء کے بعد کی دہائی میں خاصی پھیل چکی تھی اور نوجوانوں پر خصوصیت کے ساتھ اثر انداز ہوا تھا۔ اس کے بارے میں رضا علی نے اشارتاً اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی ہے ترقی پسندی کا وہ بطور تحریک کہیں ذکر نہیں کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ اعمال نامہ کی اشاعت کے وقت رضا علی کی زندگی کی شام ہو چکی تھی عمر ۶۳ سال ہو گئی تھی۔ ماضی بعید کے واقعات اور حالات میں وہ اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ ماضی قریب اور زمانہ حال کی طرف توجہ دینے کی انھیں فرصت نہیں ملی ۱۹۴۲ء کی تحریک جس نے انگریزی اقتدار کی چولیں ہلا دی تھیں اس کا ذکر سرسری طور پر کیا گیا ہے۔

رضا علی بنیادی طور پر وکیل اور سیاست داں تھے لیکن اردو ادب کا بڑا ستھرا مذاق رکھتے تھے جگہ جگہ انھوں نے اردو اور فارسی کے جو اشعار ٹانک دیئے ہیں وہ بہت خوب ہیں ادب پر انھوں نے آپ بیتی کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ لیکن اس کتاب میں جو بحثیں کیں ہیں وہ ان کی وسیع معلومات۔ مطالعے اور مشاہدے کے ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ سنجیدگی اور متانت کا دامن انھوں نے ہر جگہ تھامے رہنے کی کوشش کی ہے ایک ادبی جلسے میں شعر و شاعری کا دور چلنے کے بعد کچھ لوگوں نے غیر

عورتوں سے اپنی محبت کی ایک داستان سنائی۔ رضا علی اس نشست میں موجود تھے اور انھوں نے ان آپ بیتیوں کو تقریباً تیس صفحات میں جگہ دی ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ کہیں ابتذال کی پرچھائیں نہیں پڑی۔ کسی جگہ قلم کو لغزش نہیں ہوئی۔ مذہب سے گہرا لگاؤ ہونے کے باوجود رضا علی رندوں کی محفل میں بھی شریک ہوئے سنہ ۱۹۱۰ء کی الہ آباد میں ہونے والی نمائش کے موقع پر گوہر جان کے گانے کی خوبیوں کا جس انداز میں ذکر کیا ہے وہ بہت خوب ہے اور یہ تذکرہ اعمال نامہ کے سب سے جاندار ٹکڑوں میں سے ایک ہے۔

"ایک طرف چھوٹا سا چبوترہ تھا جسے دولہن کی طرح سجایا گیا تھا وہ اس چبوترے پر براجمان ہوتی اور لوگوں کو مسحور کرتی تھی ابھی گیت گا رہی ہے۔ "رام کرے کہیں نینا نہ انجھے ان نین کی بان بڑی ہے، ابجھے ینا سلجھائے نہ سلجھیں۔ رام کرے کہیں نینا نہ انجھے۔" پیت اور پیا دین اور نین کی یاد دلا کر کسی کو سکھی اور کسی کو دکھی بنا رہی ہو لوگ مگن ہیں مزے لوٹ رہے ہیں گنگا جی کے کنارے لوگ جی لبھا رہے ہیں عجب سماں بندھا ہو کہ گیت ختم ہوتے ہی غالب کی غزل شروع کر دی غالب کا کلام اور گوہر کی تانیں۔ یہ ہو ہی رہا تھا کہ گوہر کی نظر پنجابی پگڑیوں پر پڑی بھلا وہ اس لقمہ تر کو کہیں چھوڑنے والی تھی غزل ختم ہونے پر پنجابی گیت

شروع کردیا" کن مارے بینڑے نین دوڑیاں۔ چندنوں نے چھپ لینڑے دے اتم چھت پر مجھ کو کنکریاں مارتے ہو زرا چاند تو کو چھپ جانے دو) دھڑا دھڑ ٹرے اور ڈال گیت میں آرہے ہیں۔ لکھنؤ کے نازک مزاج حضرات کانوں میں انگلیاں دے رہے ہیں مگر گوہر کی ٹرے پنجاب کے دلوں پر خنجر چلا رہی ہے۔ اس کی ڈال کے آگے ہر بلند قامت پنجابی کی کمر خمیدہ ہے ایک گیت ایسا گایا کہ ہیر اور رانجھے کے حسن و عشق کی جیتی جاگتی تصویر سب کی آنکھوں میں پھر گئی سرحدی صوبے کے کلاہ و لنگی والے اصحاب اور ہینگ بیچنے والے خان بھی موجود تھے۔ ملک کے صدہا فارسی دانوں کی چشم شوق گوہر کے چہرے پر لگی ہوئی تھی گوہر نے ترچھی نظروں سے ان حضرات کو دیکھا اور فارسی غزل گانا شروع کردی ۔ از پنجہ من چاک گریباں دارد سپید تھے سروں میں اس لیے گارہی ہے کہ الفاظ صاف طور پر سمجھ میں آئیں مگر جہاں تان لیتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ قریب میں کہیں بجلی گری ہے ہر شخص چاہتا ہے کہ گانے کا ۔

دور چلے دور چلے ساقیا

اور چلے اور چلے ساقیا"[1]

---

[1] اعمال نامہ .. .. .. صفحہ ۲۹۴

سر سید رضا علی نے اردو ادب کا ہی نہیں بلکہ انگریزی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا اور انہیں اندازہ تھا کہ خود نوشت صرف یادداشتوں اور واقعات کی فہرست کا نام ہی نہیں ہے بلکہ اس میں سچائی اور حقیقت نگاری کا ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے تاکہ وہ "نامہ اعمال" کی طرح بے لاگ ہو اور لکھنے والے کو آنکھ نیچی نہ کرنی پڑے۔

خود نوشت لکھنے کے محرکات پر رضا علی نے مندرجہ ذیل الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

"اردو میں آپ بیتی لکھنے کا رواج نہیں ہے جو انگریزی داں حضرات سیاسی جھکے کے باعث اپنے حالات لکھتے ہیں وہ انگریزی میں خامہ فرسائی کرتے ہیں اور جن نامور انگریزوں نے اپنے حالات خود اپنے قلم سے لکھے ہیں ان کتابوں کو اپنے لیے بہترین نمونہ سمجھتے ہیں۔ پہلے میرا بھی قصد تھا کہ یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھوں اور اگر میرا مقصد صرف سیاسی دریا میں غوطہ لگانا ہوتا تو غالباً اپنے خیالات انگریزی ہی میں قلم بند کرتا مگر غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہونچا کہ ملکی زندگی کا دائرہ سیاست کے حلقے سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ جزو ہمیشہ کل میں داخل اور شامل ہوتا ہے لہذا مناسب یہ ہے کہ اپنے زمانے کی ملکی زندگی کی تصویر اپنے اہل ملک کی خدمت میں پیش کر دوں۔ سیاسی مسائل کے نقش و نگار آپ ہی اس میں آجائیں گے۔

اردو کو میں نے انگریزی پر اس لیے ترجیح دی ہے کہ ہر
قوم کی تہذیب و شائستگی اور اس قوم کی زبان کا چولی
دامن کا ساتھ ہوتا ہے ملکی رسم ورواج۔ معاشرتی حالات
ادبی نکات مذہبی مسائل۔ حسن و عشق کی کش مکش نامرادوں
کی تمناؤں۔ بے پڑھے لکھوں کی بے زبان آرزوؤں مفلسوں
اور ناداروں کے خاموش آنسوؤں کا بیان اردو میں
ہی ہو سکتا ہے۔ جو ملک کی سب سے بڑی سب سے
جامع اور سب سے زور دار زبان ہے —— انگریزی
میں ان سب باتوں کا لکھنا اَنمل، بے جوڑ۔ اور بے تُکا
ہوتا ہے" [1]

اعمال نامہ کے پڑھنے سے رضا علی کی ازدواجی زندگی کے
بارے میں یہ تاثر ملتا ہے کہ رضا علی کی پہلی شادی خوش گوار اور
کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ اس شادی یا اس کے بعد کی زندگی
کے تذکرے میں کسی قسم کی گرم جوشی نہیں ملتی ہے۔ بیگم رضا
علی کی کہیں کہیں تعریف ضرور ملتی ہے مگر وہ امنگ اور ترنگ
مفقود ہے جو ہونی چاہیئے۔

اس کے برخلاف رضا علی نے اپنی دوسری بیوی لیڈی
رضا علی کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے اس سے یہ فرق بہت نمایاں
ہو جاتا ہے دونوں بیویوں کی تصویریں کتاب میں دی گئی ہیں
—— دونوں بیویوں میں صورت کے اعتبار سے جو فرق تھا ممکن ہو

---

[1] اعمال نامہ۔ سر رضا علی۔ صفحہ ۳۹۳ تا صفحہ ۳۹۴

کہ اس فرق کو نمایاں کرنے کی یہ ایک غیر شعوری کوشش ہو ــــ پہلا نکاح ۱۸ سال کی عمر میں اور رخصتی ۲۰ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ دوسری شادی پہلی بیوی کے انتقال کے تین سال بعد جب رضا علی کی عمر ۵۶ سال ہوئی تھی۔ پہلی بیوی کی وفات کا ذکر بہت سپاٹ لہجے میں کیا گیا ہے۔ لیکن دوسری بیوی کی وفات کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے جیسے سب کچھ لٹ گیا ہو ــــ لیڈی رضا علی سے انھیں جنون کی حد تک محبت تھی اس قسم کے جنون کے بارے میں ان کی جو رائے ہے اس کی تقریباً پوری نفی انھوں نے اپنی دوسری بیوی کے انتقال کے تذکرے میں کی ہے۔ پہلے کے اصول ملاحظہ ہوں :۔

"ــ میں ایشیائی محبت یعنی معشوق کی بے ملکی جفا اور عاشق کی مجنونانہ وفا کا قائل نہیں ہوں نہ میرے نزدیک اس وفا اور جفا کا وجود ایرانی شاعروں کے تخیل کے سوا دنیا میں کہیں تھا نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ چچا قیس اور بھائی فرہاد کے نام لیوا اگر زمانے میں کچھ ہوں تو ان کے لیے پاگل خانے موجود ہیں ــــ"[1]

اب درج ذیل ذکر کو اوپر ظاہر کی ہوئی رائے کی کسوٹی پر پرکھئے

لیڈی رضا علی مرحومہ

شکوہ کروں ترا کہ شکر ہائے رے التفات دوست
جو نہ کہیں بھی جھک سکا تو نے وہ سر جھکا دیا

---

[1] اعمال نامہ ــ سر رضا علی ــ صفحہ ۳۹۴ ــ صفحہ ۳۹۵

اس کتاب میں دل کا سب سے بڑا معاملہ درج ہے جنوبی افریقہ دوسری مرتبہ ۱۹۳۵ء میں گیا تین سال وہاں رہا وہاں پہونچے دو ماہ گزرے تھے کہ مس پونو وبلو سامی کا (بعد کو لیڈی رضا علی ہوئیں) کمبری میں مہمان ہوا اور میں نے شادی کا تہیہ کر لیا۔ لیڈی صاحبہ کے حالات لکھنے کے لیے کتاب چاہیے ان کو مجھ سے اور مجھ کو ان سے عشق تھا وہ آج دنیا میں نہیں ہیں مگر یہ مصداق مصرعہ

ع شور بلبل کم نہ گردد گر رود گل از چمن

جو پھول وہ مجھے شادی سے قبل روزانہ کمبری سے ڈربن بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا کرتی تھیں۔ ان کی سوکھی پتیوں سے (جو اب تک میرے پاس موجود ہیں اور جب تک زندہ ہوں گا محفوظ رہیں گی) وہ میرے لیے اجرام فلکی کا آفتاب تھیں جس پر میری نظر اس لیے پڑی تا کہ جنوبی افریقہ کے زمانہ قیام میں میری نظر چھوٹے چھوٹے تاروں پر نہ پڑے میں کمبری کو اپنی دنیائے عشق کا کعبہ سمجھتا ہوں جس نے مجھے عمل سفلی یعنی ناپائیدار محبت کی زنجیروں سے رہائی دلا کر اسم اعظم سکھایا مئی ۱۹۳۵ء میں کمبری پہونچ کر میری حالت بقول مرزا رسوا لکھنوی یہ ہوئی۔

کعبے میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی
ایمان بچ گیا میرے مولانے خیر کی

ؔ اعمال نامہ سر سید رضا علی صفحہ ۳۹۴ و صفحہ ۳۹۵

لیڈی صاحبہ کے انتقال کے بعد اب اپنا یہ حال ہے۔

میں بلبل نالاں ہوں اس اجڑے گلستان کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے۔" [1]

اس جگہ مجتبیٰ حسین کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کر دینا مناسب ہوگا۔

"—— اعمال نامہ کے اصلی وصف کے باوجود بعض مقامات پر بڑی تشنگی محسوس ہوتی ہے اور ہماری توقعات پوری نہیں ہوتی ہیں مثلاً بعض سیاسی اکابر کے حالات میں تفصیل سے کام لیا گیا ہے مگر بعض ادیبوں کے بارے میں صرف چلتے ہوئے جملے ہیں —— شاد عظیم آبادی اور امداد امام اثر ایسی شخصیتیں نہیں ہیں جن پر دو جملے لکھ کر کوئی آگے بڑھ جائے ہر چند لکھنے والے سے اس کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ پڑھنے والے کی مرضی کے مطابق لکھے لیکن ان کی ادب دوستی کو دیکھتے ہوئے ہم جائز طور پر یہ توقع کر سکتے ہیں کہ شاد عظیم آبادی اور امداد امام اثر کے بارے میں وہ کچھ لکھتے یہ مطالبہ اس لیے اور بھی ہو کہ ان کو ایسے مواقع حاصل تھے کہ وہ ان حضرات سے اچھی طرح واقف ہو سکیں اسی طرح نئے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں ان کے قلم سے دو جملے بھی خیر کے نہیں نکلے۔ حالانکہ بہت سے مشاعروں کی صدارت وہ کر چکے

---

[1] اعمال نامہ — سر سید رضا علی — صفحہ ۳۹۴

تھے۔ بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے ان کے تعلقات
قریبی اور مخلصانہ رہی ہوں گے مگر سید صاحب نے
اردو ادب کے جدید دور کو اعمال نامہ میں جگہ نہ دی۔"[۵]
آپ بیتی کے لیے رضا علی کے رہبر اصول کیا تھے؟ اس کی صراحت
انھوں نے اعمال نامہ کے دیباچہ میں ان الفاظ میں کی ہے
"میں نے یہ تہیہ کیا ہے کہ حالات کو اصلی صورت میں
پیش کروں گا اور موجودہ فن تجدید شباب Rejuvenation
کے ماہروں کی طرح یہ جائز نہ رکھوں گا کہ آنکھیں ماتھے
پر پہونچ جائیں نیچے کا ہونٹ تھوڑی پر پڑا ہو یا دونوں
کان گلے کا ہار ہو جائیں حقیقت نگاری بڑا مشکل کام
ہے بالخصوص جب انسان خود اپنی کہانی لکھنے بیٹھے میری
تمام تر کوشش یہی رہی ہے کہ انصاف سے کام لوں
کسی تصویر کا رنگ پھیکا اور گہرا نہ پڑنے پائے ـــ اگر
خود ہی بے ڈول یا نک سک سے درست نہ ہو تو میرا قصور
نہیں ـــ با دل ناخواستہ مجھے ایسے واقعات بھی لکھنے
پڑے جن کے ظاہر نہ کرنے سے میں اخفائے حق کا ملزم
قرار پاتا۔ اپنی زندگی یا اپنے واقعات لکھنے پر کوئی
انسان مجبور نہیں ہے البتہ ہر شخص کو دو باتوں کا خیال
ضرور رکھنا چاہیے ایک یہ کہ سچے واقعات پورے طور
پر بیان کیے جائیں اخفائے حق نہ کیا جائے اور نہ کوئی

[۵] ادب اور آگہی مجتبیٰ حسین صفحہ ۳۰۶ تا صفحہ ۳۰۸

بات ادھوری چھوڑ دی جائے۔ دنیا میں وہ سچی بات بڑی مخدوش ہے جو آدھی کہی جائے اور آدھی چھپا ڈالی جائے۔" [51]

"میرے نزدیک اپنے لکھے ہوئے سوانح حیات کی سب سے بڑی صفت یہ ہونی چاہیے کہ ایک مرتبہ کراماً کاتبین بھی سامنے آکر یہ آواز بلند پڑھ لیں تو لکھنے والے کو آنکھ نیچی نہ کرنی پڑے۔" [52]

آپ بیتی لکھتے وقت رضا علی کا خیال ہے کہ

"انگریزی مثل کہ خواہش تخیل کی ماں ہے اپنے اوپر صادق نہ ہونے پائے اگر خواہش نے تخیل پر غلبہ حاصل کر لیا اور لکھنے والے نے واقعات کی صورت مسخ کر دی تو آپ بیتی نامۂ اعمال کے بجائے افسانہ یا ناول بن جائے گی۔" [53]

رضا علی نے ابتدا میں بتایا کہ ان کے پاس بہت سی یادداشتیں اور روزنامچے موجود تھے ان کے ہی سہارے اور یادداشت کے زور پر انھوں نے "اعمال نامہ" کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی۔ اسے لکھتے وقت ان کے ذہن میں شاید اس خیال کا گزر نہ ہوا ہو کہ ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جب ان کی اس تصنیف کو

---

51 اعمال نامہ سرسید رضا علی صفحہ ح (دیباچہ)
52 " " " "
53 " " " "

آپ بیتیوں میں اہم مقام حاصل ہو گا۔ رضا علی کو اس کا اعتراف ہے کہ

"انسان کی فطری خواہش ہے کہ اس کا نام ہو۔"

لیکن اپنی آپ بیتی میں انھوں نے عاجزی اور انکسار سے کام لیا ہے۔

آپ بیتی

(ظفر حسن ایبک)

ظفر حسن ایبک کی "آپ بیتی" میں سفرنامے کا لطف ہے اور فوجی معرکوں کی دلچسپی بھی۔ ترکی کے خلاف انگریزوں کی یورش سے برہم ہو کر وہ ایسے وقت میں جب ان کی عمر صرف بیس سال تھی اپنے ایک درجن اسکولی ساتھیوں کے ہمراہ ہندوستان سے چل پڑے تھے تاکہ ترک فوجوں کو اپنے طور پر جو کچھ ممکن ہو مدد دے سکیں۔

ہجرت کا واقعہ ۱۹۱۵ء کا ہے۔ ۳۴ سال بعد جب ۱۹۴۹ء میں واپس لاہور آئے تو لوگوں نے اصرار کیا کہ اپنے حالات قلم بند کریں ان کو تامل تھا۔ لیکن حالات اتنے دلچسپ اور ولولہ خیز تھے کہ دوستوں کا اصرار بڑھتا گیا بالآخر انھوں نے اپنے حالات اردو میں لکھے۔ حالانکہ ترکی فوج میں آرٹیلری کیپٹن کے منصب سے ریٹائر ہونے کے بعد ظفر حسن نے استانبول (ترکی) کو اپنا

وطن بنا لیا۔ اور وہیں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی۔
اس آپ بیتی کی تحریر کے سب سے بڑے محرک شریف الحسن تھے۔ ظفر حسن کی آپ بیتی کے پہلے حصے کا مقدمہ بھی شریف الحسن صاحب نے لکھا ہے۔ شریف الحسن نے مقدمے میں آپ بیتی کے بارے میں لکھا ہے۔

"آپ بیتی کا پہلا حصہ قارئین کی ضیافت طبع کے لیے پیش ہے جو دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی ظفر حسن صاحب نے مولانا عبیداللہ سندھی کی صحبت میں گیارہ سال افغانستان روس اور ترکی میں بسر کیے مولانا سے سیاسی تربیت حاصل کرنے کے علاوہ تفسیر قرآن اور فلسفہ کا درس لیا۔ مولانا مرحوم نے افغانستان کے متعلق اپنی مطبوعہ ذاتی ڈائری میں بتقاضائے مصلحت بعض امور سے پردہ پوشی کی تھی کیونکہ اس وقت تک انگریز ہنوز ہندوستان پر حکمران تھے ظفر صاحب نے حصہ اول میں ایسے حقائق کی نقاب کشائی کی ہو جن سے اب تک خواص بھی باخبر نہیں تھے۔" [۵]

ظفر حسن ایبک کا آبائی وطن کرنال تھا۔ ۲۶ ستمبر سنہ ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے اپنی آپ بیتی میں اپنے بچپن کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے اس وقت کے سیاسی ماحول کا جائزہ لیا ہے

---

[۵] آپ بیتی۔ ظفر حسن ایبک صفحہ س "او دتع" دیباچہ از شریف الحسن اشرف پریس (لاہور) پاکستان

جس سے ان کے نوجوان ذہن نے گہرا اثر قبول کیا تھا۔ اسی سلسلے میں اپنے ذہنی سفر کے بارے میں لکھتے ہیں

"جنگ بلقان کی خبریں اکثر بحث میں آیا کرتیں اور ہم سب ترکوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا کرتے ہمارے اس زمانے کے قومی اور مذہبی خیالات کی نشو و نما میں محمد علی جوہر کے انگریزی ہفتہ وار "کامریڈ" اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ہفتہ وار "الہلال" اور "البلاغ" کا بہت اثر ہوا انھیں اخبارات کے مقالوں نے ہمیں ترکوں کا گرویدہ بنالیا ـــــ انگریزوں کے خلاف بھی ہمیں انھیں تحریروں نے ابھارا اور ہم میں قومی جذبات بھی انھیں جریدوں نے پیدا کیے ــ" [۵۱]

جنگ بلقان کے خاتمے کے بعد مسلمان طالب علموں میں انگریزوں کے خلاف جذبات میں شدت آگئی تھی اور طالب علموں کی یہی خواہش تھی کہ انگریزوں کے خلاف کوئی کارروائی کرسکیں۔ اسی زمانے میں نبگالیوں نے اپنی تحریک میں بموں کا استعمال کیا تھا۔ مسلم طالب علم بھی چاہتے تھے کہ کسی قیمت پر بم حاصل کریں لیکن نبگالیوں سے بم ملنے کی امید نہ تھی۔

"ایک نوجوان مولانا ابوالکلام آزاد سے مدد حاصل کرنے کلکتہ بھیجا گیا۔ مولانا کا قتل و غارت گری کی ان کارروائیوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نوجوان خالی ہاتھ واپس آیا۔" [۵۲]

---

۵۱ آپ بیتی۔ ظفر حسن ایبک صفحہ ۱۱ ۵۲ آپ بیتی ظفر حسن ایبک صفحہ ۱۷

ایبک نے ہندوستانی مسلمانوں کی ان دو جماعتوں سے تعلق پیدا کرنے کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو اس وقت انگریزوں کے خلاف کام کر رہی تھیں۔

"انگریزوں کے پنجاب پر قابض ہو جانے کے بعد بھی یہ جماعت چندہ جمع کرنے اور نئے ممبر بنانے کی کوشش کرتی رہی چنانچہ اسی ذیل میں ہمارے رشتہ دار مولوی محمد جعفر صاحب جو تھانیسر ضلع کرنال کے رہنے والے تھے اس جماعت کے لیے خفیہ چندہ جمع کر کے سرحدی علاقوں کو بھیجا کرتے تھے ایک نوکر کی غداری کی وجہ سے انگریزوں نے ان کو کالے پانی جزیرہ انڈمان بھیج دیا بعد میں ملکہ وکٹوریہ کی تاج پوشی کی ساٹھویں سال گرہ پر ان کو رہائی ملی اور وہ کرنال آ گئے تھے۔ میں نے ان کو کئی دفعہ جب میں بہت چھوٹی عمر کا تھا دیکھا تھا۔ اور ان کو (چچا جی) کہہ کر پکارا کرتا تھا" [1]

مولانا جعفر تھانیسری سے قرابت داری سے ظفر حسن کے ارد گرد کے ماحول اور ذہنی رجحان کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے اس کتاب کے دو حصے دستیاب ہیں پہلے حصے میں اپنے بچپن کے واقعات اس زمانے کی سیاسی فضا کے پس منظر میں دہرائے گئے ہیں اور اس زمانے کے سیاسی رویے کا ذکر ہے۔ حصہ دوم میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی روس، افغانستان اور ترکی کی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔

---

[1] آپ بیتی۔ ظفر حسن ایبک صفحہ ۲۱

"پیش کش" کے عنوان سے آپ بیتی کے حصہ دوم میں اپنے استاد کو خراج عقیدت اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"میں کتاب کے اس حصے کو اپنے استاد محترم قبلہ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی مرحوم کے مرقد پر جن کی مذہبی اور سیاسی تعلیمات سے میں نے فیض حاصل کیا ہے بطور نذرانہ عقیدت چڑھاتا ہوں۔" لے

کم از کم اردو میں یہ ایک انوکھی اور اکیلی داستان ہے جس میں قاری ایک قوم و ملک کی محبت میں سرشار جانباز سپاہی کے ساتھ تحیر خیز تجربات کا سامنا کرتا ہوا روس افغانستان اور ترکی کا سفر کرتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک مجاہد کی کہانی ہے۔ اس میں سفر کا بیان زیادہ ہے اس لیے اسے آپ بیتی اور سفرنامے کی درمیانی چیز بھی کہہ سکتے ہیں

آپ بیتی کا طرز بیان سادہ اور عام فہم ہے۔ چونکہ مصنف کا اصل مقصد واقعات کا بیان ہے اس لیے وہ عبارت آرائی اور رنگین بیانی کے قریب ہی نہیں گئے ہیں۔ اسلوب سادہ مگر پر اثر ہے۔

لے آپ بیتی۔ ظفر حسن ایبک۔ انتساب۔ صفحہ نمبر نہیں ہے

خوں بہا

(حکیم احمد شجاع)

۱۹۴۳ء

حکیم احمد شجاع کی خود نوشت سوانح حیات "خوں بہا" کی سب سے زیادہ متاثر کن خوبی ان کی انکساری اور ایک ایک لفظ سے جھانکتا ہوا خلوص ہے۔ یہ دھیما دھیما مخلص طرز بیان مصنف کی شخصیت سے قاری کو متعارف کرنے کے لیے کافی ہے قاری کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ ایک محبت کرنے والا باپ، شفیق استاد، غم گسار دوست اور سعید شاگرد ہے۔

"خوں بہا" اگرچہ ایک ضخیم تصنیف ہے مگر آدھے سے زیادہ صفحات میں مصنف نے اپنے عقائد، افکار اور نظم و نثر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ "پچھلے پچاس برس" کے عنوان سے اپنے حالات زندگی بھی درج کیے ہیں۔ اپنے گزرے ہوئے شب و روز کو دہراتے ہوئے وہ کہیں بھی تنہا نظر نہیں آتے ہیں

دوستوں استادوں۔ بزرگوں اور رفیقوں کی یادیں ہر قدم پر ان کے ساتھ ساتھ ہیں۔

> "مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں بہت اجمال کے ساتھ وہ حالات اور واقعات بیان کر دوں جن کی بیل رواں کے ساتھ ساتھ میں اپنی عمر کے گزرے ہوئے زمانے میں بہتا چلا آیا ہوں۔ ان حالات کے بیان سے یہ مقصود نہیں کہ میں کسی ذاتی اہمیت یا شخصی فوقیت کے لیے بہانہ تلاش کروں۔ مدعا فقط یہ ہے کہ اس سلسلے میں ان نامور بزرگوں کا بھی ذکر کیا جائے جن کے فیض سے ازلی مناسبت کو اکتسابات دانش کی سعادت میسر آئی۔ [1]"

حکیم احمد شجاع کی داستان حیات کی خوب صورتی اس وقت اور بھی اجاگر ہوتی ہے جب قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ۲۶۸ صفحات کی اس تصنیف میں ایک بھی کلمہ ایسا نہیں ہو جس میں کسی کے لیے تحقیر یا تمسخر کا پہلو نکلتا ہو۔ ان کا محبت بھرا دل اپنے دوستوں۔ شاگردوں۔ عزیزوں۔ شناساؤں۔ نوکروں۔ شہروں اور ان کی مخصوص فضاؤں سے معمور ہے۔ علی گڑھ کا ذکر اس محبت سے کرتے ہیں کہ وہاں کے ایک ایک متنفس ایک ایک ذرے سے ان کی انسیت کا اظہار ہوتا ہے اپنے استادوں اور بزرگوں کا ہی نہیں احمد بخش حجام اور سوہن لال پوسٹ مین کا ذکر اسی تفصیل اور دلچسپی کے ساتھ

---

[1] خوں بہا۔ حکیم احمد شجاع۔ تعارف صفحہ ا تاج کمپنی۔ لاہور ۱۹۶۳ء (طبع اول)

کرتے ہیں۔

"احمد بخش حجام جنھیں سرسید کے بال تراشنے کا فخر حاصل تھا اب بھی اپنے اصلاحی کام میں بڑی چابک دستی سے مصروف رہتے تھے جب وہ میرا خط بنانے آتے تو خط بناتے بناتے ان اولڈ بوائز کی ساری داستان حیات سناتے جاتے تھے۔" ۵۱

"سوہن لال پوسٹ مین جب کسی اولڈ بوائے کو سرسید کورٹ میں دیکھ پاتا تو اسے اس کے نام سے ہی پکارتا۔ ظفر میاں۔ احسان میاں۔ آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ کل آئے گا۔ خدا جانے وہ ان اولڈ بوائز کو دیکھ کر پرانے زمانے میں زندگی بسر کرنے لگتا —— یا اس کا ذہن اس حقیقت کو ماننے سے انکار کرتا تھا کہ یہ اولڈ بوائز وہ لڑکے نہیں جنھیں سوہن لال جانتا تھا" ۵۲

"اب بھی ہم لوگ جب کالج جاتے ہیں تو سرسید کورٹ کے برآمدے میں احمد بخش کے ریزر تیز کرنے کی کھٹ کھٹ سنائی دیتی ہے" ۵۳

بچھڑے ہوئے ساتھیوں کی یاد اور ان کی جدائی کا شدید احساس ان کی تحریر کے تاثر کو دوچند کر دیتا ہے۔ مسعود ٹامی کی دلچسپ یادیں اس جملے پر ختم ہوتی ہیں۔

---

۵۱ خوں بہا۔ حکیم احمد شجاع۔ صفحہ ۲۳۶
۵۲ " " " صفحہ ۲۳۷
۵۳ " " " صفحہ ۲۳۷

"مسعود کی روح جنت الفردوس کی آسودگی میں اس درد سے تڑپ نہ اٹھے کہ ہم اسے اتنی جلدی بھول گئے" [۵۱]

یہ تمام ذکر محض ان لوگوں کی ہی ذات پاک تک محدود نہیں رہتے ہیں بلکہ اس سے خود ان کی شخصیت اور مزاج پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

حکیم احمد شجاع کی تحریر بڑی صاف شستہ اور دل نشین ہے سب سے زیادہ اس کی روح محبت نے اس کو ایک خاص سادگی دلکشی اور حسن دے دیا ہے۔ انھوں نے علی گڑھ کی زندگی اور وہاں کی روایتوں کا ذکر بڑی دل چسپی سے کیا ہے۔ علی گڑھ کا تذکرہ رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ مگر ان کے مقامی ذکر سے صرف مقامی لوگ ہی محظوظ ہو سکتے ہیں جو لوگ علی گڑھ کے ماحول اور فضا سے ناواقف ہوں وہ ان کی تحریروں سے اصلی لطف نہیں اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن حکیم احمد شجاع کی تحریر کا سادہ انداز بیان علی گڑھ کو علی گڑھ تک محدود نہیں رہنے دیتا ہے بلکہ ہر شخص اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

"خوں بہا" اپنی سادگی اور تاثر کی وجہ سے اردو کی آپ بیتیوں میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

---

[۵۱] خون بہا۔ حکیم احمد شجاع صفحہ ۳۰۸

یادِ ایام

(نواب چھتاری)

سنہ ۱۹۴۹ء

نواب ڈاکٹر سر حافظ محمد احمد سعید خاں آف چھتاری کو انگریزوں کے زمانے میں اعلیٰ اعزاز ملے۔ اور وہ مختلف اہم عہدوں پر فائز رہے۔ وہ اپنے تجربات اور مشاہدات پر مبنی بہت اچھی آپ بیتی لکھ سکتے تھے۔ لیکن "یاد ایام" عملاً واقعات کی ایک طویل فہرست ہے۔ یو پی کے وزیر۔ گورنر۔ حکومت ہند کے رکن۔ ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم کے ایسے بلند عہدوں پر انھوں نے کام کیا۔ ان کے متنوع تجربات اور گوناں گوں مشاہدات ایک خوبصورت آپ بیتی کی بنیاد بن سکتے تھے۔ لیکن اس آپ بیتی کے تمام تذکرے سپاٹ سے ہیں۔ تحلیل اور تجزیے کا کوئی عنصر ان میں نہیں ملتا ہے۔

"میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ اس غرض سے نہیں ہے کہ کسی دوسرے کے لیے مفید ہوگا میں تو اس کا قائل ہوں کہ ناد

فی صد حضرات اپنی ہی غلطیوں سے سبق حاصل کرتے
ہیں اور ایسے لوگ بہت کم ہیں جو دوسروں کی غلطی سے
سبق حاصل کرتے ہوں۔ پھر یہ کہانی ایسی دلچسپ
بھی نہیں ہو سکتی کہ پڑھنے والوں کے لیے باعث تفریح
ہو سکے۔ اس لیے آخر میں میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ
میری یہ خواہش دراصل اس بنا پر ہے کہ میرا دل چاہتا
ہے کہ عمر کی اس منزل پر پہونچنے کے بعد ایک نگاہ بازگشت
ڈالی جائے۔ اور ایام رفتہ کے تصور سے قلب میں ان
جذبات اور محسوسات کو ٹٹولا جائے جن سے زمانہ گزشتہ
میں میری زندگی متاثر رہی — زندگی میں ایسا موقع
ضرور آتا ہے۔ جب ہم آپ بیتے ہوئے زمانے کی دھوپ
چھاؤں سے گزرنے کی کوشش کرتے ہیں بغیر اس
خیال کے کہ اس سیر سے کیا حاصل ہوگا" [۵۷]

نواب چھتاری کو خود اس بات کا احساس تھا کہ خودنوشت
میں وہ رنگینی نہیں جو ہونا چاہیے۔ اس کے دو اسباب ہو سکتے ہیں
ایک تو یہ کہ تجربہ اور مشاہدے کے باوجود ادب ان کا موضوع
نہیں ہے۔ اس لیے طرز ادا اور انداز بیان کی خوبی مفقود
ہے۔ دوسرے ان کی پالیسی ہمیشہ صلح کل کی رہی — اس قسم کے
لوگوں سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ کوئی ایسی بحث چھیڑیں
گے جس سے نزاع کا ذرا بھی شائبہ ہو۔ یہی کیفیت "یاد ایام" میں

---

[۵۷] یاد ایام — محمد احمد سعید خاں چھتاری۔ صفحہ ۱۹

شروع سے آخر تک نظر آتی ہے۔

یادِ ایام اس بات کا ایک کامیاب ثبوت ہے کہ کبھی کبھی آپ بیتی اپنے کارناموں کو بیان کرنے کے ہی نہیں بلکہ ان کارناموں میں اپنی پوزیشن واضح کرنے کی بھی ایک صورت ہے جو آپ بیتی کے علاوہ کسی دوسرے پیرایۂ اظہار میں ممکن نہیں ہے۔

نقشِ حیات

(مولانا حسین احمد مدنی)

۱۹۵۲ء

مولانا حسین احمد مدنی کی خود نوشت سوانح حیات صرف مولانا کی سوانح حیات ہی نہیں ہے بلکہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے لے کر ان کے اقتدار کے خاتمے تک نمایاں واقعات کا مجموعہ ہے۔ اس تصنیف میں برطانوی حکومت کی تباہ کن ڈپلومیسی اور سیاسی مکروفریب کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

مولانا مذہب کے علاوہ سیاست میں بھی خاصے سرگرم تھے نقش حیات کی پہلی جلد کے ۳۴۰ صفحات میں اس بات کا مدلل جواب موجود ہے کہ مولانا جیسا صوفی منش۔ گوشہ نشین۔ اور درس و تدریس میں انہماک رکھنے والا شخص سیاست کے پرشور ہنگامہ آرا میدان میں کیسے داخل ہوا۔؟

آپ بیتی لکھنے کا موقع ۱۹۴۲ء میں نینی جیل الہ آباد میں نظر بندی کے دوران ملا۔ آپ بیتی لکھنے کی جو وجوہات بیان کی ہیں ان میں تحدیث نعمت کے علاوہ اسلاف کرام کا اتباع بھی مقصود ہے۔

"چونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ زمانہ ہائے سابقہ میں اسلاف کرام نے اپنی سوانح عمریاں خود لکھی ہیں اور زمانہ حال میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں اس کی بکثرت مثالیں پائی جاتی ہیں اور چونکہ آپ بیتی اور سرگزشت سے انسان جس قدر واقف ہوتا ہے دوسرا نہیں ہوسکتا ہے اس لیے کوئی وجہ اس تذکرہ کو ترک کرنے کی نہیں معلوم ہوتی ہے خصوصاً اس بنا پر کہ امید ہے کہ شائد لوگوں کو صحیح حالات معلوم ہونے کی بنا پر کچھ نفع پہونچے یا کم از کم وہ ان بدظنیوں اور بدگوئیوں سے پرہیز کریں جو دشمنانِ دین و مذہب نے اپنی خود غرضیوں کے تحت اور وہین پروپیگنڈے سے پھیلائی ہیں۔" [1]

کتاب کے ابتدائی صفحات میں اپنا اور اپنے خاندان کا تعارف کراتے ہوئے مولانا نے اپنی عالی نسبی پر بڑا زور دیا ہے اور اپنے خاندان سے متعلق تمام غلط فہمیوں کو دور کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ غیر اختیاری نعما رالیہ میں سے یہ بھی

---

[1] نقش حیات۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ صفحہ ۸ (مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی)

ایک بہت بڑی نعمت ہے یعنی جیسے کہ انسان کا پیدا ہونا۔ تمام اعضا کا صحیح و سالم ہونا خوبصورتی اور اعضا کا تناسب، ذکاوت اور حافظہ وغیرہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے ہیں جن میں بندے کے اختیار اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں اور ان پر بندے کو ہمیشہ شکر گزار رہنا چاہیے اور تحدیث بالنعمتہ کرنا اور دل میں سوچنا اور اللہ تعالےٰ کو شکر گزاری سے خوش کرنا چاہیے۔ اسی طرح یہ شرافت نسبی بھی ایک غیر اختیاری نعمت اور عطیہ خداوندی ہے اس پر شکر گزاری کرنا ضروری ہے۔" [51]

لیکن نسبی تفاخر کی بحث میں ہی ایک جگہ وہ اس نظریے کی مذمت کرتے ہیں اور صالح عمل پر زور دیتے ہیں۔

"فخر بالانساب جو کہ مسلمانوں میں ہر جگہ اور بالخصوص ہندوستان کے سادات۔ پیرزادوں اور شیوخ میں پایا جاتا ہے۔ نہایت جھوٹا تکبر اور بہت سی خرابیوں کا باعث ہے باوجودیکہ اسلام نے اس کی جڑ کھودنے میں کوئی کمی نہیں کی مگر بدقسمتی سے اس کا قلع قمع نہیں ہوا بلکہ ہندوستان میں آکر برادرانِ وطن کی دیکھا دیکھی اور بڑھ گیا۔" [52]

نقش حیات میں مولانا نے ۱۰۴ عنوانات قائم کیے ہیں لیکن

---

[51] نقش حیات صفحہ ۲۲

[52] " " ۲۲

ہر تذکرے میں انگریز حکومت کے خلاف جدوجہد کا تذکرہ حاوی ہے۔ شاید اسی جدوجہد کے تذکرے نے اپنی ذات کے بارے میں زیادہ لکھنے کی مہلت نہ دی۔ پہلی جلد کی آخری سطور میں یہ تڑپ اس طرح ظاہر ہوتی ہے۔

"یہی وہ امور تھے جنھوں نے مسلمانوں میں ایک تڑپ پیدا کردی۔ یہ تڑپ کیا تھی ایک درد تھا۔ پوری ملت کا ایک درد تھا جو اس کو گلوخلاصی پر مجبور کر رہا تھا۔ یہ ایک نیم بسمل قوم کی اضطراری حالت تھی۔ جس کا منشا یہ تھا کہ ملک اور ملت ان مصائب سے نجات پائے جن کے نشتر شب و روز جسد ملت کے ہر رگ و پے میں پیوست ہو رہے تھے"۔ لہ

مجاہد آزادی کے سینے میں جو آگ لگی ہوتی ہے وہی ان کے سینے میں دہک رہی تھی اور پوری کتاب اس کی حرارت سے متاثر ہے۔

ناقابل فراموش

(سردار دیوان سنگھ مفتوں)

دیوان سنگھ مفتوں نے اپنے حالات لکھنے کا سلسلہ اپنے مشہور پرچے "ریاست" میں شروع کیا تھا اور اس کے ایک حصے کی اشاعت کتابی صورت میں آزادی کے بعد ہوئی۔ "ریاست" میں "ناقابل فراموش" کا جو عنوان رکھا گیا ہے اسے کتاب کے لیے بھی برقرار رکھا گیا۔ کتاب مفتون کی پوری زندگی کا احاطہ نہیں کرتی ہے تاریخ اور سنہ کا ذکر بھی سلسلہ وار نہیں ہے اپنی تعلیم کا صرف درجہ پانچ تک ذکر کیا ہے۔ کچھ خاندانی حالات ہیں جن میں بچپا کو نکتہ چینی کا نشانہ بنا گیا ہے۔ خواجہ حسن نظامی پر اعتراض کیے ہیں۔

مصنف کی بنیادی اہمیت اس بات کی ہے کہ ان کے پرچے سے والیان ریاست کانپتے تھے۔ دیسی ریاستوں کے راجاؤں

مہاراجاؤں اور محل میں جو کچھ ہوتا تھا ان میں بعض بہت راز کی باتیں "ریاست" میں چھپ جاتی تھیں۔ ان سے تہلکہ سا مچ جاتا تھا اور بعض معاملات میں انگریز حکومت کو سخت کارروائی بھی کرنا پڑتی تھی۔ "ناقابل فراموش" میں زبان کا چٹخارہ شاید نہ ملے لیکن واقعات میں بڑی جان ہے۔ واقعات وہی ہیں جن میں مصنف کی بہت نمایاں حیثیت رہی ہے اور جن میں مصنف نے اہم کردار انجام دیے تھے۔ ان کو قتل کرنے کی بھی کوشش ہوئی مگر وہ بچ نکلے۔

۲۵۶ صفحات کی اس کتاب کو اس قسم کی آپ بیتی کے زمرے میں نہیں شامل کیا جاسکتا۔ جس سے مصنف باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے بچپن سے دم تحریر تک کے واقعات بیان کرتا ہے اور بہت سی صورتوں میں سنہ اور تاریخ بھی بتا دیتا ہے تاہم یہ ایک دل چسپ اضافہ ہے۔ ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر نے تعارف میں لکھا ہے۔

"کتاب دیوان سنگھ مفتوں کی برملا گوئی کی شاہد ہے ہندوستان میں برملا گوئی کا دستور عام نہیں ہے اور اردو نثر میں اس طرح کی تحریریں بہت کم ہیں جن میں زندگی کے حالات صاف صاف بیان کیے گئے ہوں۔ مفتوں کا طرز تحریر مصنوعی آرائش سے پاک ہے۔" [۵۱]

---

۵۱ ناقابل فراموش۔ دیوان سنگھ مفتون۔ صفحہ ۴

کھری کھری بات کھردرے لہجے میں صاف صاف کہتا ہے بے خوف و برملا کہتا ہے۔ اس کتاب کی ہر سطر دل چسپ ہے کیونکہ لکھنے والے دلچسپ بے حد دلچسپ انسان ہیں۔ البتہ ہر واقعہ کے بعد جو اخلاقی سبق نکالا گیا ہے وہ مجھے بوجھل معلوم ہوا میں اسے دیوان سنگھ مفتوں کی ذات سے باہر کی بات سمجھتا ہوں۔" [5]

دیوان سنگھ مفتوں کی تصنیف خود نوشت سوانح حیات کی سب سے اہم خوبی یعنی بے جھجک اظہارِ ذات پہ پوری اترتی ہے۔

---

[5] ناقابل فراموش۔ دیوان سنگھ مفتوں صفحہ ۶

مشاہدات

(ہوش بلگرامی)

سنہ ۱۹۵۵ء

نواب ہوش یار جنگ کی سوانحی یادداشت "مشاہدات" کے عنوان سے سنہ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی وہ حیدر آباد کی زندگی میں سیاسی کروٹوں کا زمانہ تھا۔ چونکہ ہوش یار جنگ کا دربار سے قریبی تعلق رہا تھا اس لیے اس واقعے کو انھوں نے بڑی شدّت سے محسوس کیا۔

یہ کتاب ۲۱ عنوانات پر مشتمل ہے اس میں اگرچہ ہوش نے اپنے بچپن اور مذاہبی مسلک پر بھی بات کی ہے مگر اس کتاب کا اصل موضوع حیدر آباد کی سیاست ہی ہے بعض مضامین میں غلط فہمیاں دور کر کے صحیح صورت حال سے آگاہ کیا ہے اور کسی باب میں ان پوشیدہ حقائق کی پردہ کشائی کی ہے جن سے بہت ممکن ہے کہ لوگ کبھی آگاہ ہی نہ ہو پاتے۔ مذکورہ کتاب

کے وجود میں آنے کی وجہ بھی اس وقت کی سیاسی زندگی سے پیدا ہونے والے تاثرات ہیں۔

"پولیس ایکشن (۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء) کے بیسویں دن (۲ اکتوبر ۱۹۴۸ء) سے درباری مصروفیتیں بھی ختم ہوگئیں خدمت سے سبک دوش ہونے کے بعد نہ اہل غرض سرفراز منزل کا چکر لگاتے اور نہ شاہی پردے کے تعلق سے مصنوعی اخلاق کا مظاہرہ کرنے آتے تھے ——چونکہ زندگی کا بڑا حصہ درباری اور دفتری مصروفیتوں میں گزرا تھا اس لیے آزادی کی نوید نے ادبی زندگی کی یاد دلا دی مطالعہ کی پچھلی عادت کو تازہ کیا گیا چھوٹی ہوئی تحریری مشق کو اعتدال پر لایا گیا—— تاکہ حیدرآباد کے ہی نہیں بلکہ ہند کے شکست خوردہ انسانوں کے اضمحلال کو دور کیا جاسکے ان کے غمگین دلوں کو مسرتوں میں بدلا جاسکے۔ جو تعلیاں کرتے کرتے اپنے اپنے ضمیروں سے شرمندہ ہو چکے تھے ان کو ماضی پر نہ اترانے دیا جائے اور نہ حال کا ماتم کرنے کے لیے ہاتھوں کو اٹھانے دیا جائے بلکہ ان کے بجھے ہوئے دل میں زندگی کی لہر دوڑائی جائے اس خیال نے اک اک سانس میں مضمون لکھوائے" [۱]

وہ ناظرین جو خوش قسمتی سے ریاستی زندگی سے ناواقف ہیں اور شخصی فرمانرواؤں کے مخصوص عادات و خصائل سے لاعلم ہیں وہ اب عالم تصور میں ان کے تخت و تاج کے آگے سر عبودیت جھکائیں۔ ان کے ماہی مراتب کا احترام کریں ان کی قارونی دولت

---

[۱] مشاہدات۔ ہوش یار جنگ۔ صفحہ ۲۰۱

کو اپنی کوڑیوں سے تولیں ان کی شان و شوکت کو دیکھ کر اپنی غریبی پر شرمائیں اور سلسلہ بیان میں وہ سب کچھ سن لیں جن کو میرا حافظہ یاد دلائے۔" ۵۱

"یہ ایسے مشاہدات ہوں گے جن کو دیکھنے کے لیے مستقبل کی آنکھیں ترستی رہیں گی کیونکہ زمانے کا انقلاب ہندوستان میں بھی جمشیدی تختوں کو الٹ رہا ہے کیکاوسی تاجوں کو اتروا رہا ہے شاہانہ کروفر کو ختم کر رہا ہے۔ امارت کے جاہ و حشم کو مٹا رہا ہے خطابات کی لمبی فہرست کو گنگا میں بہا رہا ہے اور القاب و آداب کے تکلفات کو جمنا میں ڈبو رہا ہے ملوکیت کے جنازے نکل رہے ہیں اور جمہوریت کی آغوش میں عوام کھیلنے لگے ہیں ایسے وقت میں اگر ماضی و حال کے مشاہدات کو سمیٹ کر قلم بند نہ کیا گیا تو گزشتہ زمانوں سے مستقبل کو کن باتوں سے دلچسپی باقی رہ سکے گی۔ یہی وہ خیال تھا جس نے مجھے آمادہ کیا کہ حافظے کی مدد سے وہ محفوظ کر دوں جس کا تماشا کبھی مجھے ہنس ہنس کر دیکھنا پڑا۔ اور کبھی رو رو کر۔" ۵۲

باوجود اس کے کہ یہ کتاب حیدرآباد کی سیاسی زندگی میں درباری رشیہ دوانیوں اور عوامی زندگی کے حالات پر مشتمل ہے مگر ہوش نے ایک مصور کی طرح اپنی مہارت سے صرف تصویر کے خدوخال ہی نہیں اجاگر کیے ہیں بلکہ اس کے پس منظر پر بھی ان کی پوری نظر ہے کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ

---

۵۱ مشاہدات۔ ہوش یار جنگ صفحہ ۳

۵۲ " " " صفحہ ۳

رہ جائے جس سے تصویر کی معنویت پر حرف آتا ہو۔

مشاہدات کے دسویں باب "دربار عثمانی" میں گولکنڈہ اور آصف جاہی خاندان کی تاریخ بڑی تفصیل سے لکھی ہے۔ جس کے اتار چڑھاؤ میں حیدرآباد کے درباری مزاج کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

"یہ تغیرات وحوادث، کسی ملک کے لیے نئے نہیں ہر زمانے میں ہوئے ہیں اور ہر نئی حکومت نے اپنا حکومتی ڈھانچہ اپنے نقطۂ نظر سے ہی بنایا ہے عروج وزوال کی یہ داستان اور اکھاڑ پچھاڑ کے یہ قصے کچھ ہندوستان کی تاریخ کے لیے ہی نہیں بلکہ ایسے انقلابوں نے رومتہ الکبریٰ کی شان وشوکت کو باقی رکھا نہ قیصریت کو رہنے دیا۔ نہ مسولینی کے ارمان پورے ہونے دیئے۔ اس نے ترکی کی عبائے خلافت کو تار تار کیا، اس نے قاجاریت کو رضائیت کے حوالے کیا۔"[1]

مندرجہ بالا سطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہوش اس انقلاب کو صرف جذباتی نظر سے نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ تاریخ عالم اور فطرت انقلاب پر ان کی پوری نظر ہے۔

ہوش بلگرامی کی یہ آپ بیتی اپنے اندر حقائق کے علاوہ زبان کی حلاوت اور مشاہدہ کی گہرائی سموئے ہوئے ہے۔ بلاشبہ یہ آپ بیتی اردو کی کامیاب آپ بیتیوں میں شمار کی جانی چاہیے۔ اس آپ بیتی میں مصنف کی ذات عقائد گزرے ہوئے شب وروز اس کے دل کی کسک اور روحانی مسرتوں کا عکس نمایاں ہے۔

---

[1] مشاہدات۔ ہوش بلگرامی صفحہ ۲۷۷

شاد کی کہانی شاد کی زبانی

(شاد عظیم آبادی)

(سنہ ۱۹۵۸ء)

سید علی محمد شاد عظیم آبادی کی جو خود نوشت منظر عام پر آئی ہے اس کی شان بالکل نرالی ہے۔ اس کا مسودہ انھوں نے خود تیار کیا ہے لیکن اس کی اشاعت اپنے نام سے نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ اس کے لیے اپنے ایک شاگرد مسلم عظیم آبادی کو منتخب کیا۔ مسلم صاحب کا بیان ہے کہ

"اگرچہ یہ تذکرہ مولف نے میری طرف سے صیغہ غائب میں لکھا ہو مگر میں اسے اپنی طرف منسوب کرنا جائز اور قرین دیانت نہیں سمجھتا ہوں۔" لہ۱

نواب عماد الملک بلگرامی کے نام ایک طویل مکتوب میں شاد عظیم آبادی نے اپنی وفات سے تقریباً پانچ سال قبل لکھا تھا۔

"میں نے اپنی سوانح حیات ۳۰ جز میں لکھ کر اپنے ایک قابل

لہ۱ شاد کی کہانی شاد کی زبانی ــــ صفحہ ۳

شاگرد کے سپرد کردی ہے اور وصیت کردی ہے کہ میرے مرنے کے
بعد ضرور چھپوا کر عبرت کے لیے مشتہر کرنا۔" [1]

یہ شاگرد مسلم عظیم آبادی تھے۔ شاد نے اس سے قبل بھی اپنے حالات زندگی پر مشتمل کئی مسودے مرتب کرائے تھے لیکن ان کی اشاعت کی نوبت نہ آئی ہمہ وقت بے چین رہنے والی شخصیت کی حیثیت سے لکھتے لکھاتے تھے اور پھر قلم زد کر دیتے تھے۔ شاگرد کی رائے تھی کہ موجودہ مصروف دنیا کے پاس نہ اتنا وقت نہ ضرورت ہے کہ کسی ماہر فن کے فضائل نقائص کے تمام جزئیات کا ہزاروں صفحات میں مطالعہ کرے حالانکہ استاد کی رائے اس کے برعکس تھی۔ شاگرد کا کہنا ہے کہ۔

"اپنے اور استاد کے مطمح نظر کے اسی اختلاف سے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ سوانح جیسے چاہیے استاد کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکتے میں اس سے ہاتھ دھو کر بیٹھ گیا۔ آخر ۱۹۲۱ء کے لگ بھگ سید صاحب نے مبسوط سوانح حیات میری طرف سے صیغۂ غائب میں لکھ کر اس کا نام کمال عمر رکھا اور یہ غیر صاف شدہ مسودہ سیکڑوں صفحوں پر محیط کر کے میرے حوالے کر دیا۔ مجھے بڑا سکون اطمینان ہوا کہ ایک مشکل حل ہو گئی ——— اپنے قلم سے حیات شاد میں واقعات تبصرہ تنقید میں کسی اونچ نیچ پاسداری یا صاف گوئی کا الزام میرے سر نہ رہے گا۔ بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اس کتاب کا نام استاد نے کمال عمر رکھا تھا مجھے اس نام میں اصل موضوع کی طرف انتقال ذہن کی صفت نظر نہ آئی اسی لیے میں نے شاد کی کہانی شاد کی زبانی"

---

[1] شاد کی کہانی شاد کی زبانی صفحہ ۲۴۸

کے نام سے موسوم کیا[1]

اردو خود نوشت کی تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی ہے کہ کسی نے اس طرح اپنی آپ بیتی لکھی ہو اور اس کی اشاعت دوسرے شخص کے نام سے ہوئی ہو۔ یہاں یہ سوال قدرتی طور سے پیدا ہوتا ہے کہ اس طرزِ عمل کی محرک کون سی چیز تھی؟ نواب عماد الملک کو انھوں نے جو خط بھیجا تھا اس میں کوئی اشارہ ایسا نہیں ملتا ہے کہ اس حقیقت کو وہ پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے کہ یہ سوانح خود انھوں نے قلم بند کیے ہیں؟ خود شاگرد نے بھی اس کا کوئی سبب نہیں بتایا ہے اس صورت میں مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس انوکھے پن کی تلاش نفس مضمون میں کی جائے آپ بیتی کے لیے کی گئی تعریف

Prolonged speech of defence

(صفائی کے وکیل کی طویل تقریر)

شاد کے ایک حصّے پر پوری اترتی ہے کہانی میں دیگر باتیں بھی ہیں خاندانی حالات ہیں حصول تعلیم کا ذکر ہے سخن طرازی کی تفصیل ہے مالی پریشانیوں کا شکوہ ہے لیکن دو باتیں ایسی ہیں جو خاص طور پر ابھر کر سامنے آتی ہیں ایک تو اپنی ادبی عظمت ہے جس کے بے شمار پہلو پڑھنے والے کے سامنے رکھے گئے ہیں دوسری وہ غضبناک مخالفت ہے جس کا سامنا ان کو کرنا پڑا تھا اس دوسرے پہلو کے بارے میں انھوں نے بڑی طویل وضاحت کی ہے اور شاید یہی حصہ اہم ترین ہے اس ضمن میں یہ بتا دینا ضروری ہو کہ شاد کے انتقال کے پچاس سال گزر جانے کے بعد بھی شاد کے خلاف ایک

---

[1] شاد کی کہانی شاد کی زبانی صفحہ ۴ اور ۵

ادبی محاذ بہار میں آج بھی قائم ہے۔

کسی ماہر نفسیات کو یہ کتاب دے دی جائے تو وہ تحلیل نفسی کے عمل سے شاد کی شخصیت اور نفسیات کو بالکل برہنہ کر دے گا حقیقت بھی یہی ہے کہ اس سے بہت سی گتھیوں کی نشان دہی ہوتی ہے متعدد گرہوں کا پتہ چلتا ہے مسلم عظیم آبادی کہتے ہیں۔

"استاد مرحوم کو دو آرزوؤں نے ہمیشہ بے چین رکھا ایک تو یہ کہ ان کا دیوان کامل صحت اور بہترین کتابت اور طباعت کے ساتھ شائع ہو جاتا دوسرے یہ کہ ان کے حالات زندگی ان کی حیات میں مرتب ہو جاتے۔" [1]

لفظ مرتب ملحوظ رکھنا چاہیے۔ کیا اشاعت بھی زندگی میں چاہتے تھے اس کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی ہے۔

سب سے بہتر مسودہ پیارے لعل شاکر میرٹھی اشاعت کے لیے لے گئے تھے لیکن انھوں نے نہ تو اسے شائع کرایا اور نہ یہ پتہ چل سکا کہ انھوں نے کیا کیا۔ شاد کی زندگی میں ہی شاکر میرٹھی کا انتقال ہو گیا۔ سوانح حیات کے سلسلے میں شاگرد مسلم عظیم آبادی تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ یہ ان کی تالیف و تصنیف نہیں ہے سوال یہ ہے کہ شاد کے لیے کیا قباحت تھی کہ وہ کھلم کھلا اسے اپنی تالیف بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرتے؟ اس کا جواب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ ان پر خود ستائی کا الزام لگ جاتا۔ لیکن موجودہ شکل میں بھی یہ الزام برقرار ہے شاد نے اپنی تعریف جگہ جگہ جن الفاظ میں کی ہے ان کی کھپت ظاہر ہے کہ خود نوشت سوانح عبارت میں نہیں

---

[1] شاد کی کہانی شاد کی زبانی صفحہ ۱

ہو سکتی — چند اقتباسات ملاحظہ ہوں

"سات برس کی عمر میں سید صاحب فارسی کا اردو میں ترجمہ کرنے لگے۔" ۵۱

"فارسی کے محاورے اور بات چیت میں سید صاحب کو نو برس کی عمر میں اتنا ملکہ ہو گیا تھا کہ بعض ناواقف اہل عجم گھبرا کر کہہ اٹھتے تھے کہ "بچہ اصفہان است"" ۵۲

"فن تاریخ میں بھی سید صاحب کو ید طولیٰ حاصل ہے مختلف قوموں کی تاریخیں علی الخصوص ہندوستان کی تاریخیں اس قدر دیکھ چکے ہیں کہ جس وقت کسی واقعہ کو بیان کرنے لگتے ہیں ایسی وضاحت و مالہ وما علیہ کے ساتھ کہ سن کر حیرت ہوتی ہے" ۵۳

"شعرائے ہند و شعرائے فارسی وغیرہ کے حالات کو اکثر فقرا وصوفیائے کرام و صاحبان معرفت کے واقعات وافعال عین وقت پر مناسب مقام آپ کو اس طرح یاد آ جاتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے — ان کے اہل دل و صاحب معرفت ہونے میں شک نہیں ہے۔" ۵۴

شاد نے "نوائے وطن" کے نام سے جو کتاب لکھی اس نے آگ لگا دی ان پر ہر طرف سے حملے ہونے لگے شاد کو اعتراف ہے کہ اس کتاب میں انھوں نے

---

۵۱ شاد کی کہانی شاد کی زبانی صفحہ ۲۵
۵۲ " " " " صفحہ ۲۵
۵۳ " " " " صفحہ "
۵۴ " " " " صفحہ "

بعض مقامات پر کسی قدر سختی سے اپنے ہم وطنوں کو ٹوکا ہے[51]" لیکن اسی کے ساتھ یہ صفائی پیش کرتے ہیں کہ ٹوکا ہے مگر اسی قدر جس قدر کوئی دل سوز چڑھ کر اپنے دوست کو نصیحت کرتا ہے[52]" کتاب پر ریویو ایک اخبار میں نکل گیا جو بے حد مخالفانہ تھا۔ شاد کو بہت ملال ہوا اور انھوں نے کتابیں اور پروف جلا کر خاک سیاہ کر دیے ایک کتب فروش تیس[30] چالیس[40] کتابیں لے گیا تھا اس نے مانگنے کے باوجود نہ دیں شاد کے پاس ایک جلد بھی نہ رہی۔

"یہی بہت بڑی غلطی ہوئی کیونکہ مخالف حضرات بھی اس کارروائی سے غافل نہ تھے جب ان کو معلوم ہو گیا کہ خود مصنف کے پاس اب کتاب نہیں ہے تو پھر اپنی مصلحت کے موافق جو چاہا چھاپ چھاپ کر اور من مانے مطلب لگا لگا کر شائع کیا۔" ۵۳

۱۸۶۰ء کے ایک مشاعرے میں شاد کے پڑھے ہوئے ایک قطعے سے اردو ہندی تنازعے کا جو ذکر شروع ہوا تھا وہ شاد کے خلاف ایک غضبناک مہم اور ذاتیات پر حملوں اور گالی گلوج تک آ گیا۔ پھر شاد نے لمبی چوڑی صفائی پیش کی ہے اس طویل اقتباس سے پس منظر کو صحیح طور پر سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ شاد پر بنیادی الزام یہ تھا کہ بجز چند لوگوں کے اور سب کو انھوں نے گنوار اور دہقانی بنا دیا ہے۔

شاد نے یہ ساری باتیں خاصی تفصیل سے لکھی ہیں کس کس طرح

---

۵۱ شاد کی کہانی شاد کی زبانی صفحہ ۸۳

۵۲ " " " " صفحہ ۸۳

۵۳ " " " " صفحہ ۸۳

ان کے خلاف محاذ قائم ہوئے مرزا دبیر کے طرفداروں کو بھڑکایا گیا: وہاں کے شرفا کی غیرت کو للکارا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں شاد نے اپنے نقطہ نظر سے مسئلے کو پیش کیا ہے اور فریق مخالف کا موقف پوری طرح واضح نہیں ہے پھر بھی یہ حصہ اس کتاب کی جان ہے کیونکہ جھگڑے کی مختلف منزلوں کو بڑے ڈرامائی انداز میں بیان کیا گیا تھا۔ برسہا برس تک شاد کو رسوا کیا جاتا رہا اور مخالفت کا یہ سلسلہ بقول شاد ایک جگہ بارہ سال۔ دوسری جگہ سولہ سال اور تیسری جگہ پچاس سال تک جاری رہا۔

شاد کا کیسی بے بسی اور کسمپرسی کا عالم تھا اس کی جھلک بھی ان کی اس داستان میں ملتی ہے۔ مسلم عظیم آبادی نے کتاب کے "تتمہ" میں لکھا ہے کہ

"مولانا شاد کی شاعرانہ زندگی کا آغاز مخالفتوں سے ہوتا ہے ان کے کئی اسباب تھے کچھ تو آپ کا تفاخر و تعلّی خواہ وہ حقیقت پر مبنی ہو۔ درحقیقت وہ عام شعرا کی سطح سے تھے بھی اتنے بلند کہ ان کی تعلّی و تفاخر نازیبا نہ تھا۔ کچھ معاصرین کا رشک و حسد مگر فوری سبب ان کی کتاب "نوائے وطن" تھا۔" [۵۱]

شاد کو اس بات کا شدید احساس تھا ان کی وہ قدر نہیں جس کے وہ مستحق تھے کم و بیش ڈھائی سو صفحات کی ایک کتاب میں انھوں نے ایک سو سے کم صفحات میں بچپن جوانی کے حالات اور مخالفوں کی یلغار کا ذکر کیا ہے اور ڈیڑھ سو صفحات میں اپنی نثر و نظم کی خوبیوں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اردو شاعری کی دنیا میں شاید یہ منفرد بات ہے کہ کسی

---

۵۱ شاد کی کہانی شاد کی زبانی صفحہ ۲۶۲ تتمہ از مسلم عظیم آبادی

شاعر نے اپنے کلام کی خوبیاں اس قدر مفصل طور پر بیان کی ہوں شعوری ہو یا نیم شعوری یا تحت الشعور کی بات ہو احساس وہی ناقدری کا ہے اس طرح اردو والوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بتایا گیا ہے کہ شاد کس غضب کا شاعر تھا۔ نہ جاننے والوں کو بتایا گیا ہے اور کم سمجھوں کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا ہے اور شاد کے معترضین کے لیے جواب بھی بالواسطہ طور پر اس تذکرے میں مخفی ہے کہ شاد کے پائے کا کوئی شاعر ان میں نہیں ہے۔

شاد نے خود نوشت کا مسودہ اپنی وفات سے کم از کم پانچ سال قبل ۱۹۲۱ء میں مرتب کر لیا تھا لیکن اشاعت ۳۶ سال بعد ۱۹۵۸ء میں ہوئی اور وہ بھی بقول مسلم عظیم آبادی اس وقت جب ڈاکٹر ذاکر حسین بہار کے گورنر تھے اور ان کی جوہر شناس نظر اس پر پڑی اور یہ "ان کہی کہانی" شائع ہو کر عوام کے سامنے آئی۔

سرگزشت

(عبدالمجید سالک)

۱۹۶۶ء

عبدالمجید سالک بلند پایہ ادیب۔ خوش گو شاعر مشاق صحافی اور اردو میں مزاحیہ کالم کے بانی تھے۔ سرگزشت ان کی آپ بیتی کا عنوان ہے جو قسط وار امروز (پاکستان) کے سنڈے اڈیشن میں شائع ہوتی رہی تھی۔ سرگزشت کی پچیس قسطیں "امروز" میں چھپیں۔ باقی "نوائے پاکستان" میں سلسلے وار چھپتی رہیں۔ قسطوں کا یہ سلسلہ ۱۹۵۱ء میں ختم ہوا۔

سالک صاحب اور ان کے دوستوں کا خیال تھا کہ "سرگزشت" کو فوراً کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے مگر بعض اسباب کی بنا پر ۱۹۵۱ء کے بجائے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی اس کا دوسرا اڈیشن (قومی کتب خانہ لاہور نے) ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔

سرگزشت کے دیباچے میں غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ آپ بیتی کے سب سے اہم محرک چراغ حسن حسرت تھے۔

"اس کی ترتیب اور تسوید کے لیے خاص تحریک انہیں کی طرف سے ہوئی اگر وہ اصرار نہ کرتے تو چہل سالہ علمی اور ادبی و سیاسی سرگرمیوں کا یہ خاکہ غالباً تیار نہ ہوتا —"[1]

سرگزشت عبدالمجید سالک کی صرف خود نوشت سوانح حیات ہی نہیں ہے بلکہ برعظیم پاک وہند اور خاص طور پر سرزمین پنجاب کے سیاسی مجلسی، علمی اور ادبی، تہذیبی رجحانات اور تحریکات کی ایک دلچسپ داستان بھی ہے۔ اور یہی مقام ہے جہاں خود نوشت سوانح حیات تاریخ و داستان کا لطیف امتزاج بن کر سامنے آتی ہے۔ یہ تاریخ کی کتاب تو نہیں مگر یہ آپ بیتی کسی حد تک ایک ایسا دریچہ ضرور بن جاتی ہے جہاں سے ہم ماضی میں جھانک سکتے ہیں۔

سرگزشت کے ابتدائی صفحات میں عبدالمجید سالک نے اپنے بچپن اپنے دادا۔ والد۔ چچا اور دوسرے بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔ اور اس ماحول کا نقشہ کھینچا ہے جس میں ان کی ذہنی نشوونما ہوئی تھی دس گیارہ سال کی عمر میں سالک نے اپنے والد کے ساتھ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں شرکت کی تھی اور گہرا اثر قبول کیا تھا۔

"انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کو مسلمان اپنا سب سے بڑا قومی میلہ سمجھتے تھے اپنے بچوں کو بھی جلسوں میں لے جایا کرتے تاکہ بزرگان قوم کے خیالات آغاز سے ہی ان کے کان میں پڑ جائیں مجھے یاد ہے کہ اس سالانہ جلسے میں مولانا حالی اور مرزا ارشد گورگانی بھی تشریف لائے۔ مولانا حالی کی مقدس اور

---

[1] سرگزشت۔ دیباچہ صفحہ ۶

پاکیزہ صورت اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے سر پر چھوٹی
سی فیلٹ ہیٹ۔ ٹوپی۔ بند گلے کا سادہ کوٹ اور گلے میں
ایک رومال بندھا ہوا۔ سفید پرنور داڑھی اور نہایت شفیق
اور رحیم بشرہ" [1]

سالک صاحب نے وہ زمانہ بھی دیکھا تھا جب فضا حالی اور شبلی
کی خدمات سے معمور تھی مولانا محمد حسین آزاد زندہ تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد اگرچہ
بوڑھے ہو چکے تھے مگر "بوڑھے شیر کا طنطنہ باقی تھا"۔
پرانے انداز کے ادب اور شاعری کی طرح پرانی سیاست گری کی
بساط بھی لپیٹی جا چکی تھی مسلمانوں میں طلب حقوق کا ولولہ پیدا
ہو رہا تھا نئے ادیبوں اور شاعروں میں اقبال۔ ظفر علی۔ حسرت
موہانی اور ابوالکلام آزاد بہت نمایاں نظر آتے تھے۔ گاندھی جی کا نام
کم ہی لوگوں نے سنا تھا۔ کانگریسی لیڈروں میں تلک پیش پیش
تھے خلافت اور کانگرس کی تحریکوں نے ان کے سامنے زور پکڑا تھا
اپنے زمانے کی تقریباً ہر اہم اور ذی علم ہستی سے ان کی ملاقات رہی تھی
اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا سرگزشت میں ان سب حضرات
کا ذکر سالک نے جس انداز میں کیا ہے اس کے بارے چراغ حسن حسرت
اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

بعض لوگوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں انا د
لاغیری کا نغمہ اس زور سے الاپا ہے کہ وہ جس زمانے کا حال
بیان کرتے ہیں اس پر بظاہر چھائے ہوئے معلوم ہوتے

---

[1] سرگزشت۔ عبدالمجید سالک صفحہ ۲۱ (قومی کتب خانہ لاہور) سنہ ۱۹۶۶ء

ہیں سالک صاحب کے یہاں نہ تو یہ کیفیت ہے کہ انھوں نے جن صحبتوں
کے نقشے کھینچے ہیں ان میں وہی صدر نشین نظر آئیں نہ انھوں
نے اتنا انکسار برتا ہے کہ ایک کونے میں دبکے نظر آئیں اور کہیں
دکھائی نہ دیں ــــ وہ انشا پردازی کے کوچے کی رسم و راہ
سے آگاہ اور سوانح عمری کے آداب سے پوری طرح باخبر ہیں"[51]

عبدالمجید سالک کی زندگی بقول خود "سرتاپا آلودہ صحافت و سیاست"
تھی۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں وہ ایک سال تک جیل میں
بھی رہے اسیری کے زمانے کا تذکرہ وہ جس طرح کرتے ہیں اس سے
محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ان کی زندگی کا ایک حسین دور تھا۔

"دوست احباب رخصت ہوئے اور میں حوالات کی کوٹھری
میں جو تھانے کی ڈیوڑھی میں ہے بند کر دیا گیا۔ شفاعت
اللہ خاں نے میرا بستر چند کتابیں اور کچھ پان سگریٹ میرے
لیے مہیا کر دیے اور میں اس تنگ اور تاریک کوٹھری میں بستر
بچھا کر ایسا غافل سویا کہ اس سے قبل ایسی غفلت اور بے فکری
کی نیند کبھی نہ آئی تھی۔ کیونکہ آدھی رات تک اخبار پڑھنے اور
"زمیندار" کے لیے مضامین لکھنے کی مشقت سے نجات ہو گئی تھی
ایک آدھ دفعہ گھر والوں کی پریشانی اور آئندہ مشکلات کا خیال
آیا لیکن دل نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اللہ ان کا مالک و رزاق ہے
وہ خود بندوبست کرے گا۔"[52]

---

[51] سرگزشت۔ دیباچہ چراغ حسن حسرت صفحہ ۱۲
[52] سرگزشت۔ عبدالمجید سالک صفحہ ۱۳۸

عبدالمجید سالک کا طرز تحریر سادہ اور بے تکلف ہے خشک سے خشک مسئلے میں شگفتگی پیدا کرنا انھیں خوب آتا ہے باوجود اس کے کہ آپ بیتی میں ایک مخصوص دور کا بیان ہے لیکن تحریر کی دل کشی اور غیر محسوس لطافت کی وجہ سے ہر زمانے کی چیز بن گئی ہے۔

"ظرافت ان کے قلم سے یوں نکلتی ہے جیسے کڑی کمان کا تیر سرگزشت میں جہاں کوئی لطیفہ آیا ہے ایسا معلوم ہوا ہے جیسے کوئی ستارا ٹوٹا ہے جو گرد و پیش کی ساری فضا کو نورانی کر گیا ہے۔"[1]

سرگزشت میں بے شمار خوب صورت واقعے اور جملے ہمیں یکجا ملتے ہیں علامہ اقبال کی بے تکلف صحبتوں کے دلآویز نقشے ہیں۔ اس سلسلے میں علامہ کا ایک واقعہ دل چسپی سے خالی نہیں ہے۔ علامہ اقبال آم کے زبردست شیدائی تھے۔ مگر ان کے معالجے نے انھیں آم سے سخت پرہیز بتایا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب نے اپنے معالج حکیم عبدالوہاب نابینا سے صرف ایک آم روزانہ کھانے کی اجازت حاصل کر لی۔ ایک دن میں گیا تو ڈاکٹر صاحب کے سامنے ایک پلیٹ میں ایک اتنا بڑا الفانسو پڑا تھا۔ جو خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سیر بھر کا تو ضرور ہوگا۔ میں نے کہا آپ نے پھر بد پرہیزی شروع کر دی کہنے لگے: "حکیم صاحب نے ایک آم روزانہ کی اجازت دے دی ہے آخر یہ ایک آم ہی تو ہے" —— میں یہ لطیفہ سن کر دیر تک ہنستا رہا —"[2]

---

[1] سرگزشت۔ دیباچہ از چراغ حسن حسرت صفحہ ۱۱

[2] سرگزشت۔ صفحہ ۳۵۲

سرگزشت کی یادوں کا خاتمہ اگرچہ درمیان میں ہو جاتا ہے لیکن مصنف نے اس "خاتمہ سخن" کی وجہ بھی لکھ دی ہے۔

"۔ میں ابھی اپنے دل و دماغ اور اپنے قلم میں اتنی صلاحیت نہیں پاتا کہ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا اور بساط سیاست پر شاطرین نے جو چالیں چلیں ان کو قلم بند کر سکوں۔" [1]

مصنف اپنی یادداشتوں کو یہیں پر ختم کر دیتا ہے۔

عبدالمجید سالک کی یہ آپ بیتی برعظیم پاک و ہند اور خاص طور پر پنجاب کی سیاسی۔ ادبی اور مجلسی زندگی کی اہم یادداشت ہے، آسان اور عام فہم اسلوب نے اس کے حسن میں اور بھی اضافہ کر دیا۔

---

[1] سرگزشت۔ صفحہ ۵۳۶

یادوں کی دنیا

(یوسف حسین خاں)

۱۹۶۷ء

تقریباً پانچ سو صفحات پر پھیلی "یادوں کی دنیا" اردو خود نوشت میں شاید واحد ہے جس میں اشخاص اور مقامات کے الگ الگ انڈکس دیے گئے ہیں غلط نامہ اس کے علاوہ ہے ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے ۶۴ سال کی عمر میں یہ تصنیف شروع کی تھی اس میں خاصی منصوبہ بندی اور ترتیب سے کام لیا گیا ہے ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ کسی مورخ کی اردو میں یہ واحد آپ بیتی ہے۔ کچھ واقعات خاندانی بزرگوں سے منقول ہیں کچھ حافظے سے لکھے گئے ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کی یادداشتیں ان کے پاس موجود تھیں ڈاکٹر یوسف حسین خاں ڈاکٹر ذاکر حسین کے چھوٹے بھائی تھے متفرق تذکروں کے علاوہ ذاکر حسین پر ۷۰ صفحات لکھے گئے ہیں۔ ذاکر صاحب کو فخر خاندان بتایا گیا ہے لیکن ان سے متاثر ہونے کی کوئی جھلک صراحت سے نہیں ملتی ہے۔

اپنی آپ بیتی میں یوسف حسین خاں نے پس منظر کے عنوان سے اپنے آبا و اجداد کا تذکرہ کیا ہے۔ بچپن کی یادیں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پتنگ اڑانے کے سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ پتنگ اڑاتے وقت محلے کے جو لڑکے جمع ہو جاتے تھے میں انھیں پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ کاچھیوں بچکوڑں اور دھوبیوں کے لڑکے ہوتے اور دو ایک پٹھانوں کے بھی ہے" ؁۵۱

یہ خاندانی تفاخر تھا یا ذاتی رجحان اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے اپنے وطن کی تعریف جا بجا کرتے ہیں۔ قائم گنج کی چھوٹی سے چھوٹی چیز مثلاً بیر اور گوشت تک کا تذکرہ بڑی تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں،

"مزے اور خوشبو کی یاد بڑی دیرپا ہوتی ہے" ؁۵۲

یورپ کے کسی بھی چمن میں گئے ہیں تو قائم گنج کے گھر اور اردگرد کے باغوں کی بھینی بھینی مہک یاد آگئی اس کا فلسفہ بھی بیان کرتے ہیں۔

"عرب مفکر جاحظ نے یاد کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ بعض باغبان پھول سونگھ کر ٹھیک وقت بتا دیتے ہیں اور پھول کی خوشبو میں دن کے اترنے اور چڑھنے کا برابر اثر ہوتا رہتا ہے جسے باغبان جانتے ہیں" ؁۵۳

طالب علمی کے دور میں ہی آزادی اور انقلاب کے رومانی تصورات سے متاثر ہوئے تھے اور انگریزی حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات

؁۵۱ یادوں کی دنیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صفحہ ۴۹
؁۵۲ یادوں کی دنیا۔ " " صفحہ ۷۹

پیدا ہو چکے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے عقیدت کا آغاز بھی یہیں سے ہوتا ہے۔

جامعہ ملیہ میں داخلے کو یوسف حسین خاں نے اپنی زندگی کا موڑ بتایا ہے اپنے ہم جماعتوں اور استادوں کا تذکرہ کسی قدر تفصیل سے دلکش پیرائے میں کیا ہے اپنے استادوں کی خوبیوں کا بیان اس طرح سے کیا ہے کہ وہ خود اپنی جگہ پر تعلیمی اعتبار سے ایک اہم مضمون ہے اس سے ان کی رواداری اور احسان شناسی کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

"روح اقبال" ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے لیکن علامہ اقبال کا جتنا ذکر ہونا چاہیے وہ آپ بیتی میں نہیں ملتا ہے۔ ملاقات کا ذکر ہے لیکن سرسری انداز میں۔ ایک جگہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان میں اور غلام السیدین میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں اقبال کے شیدائی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ لکھنے میں بھی تامل نہیں کیا ہے۔ کہ اقبال پر سیدین کی کتاب مستند مانی جاتی ہے۔

اپنی خود نوشت میں یوسف حسین خاں نے انگلستان کے سفر کا حال بھی تقریباً .. اصفحات میں لکھا ہے۔ انھوں نے ۱½ سال فرانس میں گزارے اور یورپ کے کئی دوسرے ملکوں کی سیر بھی کی یہ تذکرہ اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ کیونکہ انگلستان کے بارے میں بہت سے لوگوں نے لکھا ہے۔ لیکن زندگی کے دیگر امور کے متعلق بہت کم لوگوں نے اتنی توجہ کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ سب سے پہلے فرانس کے جنوبی شہر "تولون" پہونچے۔ اس بندرگاہ پر انھیں جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ بڑے بڑے جنگی جہاز نہ تھے بلکہ وہاں کا نسوانی حسن تھا۔

"میں نے ایسا باغ و بہار حسن اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا جونبی فرانس کی عورتیں نہایت حسین ہوتی ہیں۔ ان کے حسن میں مجھے کچھ مشرقیت محسوس ہوئی۔" [۵۱]

"تودوں کی عورتیں میں نے دیکھا جب کسی سے بات کرتی تھیں تو ہنس کر مسکرا کر آنکھوں میں انسانی ہمدردی کا سرمہ لگا کر۔ میں سمجھتا ہوں اس سرمے کو شوخی۔ حیا کے لطیف اجزاء میں کوٹ کر تیار کرتے ہوں گے۔ ان کے سریلے رسیلے قہقہے اب تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اور ان کی خوب صورت مسکراہٹ آنکھوں میں پھر رہی ہے۔" [۵۲]

یوسف حسین خاں کی خود نوشت "یادوں کی دنیا" ایک خوبصورت اور جامع خود نوشت ہے جس میں اظہار کی سادگی اس کے حسن کو دوچند کر دیتی ہے۔

---

۵۱ یادوں کی دنیا یوسف حسین خاں صفحہ ۱۹۹
۵۲ " " " صفحہ ۲۰۰

شاہراہ پاکستان

(چودھری خلیق الزماں)

۱۹۶۷ء

۱۱۱۲ صفحات پر مبنی خود نوشت سوانح حیات "شاہراہ پاکستان" سیاست کی ان دشوار راہوں سے گزرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے جن کو طے کرنے کے بعد تقسیم ہند کا واقعہ عمل میں آیا۔

اردو ادبی دنیا چودھری خلیق الزماں کو ایک صحافی کی حیثیت سے ہی جانتی ہے۔ یہ آپ بیتی Pathway to Pakistan کے عنوان سے پہلے انگریزی میں شائع ہوئی تھی۔ "شاہراہ پاکستان" انگریزی خود نوشت کا صرف ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس میں کچھ اضافے بھی کئے گئے ہیں۔

کتاب کے ابتدائی صفحات میں مصنف نے اپنی تصنیف کی سیاسی اور تاریخی اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مصنف کی زندگی کے اہم ترین دور کی روداد ہونے کے ساتھ ساتھ یہ خود نوشت سوانح حیات کے پرزور محرک Self justification کی بھی خوبصورت

اور بامعنی شکل ہے۔ چودھری خلیق الزماں نے اپنی تصنیف کی اہمیت کے ساتھ ساتھ تصنیف کے تحریر کرنے کی وجوہات بھی وضاحت کے ساتھ درج کی ہیں۔

اس تصنیف کے طرز تحریر پر اگرچہ رپورٹنگ کا انداز غالب ہو۔ لیکن یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ جن حقیقتوں سے ہم خود نوشت کے ذریعہ آشنا ہو سکتے ہیں وہ کسی دوسری تحریر میں ممکن نہیں ہو سکتا ہے۔ تاریخ واقعات کو تو یکجا کر سکتی ہے مگر وہ اس سے پیدا ہونے والے شخصی تاثرات اور ردِ عمل محفوظ کرنے سے قاصر ہے۔

"میں چودہ برس تک اپنے قلم اور زبان کو سیکڑوں الزام لگانے والوں کے اعتراضات سن کر کہ میں ہندوستانی مسلمانوں کو چھوڑ کر پاکستان آگیا صبر کے ساتھ سنتا رہا اور ایک بھی بات ان واقعات کے متعلق جو میرے ہندوستان سے چلے آنے کا باعث ہوئے نہیں نکالا۔ مگر اب بہتر برس کے سن میں جب میرے پاؤں کے نیچے میری قبر ہے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ میں ان واقعات کو بلاکم و کاست خدا کو حاضر ناظر جان کر لکھ جاؤں۔" [1]

"اپنی خود نوشت سوانح لکھنے کے لیے اپنے بھائیوں، عزیزوں اور دوستوں کے اصرار کے علاوہ میں اس لیے بھی تیار ہو گیا کہ میں اپنے پیچھے ایک صحیح اور مکمل یادداشت متحدہ ہند میں مسلمانوں کی سیاسی پالیسیوں، تحریکات، اشخاص اور حالات کا مسلمانوں

---

[1] شاہراہ پاکستان۔ چودھری خلیق الزماں صفحہ ۱۱۰۹۔ انجمن اسلامیہ پاکستان۔ کراچی اکتوبر ۱۹۶۱ء

کی موجودہ اور آیندہ کی نسلوں کے لیے چھوڑ جاؤں کیونکہ قرون اولی
سے مسلمانوں کے حالات کسی وقت کیسے ہی رہے ہوں انھوں نے
اپنی تاریخ کے سلسلے میں غیر جانب داری اور انصاف کو کبھی
قربان نہیں ہونے دیا۔" [1]

چودھری خلیق الزماں کی سرگزشت پوری ہندوستانی تاریخ کے ایک مخصوص دور کی آپ بیتی ہے۔ اس تصنیف میں ایک شخص کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کی عکاسی نہیں بلکہ تاریخ کے وسیع کینوس پر بکھرے ہوئے مختلف رنگوں کی ہر جزئیات میں سمائے ہوئے ایک فرد کی تصویر ہے اسی لیے اس تصنیف کو ہم آپ بیتی کے بجائے جگ بیتی اور آپ بیتی کا امتزاج کہیں تو بہتر ہوگا۔

چودھری خلیق الزماں کی اس تصنیف میں ادبی حسن تلاش کرنا بے سود ہے۔ اخباری رپورٹنگ کا اسلوب طرز تحریر پر غالب ہے۔ اگرچہ سیاسی تفصیلات کے ساتھ اپنے خاندانی حالات، علی گڑھ کے تعلیمی دور کے ہنگامے اور لکھنؤ کی معاشرتی فضا پر تفصیل سے نظر ڈالی ہے۔ مگر بیان کا انداز سرسری ہے کیونکہ وہ اپنے اصل موضوع سے دور جانا نہیں چاہتے ہیں۔

"شاہراہ پاکستان" کا شمار اردو کی بامقصد خود نوشتوں کی فہرست میں ہوگا

---

[1] شاہراہ پاکستان۔ چودھری خلیق الزماں صفحہ ۱۱۱۱۔ انجمن اسلامیہ پاکستان، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۷ء

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل

(شورش کاشمیری)

۱۹۷۲ء

شورش کاشمیری نے اپنے حالات چار کتابوں میں قلم بند کیے ہیں اور ان میں سے ایک "بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل" ہے ان چاروں کتابوں کی حیثیت آپ بیتی کی ہے "پس دیوار زنداں" ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک کے ایام قید و بند کی داستان ہے جس کی اولین اشاعت کی نوبت فروری ۱۹۷۱ء میں آئی۔ قید و بند کی دو اور کہانیاں "تمغہ خدمت" اور "موت سے واپسی" ہیں۔

جیل کی جس قدر واضح اور مفصل تصویر کشی "پس دیوار زنداں" میں کی گئی ہے وہ شاید اردو کی کسی اور کتاب میں نہ مل سکے گی۔ وجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگوں نے جو زنداں نامے لکھے ہیں وہ بہتر کلاس کے قیدی ہونے کی حیثیت سے لکھے ہیں اس کے برعکس شورش کو عادی قیدیوں کے بدترین حالات سے گزرنا پڑا تھا۔

پس دیوار زنداں" کے بارے میں شورش نے جو تعارف لکھا ہو وہ عملاً ان کی دوسری تصنیف "بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل" کے لیے بھی ہے۔ اس کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"یہ ایک فرد کی کہانی نہیں مولف صرف نگارندہ ہے اس نے اپنی کہانی اس حد تک بیان کی ہے جس حد تک وہ اس میں گزرا ہے۔ یہ کہانی ایک عہد۔ ایک دور، ایک انجمن ایک تحریک ایک ولولے اور ایک معرکے کی تاریخ ہے جس میں عشق اور فرض ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور گوشت پوست کا انسان فولاد و سنگ کی ہمراہی میں آواز اور رنگ سے تصویریں تیار کرتا ہے۔ یہ الفاظ کے ساز اور معنی کے راز ہیں لے اور نے کی آشفتہ کاری ہے۔

یہ محض انشا نہیں۔ یہ آپ بیتی ہے اور جگ بیتی میں گندھی ہے۔ یہ ان طویل اور عمیق، رفیق و شفیق یادوں کا مجموعہ ہے جو طوق و سلاسل کے آب و گل میں ڈھلتی رہیں۔"

اسی کتاب میں شورش نے یہ بھی بتایا ہے کہ انھوں نے ۱۹۵۵ء میں "قیدی کا روزنامچہ" کے عنوان سے اپنی یادیں قلم بند کی تھیں لیکن وہ یادداشتیں رہائی کے وقت حکام نے ضبط کرلی تھیں دوبارہ پھر یادیں مرتب کیں مگر اب کی بار تقسیم کے ہنگامے میں سارا پلندہ غائب ہوگیا

"قید خانہ ایک ایسی جگہ ہے کہ دل و دماغ پر جو کچھ بیتتی ہے ہمیشہ حافظے پر نقش ہوتی ہے مجھ میں ایک نقص ہے کہ خوش گوار حافظے کے باوجود سن و سال یاد نہیں رہتے مثلاً مجھ سے

یہ پوچھا جائے کہ ۱۹۴۸ء میں کون سے مہینے اور کون سی تاریخ کو گرفتار ہو کر نظر بند ہوا تھا۔ تو لازماً مجھے اپنے حافظے پر زور دینا ہوگا اس کے باوجود مجھے تذبذب ہوگا کہ نظر بندی کی ٹھیک ٹھیک تاریخ کون سی تھی اس نسیان کے باوجود جہاں تک واقعات حالات۔ سانحات اور حادثات کا تعلق ہے ان کی تفصیلات اور جزئیات تک میرے حافظے سے محو نہیں ہوتیں۔ اس بارے میں قدرت نے مجھے بلا کا حافظہ دیا ہے۔ قلم اٹھانے سے پہلے اضطراب سا تھا کہ حافظہ کہاں تک ساتھ دے گا۔ قلم اٹھایا تو واقعات ابھرا ابھر کر وارد ہو گئے معلوم ہوا کہ جیسے میں لکھ نہیں پڑھ رہا ہوں۔ کئی سال صرف اس کش مکش میں نکل گئے کہ اسلوب کیا ہو؟ کئی اسلوب ذہن میں آتے اور چلے جاتے رہے کسی اسلوب پر دل مطمئن نہ ہو سکا۔ باور کیجیے کہ کئی مسودے لکھے اور لکھ کر پھاڑ ڈالے۔ ایک دفعہ ساری کتاب مکمل کر لی لیکن اس لیے سارا مسودہ تلف کر دیا کہ مطمئن نہ تھا ——

انسان مجرموں میں رہ کر خود مجرم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے تو محفوظ رکھا لیکن یہ احساس آخر تک چٹکیاں لیتا رہا کہ ہم لوگوں پر جیسے مسرت کا دور ہی نہیں آیا۔ لڑکپن سکول میں گزرا ذرا جوان ہوئے! جوان بھی کہاں بس جوانی کی سرحد کو تاکنا شروع کیا تھا کہ جیل کا پھاٹک کھل گیا۔

تقریباً دس سال اس فرات کا پانی پیتے رہے نتیجتہً لڑکپن نے اپنی عنان بڑھاپے کو سونپ دی جوانی بیچ میں

سے اس طرح سے اٹھ گئی جیسے کوئی نازنین پہلو چھڑا کر نکل جائے اور آتش کدہ خیال میں مسرتوں کی چنگاریاں رہ جائیں۔"

"پس دیوار زنداں" میں تقریباً سارا تذکرہ جیل کی زندگی پولیس کی بربریت اور انگریز حکمرانوں کے ظلم وستم سے متعلق ہے۔ لیکن دو باتیں خصوصیت سے پر اثر ہیں ایک تو شورش کے جواں سال بھائی کی غربت کی وجہ سے موت۔ دوسری شورش کی خورشید نامی ایک لڑکی سے محبت کی داستان شورش کو جیل اور پولیس سے فرصت نہ ملی اور خورشید گھل گھل کر ختم ہو گئی۔

"بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل" میں شورش نے اپنے اردگرد کے ادبی ماحول اور ادبی صحبتوں کا ذکر کرنے میں کسی طرح کے بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ اور بالخصوص لاہور کی ہر قابل ذکر ادبی شخصیت اور ادبی جریدے کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جس کی طرف مثال کے طور پر رضا علی اور جوش ملیح آبادی نے توجہ نہ کی تھی۔

شورش نے اپنی جو سرگزشت بیان کی ہے اس میں ایک دلآویز کشمکش ملتی ہے۔ ان کی زندگی میں ادب اور سیاست دونوں پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ ادب ان پر حاوی ہونا چاہتا ہو مگر سیاست کے الجھاوے اسے پیچھے دھکیل دیتے ہیں۔ بہر حال ان کی نثر بڑی دل نشیں اور پرتاثیر ہے۔ وہ اچھے شعر بھی کہتے تھے۔

"بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل" میں شورش نے سب سے زیادہ توجہ اور محنت سے اپنی ذہنی نشو ونما کے بارے میں لکھا ہے۔ فی الحقیقت جیل کی زندگی نے مصیبتوں اور سختیوں کے باوجود ان کو مطالعہ کا سلیقہ

اور موقع دیا اور کم و بیش دس سال کی "بیکاری" کے اس دور نے ان کے دماغ کی کھڑکیاں کھول دیں۔ ذہنی نشوونما اور ذہنی ارتقاء کے موضوعات ایسے ہیں جنھیں انگریزی میں جدید رجحان کے بموجب آپ بیتی کی سب سے نمایاں خصوصیت سمجھا جاتا ہے۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو شورش نے بڑا نمایاں اور اہم کام انجام دیا ہے۔

گمشدہ یادیں گمشدہ یادیں کے عنوان سے اپنی جو یادیں مرتب کی ہیں، یہ اس کتاب کا بہترین حصّہ ہے۔

"شہید گنج کے سانحے کو آج ۳۴ سال ہو چکے ہیں۔ حافظے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ اور میں صرف حافظے پر انحصار کر رہا ہوں انھیں واقعات کو چھیڑا ہے جو میرے حافظے میں محفوظ رہ گئے یا میری ذات سے متعلق ہیں، یا جن کے بیل سے میں گزر چکا ہوں۔ بعض چیزوں کی تفصیل عمداً ترک کر دی ہے ایک تو ان کے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ دوسرے ان کا خاک نسیاں میں دفن ہو جانا بہتر ہے۔ بعض سنگین پہلو سیاسی بدمزگی کی وجہ سے ترک کر دیے گئے ہیں۔ بعض عقیدتوں کے آبگینوں کو ٹھیس پہونچانے سے عمداً احتراز کیا ہے ـــ اس کہانی میں تنقید اور تبصرہ دونوں کی آمیزش ہے سچ بولنا بڑا خطرناک ہے۔ سچ سے زیادہ کڑوی کوئی شے نہیں ہوتی۔ سچ بہرحال سچ ہے۔ لیکن ہر وقت ہر مقام پر سچ بولنا سیاست میں مہلک بھی ہے اور مضر بھی۔ سچ کے لیے ہمیشہ دو کی ضرورت ہوتی ہے ایک وہ جو سچ بولے دوسرا وہ جو سچ سُنے، سچ تب ہی مکمل ہوتا ہے۔ یہاں سچ بولنے والے

کم ہیں۔ لیکن سچ سننے والے کمیاب ہیں۔ بلکہ نایاب ہیں۔ اکثر سچائیاں صرف اس لیے ناکامیاب رہ گئیں کہ ان کے پاس طاقت نہ تھی بیشتر جھوٹ اس لیے سچ ہو گئے کہ ان کو طاقت لے پروان چڑھایا" آخری فتح سچ کی ہوتی ہے ہمارے دور میں یہ مقولہ کبھی بار آور نہیں ہوا ——— "سانچ کو آنچ نہیں" تو نئی زمانہ اس قسم کے خوبصورت فقرے کتابوں کے صفحات پر ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ حقائق سے ان کا برائے نام تعلق ہے"[1] اپنی سیاسی زندگی کے تجربات اور رجحانات کا بڑے کھلے دل سے ذکر کیا ہے۔ اپنی ذات کی عقدہ کشائی در اصل اسی کا نام ہے کہ شخصیت کے جلو میں وقت کو بھی ساتھ لے کر چلا جائے۔

"احرار میں شمول کے بعد عرصے تک میں نے اوپرا پن محسوس کیا اس کی دو وجہیں تھیں ایک وجہ یہ تھی کہ ہر نئی فضا میں انسان کچھ دنوں اجنبی رہتا ہے۔ دوسری وجہ بعض احرار رہنماؤں کا روکھا پن تھا ——— میں احرار میں اس لیے شامل ہوا تھا کہ میرا ذہن غیر ملکی استبداد کے سخت خلاف تھا لیکن طبیعت میں اسلام بھی تھا۔ ان دونوں کا آمیختہ احرار تھے اور اس وقت موجود علاقوں میں اس خوبو کی کوئی دوسری جماعت نہ تھی۔ ہفتوں سوچتا رہا، طبیعت میں شعر و انشا کا شوق تھا۔ چاہا قرطاس و قلم کی طرف لوٹ جاؤں۔ نو مشق تھا تاہم یقین تھا کہ محنت ضرور پھل لاتی ہے۔ تاجور۔ احسان دانش۔ اختر شیرانی میری طبیعت

---

[1] بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل۔ شورش کاشمیری صفحہ ۱۹۶

کے میلان سے بہت خوش تھے ان کا خیال تھا کہ میرے اندر ایک
بڑا شاعر اور ایک بڑا ادیب بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اللہ
نے مجھے یہ جوہر عطا کیا ہے کہ اس کا ہو جاؤں تو قدرت میرے
لیے سر و سامان پیدا کرے گی۔ لیکن زبان کو سیاسی چسکا پڑ چکا
تھا اور منہ کو خون لگ چکا تھا۔" [1]

خود نوشت سوانح حیات لکھتے وقت مصنف کے ذہن میں یہ
بات ضرور رہتی ہو گی کہ وہ اپنی ذات اور ذات کی خوبیوں کو جن سے پڑھنے
والا لاعلم ہے۔ اجاگر کر دے ــــــ اپنی خوبیوں کا اظہار اتنا نازک ہے
کہ ذرا سی لغزش سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے ایک فقرے
کا غلط استعمال ساری محنت کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ لیکن باکمال
مصور پس منظر میں اتنی فن کاری سے رنگ بھرتا ہے کہ تصویر اپنی تمام
جزئیات کے ساتھ خود بخود ابھرنے لگتی ہے۔ شورش بہت اچھے خطیب
بھی تھے۔ اپنی امرت سر کی تقریر کا حال لکھتے ہیں جس میں اپنی تعریف
خود نہیں کرتے ہیں۔ خود بخود بیان ہو جاتی ہے۔ جیسے حقیقت حال!

"میں کھڑا ہوا تو رنگ ہی دوسرا تھا مجھے اس تقریر پہ ہمیشہ
فخر رہے گا مجمع میری مٹھی میں تھا میں الفاظ سے گویا انسانی
عقلوں کا شکار کر رہا تھا جانے کیا جذبہ تھا جس نے انسانوں
کو مسحور کر لیا تھا میں عوام کو بہائے لیے جا رہا تھا اور لوگ
بہتے جا رہے تھے لوگ اتنے غضب آلود ہو چکے تھے کہ پورا
امرت سر ہل سکتا تھا میں خود اپنی خطابت کے سحر میں ڈوبا

---

[1] بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل۔ شورش کاشمیری صفحہ ۲۱۱

ہوا تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن فوراً کرسی سے اتر ے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ فرمایا رک جاؤ یہی وہ جادو ہے جس سے عقلیں شکار ہو جاتی ہیں۔ قرآن نے اس کو سحر کہا ہے لوگوں سے کہا بس گھروں کو چلے جاؤ جلسہ برخاست کیا جاتا ہے۔" [۵۱]

شورش کی خود نوشت اور آپ بیتیوں کا شمار بہترین ذاتیاتی تحریروں میں ہونا چاہیے ـــــ ان آپ بیتیوں کو پڑھ کر سب سے پہلا خیال ذہن میں آپ بیتی کی افادیت کا آتا ہے کہ یہ آپ بیتی کی ہی کرشمہ سازی ہے کہ شورش کی ولولہ انگیز طوفانی اور پر آشوب زندگی سے قاری آشنا ہو سکا ـــــ خدا جانے ایسی کتنی اور زندگیاں ہوں گی جو امتداد زمانہ کی نذر ہو گئیں ـــــ اور انھیں آپ بیتی کا قلم نصیب نہ ہو سکا۔

۵۱۔ بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل۔ شورش کاشمیری صفحہ ۲۲۲، ۲۲۳

یادوں کی برات

(جوش ملیح آبادی)

سنہ ۱۹۷۰ء

اردو میں اب تک جتنی بھی آپ بیتیاں منظر عام پر آ چکی ہیں ان میں جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی ہی ایسی ہے جو مختلف نفسیاتی گرہوں اور الجھنوں کی سب سے زیادہ آئینہ دار ہے۔ "یادوں کی برات"[1] کی شکل میں جو چیز سامنے آئی ہے وہ چھ برس کی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔

اپنی آپ بیتی کی ابتدا میں جوش صاحب نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک بار وہ اپنا نام بھول گئے تھے۔ قوی حافظے کا مالک نہ ہونا ایک چیز ہے اور نسیان کی یہ کیفیت ناقابل فہم ہے۔ اسی تسلسل میں لکھتے ہیں۔

"اگر میرے کسی واقعہ میں کمی بیشی یا تقدم و تاخر نظر آئے تو آپ اسے میرا ارادی فعل نہ سمجھیں اور میری حالت پر ترس کھا کر معاف کر دیں۔"[2]

---

[1] یادوں کی برات۔ جوش ملیح آبادی صفحہ ۱۰۲

[2] " " " " " ۱۸

جوش نے اپنے ذہن کی گرہیں کھولنے کی کوشش "خودکشائی" کے ضمنی عنوان کے ذیل میں کرتے ہوئے اپنی زندگی کے چار بنیادی میلانات۔ شعر گوئی۔ عشق بازی علم طلبی۔ اور انسان دوستی بتائے ہیں۔ شعر گوئی کے سلسلے میں انھوں نے کسی قدر انکساری سے کام لیتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ ان کی عقل بیدار نہیں ہے" اور بتایا ہے کہ وہ اپنی شاعری کے سلسلے میں کوئی قطعی رائے نہ قائم کریں گے فی الحقیقت جوش کی ساری شہرت ان کی شعر گوئی کی وجہ سے ہے۔ اور جن تین دیگر میلانات کا وہ ذکر کرتے ہیں ان کی حیثیت اس قدر ہے کہ ان سے ان کی شعر گوئی متاثر ہوئی تھی اور بس۔ ان تین موخر الذکر میلانات کی اہمیت جوش کی ذات اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے اور اس کا تجزیہ کرنے کے لیے بہرحال اپنی جگہ مسلم ہے۔ انھیں کے گرد گھوم کر آپ بیتی کے بارے میں رائے ظاہر کرنا ہوگی'

عشق بازی کی اصطلاح ہی ابتدا میں چونکا دینے کے لیے کافی ہے اور اس سلسلے میں جوش کی سی بے باکی اور برملاگوئی بلکہ عریانیت اردو کی کسی خود نوشت سوانح حیات میں نہ ملے گی۔ انھوں نے عشق کا فلسفہ اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اور کتاب کے آخر کے ،، صفحات کا تذکرہ جوان کے معاشقوں کے لیے وقف ہے۔ اس مرحلے پر ملتوی کر کے "چند ابتدائی باتوں" کے ایک اقتباس دیکھ کر آنے والی تحریر کے تیور کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

"۔۔۔ لیکن ماہ رخوں کی ناشکری اور سلونیوں کی نمک حرامی ہوگی اگر میں اس بات کا اعتراف نہ کروں کہ ان کے عشق کے بغیر میں آدمی بن نہیں سکتا تھا۔ میرا تمام کلام بالخصوص جمالیاتی شاعری کی کج کلاہی انھیں متوالیوں اور مدھ ماتیوں کی جوتیوں کا تصدق ہے اگر ان کی نظروں کے بان میرے دل کو چھلنی کر کے گداختگی نہ پیدا کر دیتے

تو خدا کی قسم مرتے دم تک میں گنگوہ شریف کا مولوی عبدالصمد ہی بنا رہتا۔" ۵۱

"میں نے کوئے بتاں میں جس قدر بھی دولت صحت جوانی اور زندگی مٹھیاں بھر بھر کر لٹائی ہے اس سے کہیں زیادہ ذہنی کمائی کر چکا ہوں۔ اور مکھڑوں کے خال چن چن کر میں نے اپنے گرد و پیش اس قدر عظیم سرمایہ جمع کر لیا ہے جسے آج تک گھر بیٹھے کھا رہا ہوں اور مرتے دم تک کھاتا رہوں گا۔" ۵۲

اپنی ساری جمالیاتی شاعری کا سلسلہ جوش نے اپنی عشق بازی سے ملایا ہے اور ان کی شاعری کا ایک حصہ "جذبات شباب کی بدن کشا سرمستی کا احساس" ہے اسی طرح ان کی آپ بیتی میں جگہ جگہ سوقیانہ پن کی بھرمار ہے۔ خود نوشت یہ ضرور تقاضہ کرتی ہے کہ اپنی ذات کے بارے میں جہاں تک ہو سکے بلا کم و کاست بیان کیا جائے۔ لیکن ادب بے ادبی کے حق میں نہیں ہے۔ متانت اور شائستگی اس کا جوہر ہے۔ سر رضا علی نے بھی ایک خاتون کا ذکر ہے۔ جس سے انھوں نے بعد میں شادی کر لی۔ عشق کی شدت کا حال انھوں نے بھی بیان کیا ہے لیکن کہیں مبتذل جملہ نہیں استعمال ہوا ہے۔ جوش کی تحریر کہیں کہیں ادب کے نازک مزاج پر بار معلوم ہوتی ہر ان کی نثر میں پرشکوہ الفاظ کا انبار ہے۔ تشبیہیں اور استعارے ہیں مترادفات کا استعمال ہے قافیہ پیمائی ہے لیکن متعدد جگہوں پر وہ چیز ہے جو ادب میں قابل قبول نہیں ہوتی ہے۔ اور وہ ہے پھکڑ پن —— یہ الگ بحث ہو کہ

---

۵۱ یادوں کی برات۔ جوش ملیح آبادی صفحہ ۵
۵۲ " " " " " ۵

ان کی عشق بازیوں میں کس قدر صداقت ہے اور کس قدر جھوٹ ہے۔ لیکن یہ بات بیشتر ادب نواز تسلیم کریں گے کہ اس میں بار بار ایسے مقامات آئے ہیں جہاں جوش سنجیدگی کو ٹھوکر مارتے گزر جاتے ہیں۔

علم طلبی کی بابت انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں بہت کسر رہ گئی ہے اپنی "گمراہی" پر انھوں نے فخر کا اظہار کیا ہے۔ اور اپنے نامہ اعمال کے سیاہ ہونے پر وہ فخر کا اظہار کرتے ہیں — لیکن کارخانہ قدرت کی حقیقت معلوم کرنے کے بارے میں انھوں نے کوئی علمی بحث نہیں چھیڑی ہے اور صرف اس قدر اعتراف کیا ہے —

"میں جاہل، نرا جاہل۔ اور بے پناہ جاہل ہوں —"[1]

ان کی گمرہی کی اس قدر شدت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ جن جن مراحل سے گزر کر اس مقام پر پہونچے تھے۔ ان کا تجزیہ کرتے۔ مطالعے اور مشاہدے وغیرہ کی تفصیل بیان کرتے لیکن انھوں نے ایسا نہ کر کے ایک تشنگی چھوڑ دی ہے۔ خالص علمی اور ادبی مسائل پر بھی انھوں نے اتنا نہیں لکھا جتنا کہ لکھنا چاہیے تھا۔ ذہنی نشو و نما اور ارتقاء کے سلسلے میں ان سے کچھ زیادہ ہی توقع کی جاتی تھی۔ اس کے بجائے انھوں نے ملیح آبادی اور غیر ملیح آبادی لوگوں کے ایسے کردار اور واقعات بیان کئے ہیں جن کی حیثیت لطیفے کی تو ہو سکتی ہے مگر جوش کی ذات کی تہوں اور پرتوں کو کھولنے میں اس سے کوئی مدد نہیں ملتی ہے ان کے زمانے میں اہم ادبی تحریکیں ہوئیں اور بڑھیں۔ مگر "یادوں کی برات" میں ہم یہ اندازہ نہیں لگا پاتے کہ جوش نے ان میں کیا حصہ لیا؟ جوش کے زمانے میں جو بڑے بڑے ادیب اور شاعر تھے ان کا کیا منصب تھا؟

---

[1] یادوں کی برات۔ جوش ملیح آبادی صفحہ ۸

اور انھوں نے جوش کو یا خود جوش نے ان کو کس طور پر متاثر کیا — ؟ اس حیثیت سے جوش کی یادوں کی برات مبہم ہے۔

انسانیت نوازی پر جوش نے اس انداز میں قلم اٹھایا ہے کہ جیسے اس میدان میں کوئی ان کا ہمسر نہیں ہے۔ وہ سوشلزم کا نام بھی لیتے ہیں اور ایسی دنیا بھی بنانا چاہتے ہیں جس میں قوم، وطن، مذہب وغیرہ کی تفریق نہ رہ جائے لیکن قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان کی اپنی زندگی میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جس سے کہیں بھی ظاہر ہوتا ہو کہ عملی میدان میں انھوں نے اس کام کے لیے کوئی قدم اٹھایا ہو —

جوش نے بچپن میں ملیح آباد سے پہلی مرتبہ لکھنؤ جانے کا تذکرہ بہت پرلطف انداز میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ لیکن انھوں نے اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے۔ کہ ۱۹۴۷ء کے آگ اور خون کے سیلاب کو جس نے پورے ملک کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ جوش کے حساس دل و دماغ نے کس طرح قبول اور برداشت کیا۔

جوش کی آپ بیتی کا جائزہ لینے کے لیے جوش کے ہم عصر دوسرے اہل قلم حضرات کی رائے سے بھی استفادہ کرنا جوش کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ ماہر القادری نے اپنے ماہنامے "فاران" کراچی میں یادوں کی برات پر فروری ۱۹۷۲ء میں تبصرہ کیا ہے۔ (یادوں کی برات اشاعت ۱۹۷۰ء)

ایک زینے کی سرگزشت کے عنوان سے اسے لکھنؤ کے ہفت روزہ "صدق جدید" نے بالاقساط نقل کیا اور کہیں کہیں حاشیے بھی دیے ہیں۔ پہلی قسط ۲۷ اپریل ۱۹۷۳ء کو صدق جدید میں شائع ہوئی ہے۔

"جوش ملیح آبادی نے کوئی شک نہیں کہ اپنے قلم کی پوری قوت اس کتاب میں صرف کردی ہے۔ یہ ایک مشاق ادیب اور عظیم شاعر کی خود نوشت سوانح عمری ہے جسے دل چسپ اور رنگا رنگ ہونا ہی چاہیے جہاں تک ہماری محدود معلومات کا تعلق ہے۔ دنیا کے کسی بڑے شاعر نے اس قدر شرح و بسیط کے ساتھ اپنی زندگی کے حالات قلم بند نہیں کیے — اور پھر لکھنے والے نے ڈھکی چھپی ہر بات کسی جھجک بےتکلف اندیشہ۔ ملامت اور خوف رسوائی کے بغیر بیان کردی ہے جوش صاحب جنسی معاملات ہوسناک واردات اور تجربوں کے اظہار میں شرم و غیرت کو بزدلی اور نامردی کہتے ہیں اخلاق باختگی ان کی نگاہ میں انسانیت کا سب سے بڑا شرف ہے"[1]

"اس کتاب میں لکھنؤ کے قدیم تمدن و تہذیب کی جھلکیاں ملتی ہیں بہت سی معروف اور غیر معروف شخصیتوں کا اس کتاب کے ذریعے تعارف ہوتا ہے۔ مثلاً حکیم آزاد انصاری کو آج کون جانتا ہے۔ مگر "یادوں کی برات" بتاتی ہے کہ وہ کیا تھے — ؟

اس کتاب میں اردو کے ایسے بہت سے الفاظ محاورے اور کہاوتیں آگئی ہیں جن کو آج کی نسل بڑی تیزی سے بھولتی جارہی ہے۔ تیوہاروں کھیلوں۔ مٹھائیوں۔ کھانوں پکوانوں زیوروں اور کپڑوں وغیرہ کے ناموں کے اعتبار سے یہ

---

[1] صدق جدید لکھنؤ (پہلی قسط) مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۷۳ء

کتاب معلومات آفریں بھی ہے۔ جوش صاحب نے یہ کتاب اس قدر ریاضت محنت اہتمام قصد و عزم اور خود اعتمادی کے ساتھ لکھی ہے جیسے انہیں یقین ہے کہ ان کی شاعری کی طرح ان کی نثر نگاری کا بھی لوگ لوہا مان لیں گے! مگر اتنی سعی و کوشش کے باوجود یادوں کی برات میں زبان و بیان کی کمزوریاں اور لغزشیں پائی جاتی ہیں ـــــ ماہر القادری نے کسی قدر تفصیل سے ان لغزشوں کی گرفت کی ہے ـــ"[51]

"جناب جوش ملیح آبادی مترادف الفاظ جمع کرنے کو شاید انشاء پردازی کا کمال سمجھتے ہیں مگر ان کا یہ انداز نگارش پڑھنے والے میں اکتاہٹ اور بدمزگی پیدا کر دیتا ہے۔"[52]

"فانی بدایونی کے متعلق جوش نے جو کچھ لکھا ہے اس کے بارے میں ماہر القادری نے بتایا ہے کہ اس سلسلے میں جوش صاحب نے کئی جھوٹ بولے ہیں، جوش ملیح آبادی نے اپنی عشق بازی تماش بینی اور ہوسناکی کے جو واقعات لکھے ہیں ان میں واقعیت سے زیادہ افسانہ اور ناول کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ـــــ جوش صاحب نے اپنی خاندانی امارت بلکہ یوں کہیئے کہ نوابی کا اس قدر شد و مد سے ذکر کیا ہے جیسے ان کے باپ دادا اودھ کے زمیندار نہیں کسی ریاست کے فرمانروا اور والئ ملک تھے اور ان کے خاندان کی جائداد اور آمدنی رام پور اور بنارس

---

51 صدق جدید لکھنؤ (دوسری قسط) مورخہ ۴ مئی ۱۹۷۳ء صفحہ ۵
52 " " (تیسری قسط) مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۷۳ء صفحہ ۴

کی ریاستوں کے لگ بھگ تھی ۔ ۵۱

"جوش صاحب افسانہ طراز ہی نہیں گپ ساز بھی ہیں"۔ ۵۲

"میر جعفر زٹلی آج زندہ ہوتے تو جوش صاحب کے آگے کان ٹیک کر استاد زندہ باد کے نعرے لگاتے ۔" ۵۳

جوش صاحب نے لکھا ہے کہ وہ قوی حافظے کے مالک کبھی نہیں رہے۔ ایک روز گھر کا راستہ بھول گئے۔ پھر ایک دن تخلص بھول گئے اس کا ذکر کرتے ہوئے ماہر القادری نے لکھا ہے۔

"اپنی شخصیت کے بارے میں اعجوبگی اور انوکھا پن پیدا کرنے کے لیے جوش صاحب نے یہ باتیں لکھی ہیں۔ مرے شیر نے شاید یہ قسم کھا رکھی ہے کہ جو بات بھی لکھوں گا اس میں اصلیت اگر ہو سکی تو بقدرِ نمک ہو گی۔ باقی مبالغہ۔ نمک مرچ۔ افسانہ طرازی اور دروغ بیانی۔

جوش ملیح آبادی نے خود اپنی اور اپنے بعض رشتے داروں کی بے رحمی شقاوت۔ ظلم۔ سنگ دلی اور مردم آزاری کے جو واقعات لکھے ہیں ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاعر انقلاب نے کس ماحول اور کس گھرانے میں پرورش پائی اور بچپن ہی سے ان کی فطرت کس قدر کٹھور اور سنگین ہو گئی تھی ۔" ۵۴

---

۵۱ صدق جدید لکھنؤ چوتھی قسط ۱۸ مئی ۱۹۷۳ء صفحہ ۵

۵۲ " " " چھٹی قسط یکم جون ۱۹۷۳ء صفحہ ۷

۵۳ " " " ساتویں قسط ۸ جون ۱۹۷۳ء صفحہ ۵

۵۴ " " " " " " صفحہ ۷

"پوری کتاب میں دو چار صفحوں پر عامۃ الورود سننے سنائے علمی مسائل کی کچھ جھلکیاں آگئی ہیں مگر باقی صفحات علم کے بارے میں کورے ہیں ـــــ ساڑھے سات سو صفحات کی کتاب میں ایک باب تو ایسا ہونا چاہیے تھا جس میں وہ اپنی علم طلبی اور کتابی مطالعے کی کچھ جھلکیاں دکھا دیتے۔ دار الترجمہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) جس میں وہ ناظر ادب رہے ہیں اس کا اجمالی تعارف کرا دیتے۔ اور فلسفہ و منطق اور دوسرے علوم کے مصطلحات اردو تراجم کے کچھ اقتباسات اور نمونے پیش فرما دیتے تو بھی ان کی علم طلبی اور علم سے دلچسپی پر روشنی پڑتی مگر یہ تمام وہ اس وقت کر سکتے تھے جب ان کا علمی مزاج ہوتا اور حصول علم کے لیے انھوں نے ریاضت و مشقت کی ہوتی۔ نثر و نظم میں ان کی ذہانت کی جلوہ گری تو ملتی ہے مگر علم نہیں ملتا ـــــ" [1]

صدق جدید میں مولانا عبد الماجد دریابادی نے تبصرہ دو شماروں میں مورخہ ۲۸ جولائی ۱۹۷۳ء اور ۳ اگست ۱۹۷۲ء میں کیا ہے۔ "ایک گندی کتاب" عنوان ہے:-

"جوش صاحب ملیح آبادی ثم پاکستانی کا شمار وقت کے مشہور بلکہ نامور شاعروں میں ہے۔ اور زبان پر انھیں عبور ہی نہیں کہنا چاہیے کہ حیرت انگیز ملکہ حاصل ہے علاوہ شاعری کے لغت کا کام بھی اچھا خاصا کر سکتے ہیں بلکہ ایک بڑی حد تک انجام دے چکے ہیں اب انھوں نے خدا معلوم کن نادان مشیروں کے کہنے سننے میں آ کر اپنی

---

[1] صدق جدید لکھنؤ مورخہ ۸ جون ۱۹۷۳ء صفحہ ۷

ایک آپ بیتی ساڑھے پان سو صفحات کی ضخامت کی یادوں کی برات کے نام سے لکھ کر شائع کر دی۔ یہ برات اگر کسی تشریف۔ مہذب۔ نستعلیق شہری کی تو نہیں البتہ اجڈ۔ دیہاتی۔ گنوار کی ہو سکتی ہے جو ٹھرا۔ دارو۔ مہوے کی شراب پئے گالی بکتے "جھکتے" چلے جاتے ہیں اور ان کے جسم پوئے فحش کے بھبکے چھوڑتے جا رہے ہیں۔ برات اگر اسی کا نام ہے تو تف ہے ایسی برات پر موزوں نام تھا "یادوں کی کوڑا گھاٹ"۔ ۵۱

" ابواب کتاب کی ترتیب نہ تاریخی ہے نہ منطقی نہ نفسیاتی بس جو واقعہ جہاں بھی یاد رہ گیا وہیں اسے ٹانک دیا ہے حافظہ جوش صاحب کا کسی زمانے میں چاہے کیسا بھی رہا ہو اب اس سن میں تو شاید بادہ خواری کی برکت سے خاصہ جواب دے چکا ہے"۵۲

" زبان بحیثیت مجموعی اچھی ہے اور ان کے سے ادیب کے شایانِ شان اور بعض بعض ٹکڑے تو بے ساختگی کے لحاظ سے بے مثل و بے مثال۔ لیکن ایسا ہر جگہ نہیں ہے۔ اور جو ٹکڑے خوش وقتی کے وقت میں لکھے ہیں وہ اختلال حواس کی نذر ہو گئے ہیں۔ ـــــ اور کہیں کہیں پر قافیہ کے جوش و غلو میں دب کر عبارت مہمل بن گئی ہے اور کہیں کہیں لفظ قلم سے غلط نکل گیا ہے"۔ ۵۳

" فحش پسندی قلم کی ہر جنبش پر غالب ہے شاعرانہ تشبیہ بھی

---

۵۱ صدق جدید لکھنؤ مورخہ ۲۸ جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۴
۵۲ " " " مورخہ ۴ اگست ۱۹۷۲ء صفحہ ۴
۵۳ " " " " " " صفحہ ۴

سوجھتی ہے تو پھکڑ قسم کی پھبتی ہو کر۔" [51]

"کتاب فنی اعتبار سے بھی کچھ یونہی ہے۔" [52]

"ان پر آخر وہ دور کب اور کس سن میں گزرا ہے جب انھوں نے علوم کا مطالعہ سنجیدگی سے کیا تھا۔ فلسفہ و حکمت کی کون کون سی کتابیں کس زبان میں پڑھی تھیں۔ ؟ اس نشان دہی سے ان کے نیازمندوں کو بڑی مدد مل جاتی۔۔۔" [53]

جناب ماہر القادری اور مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کی رائے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جوش کی آپ بیتی میں جس بے باکی اور جرأت کا استعمال ہوا تھا۔ ہمارے اکثر قارئین اور سنجیدہ طبقہ اس کی تاب نہ لا سکا اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی شاعری کی طرح آپ بیتی میں بھی جوش شدت پسندی کا شکار ہو گئے ہیں ــــ باقر مہدی نے اپنی کتاب "تنقیدی کش مکش" کے ایک مضمون میں یادوں کی برات کا تنقیدی جائزہ اسی اعتبار سے لیا ہے۔

"آج تک مشرق میں مذہب کی دقیانوسیت کا اتنا گہرا اثر ہے کہ کوئی آزادانہ بحث تک کرنے کا روادار نہیں ہے۔ خاص کر جنسی آزادی کا مسئلہ۔ ایسے تنگ اور دقیانوسی ماحول میں جوش سا رند اپنا اعمال نامہ لکھتا ہے تو سب کا خفا ہونا یقینی تھا اور یہی ہوا۔" [54]

---

[51] صدق جدید لکھنؤ مورخہ ۴ ر اگست ۱۹۷۰ء صفحہ ۴

[52] " " " " " "

[53] " " " " " "

[54] تنقیدی کش مکش۔ باقر مہدی صفحہ ۱۰۰۔ ۱۰۱

"جوش نے اپنی جوانی کی سرمستیوں کی داستان نہایت بے باکی کے ساتھ بیان کی ہے۔ اسی طرح اپنے سیاسی خیالات کا اظہار کرنے میں بھی وہ نہیں جھجکتے ہیں ان پر یہ الزام تو لگایا نہیں جاسکتا کہ وہ سب من گھڑت قصے بیان کر رہے ہیں۔ البتہ حافظے کی کمزوری ــــ اور ماضی کے قصے کی بازیافت ایک قسم کے مبالغے میں لپٹی ہوئی ہی آسکتی ہے۔ اپنے عنفوان شباب کے ہندوستان کا لباس، سواری پکوان کی لمبی چوڑی فہرست جو آج جوش کے علاوہ کوئی لکھنے کی جرأت نہیں کرسکتا ہے ــــ الفاظ کا ایک سمندر کا غذ پر لہریں مارتا نظر آتا ہے۔"[51]

"یادوں کی برات ایک Formless بے ہئیت کتاب ہے اور جوش کی نظموں کی طرح ہر طرف بکھری ہوئی ہے لیکن ان کی شاعری کی طرح بے حد دلچسپ ہے پڑھنے کے لائق ہے اور اپنی نوعیت کی انوکھی خود نوشت سوانح عمری ہے۔"[52]

فحش نگاری کی بدولت جوش صاحب کی جو لے دے ہوئی ہے اور جس طرح مطعون ٹھہرائے گئے ہیں اس باب میں ڈاکٹر وحید اختر صاحب کی رائے بھی قابل غور ہے۔

"جوش صاحب نے اپنے تجربات کے سلسلے میں لفاظی اور تصنع سے کام نہیں لیا نثر رواں بھی ہے اور جاندار بھی خصوصاً اس کے وہ حصے جو شخصیات کے متعلق ہیں اردو شخصیت نگاری میں

---

[51] تنقیدی کش مکش۔ باقر مہدی صفحہ ۱۱۵

[52] " " " " " صفحہ ۱۱۵

اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک فحش لطائف عریاں
نگاری، جنسی تجربات اور لذت کوشی کی ترجمانی کا سوال ہے
شاید جوش سے زیادہ اردو میں کوئی دوسرا اس کا حق ادا بھی
نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ نہ تو دوسروں کے تجربات اتنے متنوع ہوں
گے نہ زبان ان معاملات کے بیان میں یاوری کر سکتی ہے جیسی
جوش کی شخصیت اور زبان نے کی ہے۔ جوش کو اہل اردو سے
مردانگی کی کمی کی شکایت ہے اسی لیے وہ بہت سی باتوں کو ناگفتنی
چھوڑ گئے ہیں۔ جس کا انھیں قلق ہے مگر جتنا کچھ ان کے قلم سے
گفتنی بنا ہے وہی شاید ہماری تہذیب کی ریاکاری اور نقاب
در نقاب طرز بیان کے لیے مشکل سے ہی قابل قبول ہوگا۔"[1]

جوش پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ جوش نے دولت کی طمع اور خوش حالی
کے وعدوں پر ترک وطن کیا۔ آج اکثر حضرات کی جوش سے ناپسندیدگی
کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ باوجود حب الوطنی کا دعویٰ کرنے کے جوش صاحب
ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ آج اس شکستہ شاعر کی خودنوشت
سوانح حیات پڑھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ پشیمانی جوش
کو ہے مگر جوش اس کی صفائی دیتا ہے۔ اپنی ناکامیابیوں کے گلے میں
فتح و نصرت کے ہار نہیں ڈالتا ــــ وہ اپنی تلوار خم ضرور کرتا ہے مگر اس
شکست میں بھی ایک سپاہی کی آن بان ہے جوش کی زندگی کے اس
پہلو پر بھی ڈاکٹر وحید اختر نے روشنی ڈالی۔

"مگر اس دولت کوشی کی تہ میں بھی عقل معاش کی حیرتناک

---

[1] ہماری زبان (علی گڑھ) از ڈاکٹر وحید اختر مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۷۳ء صفحہ ۱۱

کمی اور سیاسی معصومیت کا دفرما نظر آتی ہے جوش کی شخصیت
کا یہ پہلو تضادات کا حامل ہے ایک طرف وہ راجوں۔ نوابوں۔
امیروں اور وزیروں کے ممنون کرم ہوئے بھی ہیں تو اس طرح
جیسے اپنی شاعری کا خراج وصول کر رہے ہوں دوسری طرف
انھوں نے اپنی ذاتی جائیداد کا بڑا حصہ حاصل کرنے یا باقی
رکھنے کی کوئی سعی نہ کی۔ اس پر دوسرے قابض اور متصرف
رہے۔ انھیں جائیداد سے محروم بھی کر دیا۔ مگر انھوں نے مروت
اور وضعداری کا دامن نہ چھوڑا۔ وہ اپنے دوستوں کی مدد
اور سفارش میں ہمیشہ سرگرم رہے اس معاملے میں ان کا حد
سے زیادہ خلوص اور سادگی ان کے لیے مضر بھی ہوا۔ یہ ان کے
اگلے وقتوں کی شرافت کا ثبوت ہے۔ جوش کی شخصیت کا یہی
پہلو سب سے زیادہ خوب صورت ہے۔" [1]

جوش کی یادوں کی برات زندگی کے کارواں کے ساتھ سفر کرنے والے
کسی راہ رو کی آپ بیتی نہیں بلکہ ایک تنہا مسافر کی سرگزشت ہے۔ اس
کو پڑھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کوئی زندہ لاابالی اپنے گرد و پیش
سے بے نیاز خود اپنی دھن میں سرشار ہنستا کھیلتا۔ گنگناتا چلا جا رہا ہے
البتہ کہیں جب اس کا دل چاہتا ہے تو وہ کسی خوش نما منظر کی یا محفل کی
طرف قاری کی توجہ مبذول کرا دیتا ہے۔ یا کسی دل چسپ شخص یا پر لطف
واقعے سے اسے بھی متعارف کرا دیتا ہے۔

جوش ملیح آبادی کی خود نوشت اردو کی پہلی خود نوشت ہی نہیں

---

[1] ہماری زبان (علی گڑھ) مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۷۲ء صفحہ ۱۱

بلکہ ان چند کتابوں میں سے ہے جس کی تعریف یا تنقیص پر اتنا کچھ لکھا گیا۔ کسی چیز کے خلاف اتنی شد و مد سے لکھا جانا اس بات کا نفسیاتی ثبوت ہو کہ مخالف اس کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ یا اس کی اہمیت سے خوف زدہ ہے گو کہ کسی مخالف نے کھلے لفظوں میں اس کا اعتراف نہیں کیا مگر بین السطور سے یہ واضح ہوتا ہے۔

یادوں کی برات کی بہت سی خامیوں اور مخالفوں کی پرزور مخالفت کے باوجود یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہو کہ اردو کی کوئی اور خود نوشت اتنی مقبول نہیں ہوئی اور نہ ہی اتنے زیادہ لوگوں کی نظر سے گزری ہوگی۔

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں

(خواجہ غلام السیدین)

۱۹۷۴ء

اردو داں ماہرین تعلیم میں خواجہ غلام السیدین واحد شخص ہیں جنھوں نے اپنی خود نوشت قلم بند کی لیکن موت نے مہلت نہ دی۔ تعلیم کے ممتاز ماہرین میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا مقام سب سے بلند ہے لیکن انھوں نے کوئی آپ بیتی نہیں چھوڑی۔ اس اعتبار سے سیدین کی کتاب منفرد ہے اگر یہ خود نوشت مکمل ہو جاتی تو اندازاً ایک ہزار صفحات کا احاطہ کرتی ہو۔ مرحوم سیدین نے بارہ عنوان قائم کیے تھے جن میں سے صرف تین لکھ سکے اور یہ تین ۲۶۰ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ نو عنوانات میں کم سے کم ایک ایسا ہے جو آپ بیتی کے نقطۂ نظر سے شاید اہم ترین ہوتا وہ ہے "سفینہ جبکہ کنارے سے آلگا غالبؔ" زندگی پر نگاہ بازگشت کی بیشتر کہانی ان کہی رہ گئی ہے۔ اس کا افسوس تو ظاہر ہے مگر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا جائزہ اس روشنی میں لینا چاہیے کہ مصنف ماہر تعلیم تھا

اور علی گڑھ سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ ان دونوں باتوں کی چھاپ دیگر تمام امور پر حاوی ہے۔۔

خواجہ غلام السیدین کی چھوٹی بہن صالحہ عابد حسین اسی قیمتی سودے کو ۱۹۷۲ء میں منظر عام پر لانے کے لیے شکریے کی مستحق ہیں۔ انھوں نے دیباچے میں لکھا ہے کہ ــــ

"ــــ خواجہ غلام السیدین نے اپنی یہ خود نوشت سوانح کئی برس پہلے لکھنا شروع کی تھی مگر صد حیف کہ وہ اسے پورا نہ کر سکے ــــ" [۵۱]

جتنی خود نوشت خواجہ صاحب نے لکھی تھی وہ اس حالت میں نہ تھی کہ بغیر نظر ثانی کے شائع ہو سکتی پھر شاید غلط فہمی رفع کرنے کے اندیشے سے یہ وضاحت کی ہے کہ

"ــــ عبارت میں دخل در معقولات کی گستاخی تو نہیں کر سکتی تھی البتہ کہیں کہیں لفظوں کی ترتیب بدلنے یا خالی جگہ پر کرنے کی جرأت کی ہے ــــ" [۵۲]

سیدین نے اس کتاب کو لکھنے کا جواز بھی پیش کیا ہے۔

"میری خواہش یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ میں بیشتر اپنی زندگی کے حالات بیان کروں بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کی کچھ داستان سناؤں جن سے گزشتہ ساٹھ سال سے مجھے سابقہ پڑا ہو جن کی صحبت سے میں نے فیض اٹھایا ہے جن میں سے بعض کی

---

۵۱ مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں۔ خواجہ غلام السیدین صفحہ، دیباچہ از صالحہ عابد حسین

۵۲ " " " " " صفحہ ۱۱ " " " "

زندگی میں میں نے ان قدروں کا جلوہ دیکھا جن کی بدولت
انسان کبھی کبھی اپنی ابتدائی زندگی کی کیچڑ سے نکل کر آسمان
کی رفعتوں تک جا پہونچتا ہے اگر کسی شخص کو یہ خوش قسمتی نصیب
ہو تو اس کا فرض ہے کہ اپنی استعداد کے مطابق اس میں دوسروں
کو شریک کرے"۔ ۵۱

پہلا باب اپنے بچپن سے متعلق ہے "خواب ہے جو کچھ کہ دیکھا" اس کی
شروعات خوب ہے اور بظاہر ان لوگوں پر طنز کیا ہے جو اپنی پیدائش
اور عنفوانِ شباب کے دنوں کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے یہ ساری
باتیں ان کی یادوں کے ذخیرے سے باہر لائی گئی ہوں۔ ابتدائی چند
سطریں ملاحظہ ہوں۔

"بعض لوگ اپنی پیدائش اور ابتدائی زندگی کا حال اس طرح
بیان کرتے ہیں گویا وہ اس وقت سعید خود موجود تھے اور انھوں
نے اس کی تقریبوں میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ میری سمجھ میں آج
تک یہ نہیں آیا کہ دنیا کے لیے اس بات کی اہمیت کیا ہے۔ کہ
فلاں شخص فلاں دن، فلاں مہینہ، فلاں سال اور فلاں
وقت پیدا ہوا۔ پیدا ہونا تو برحق ہے اس سے کون کافر انکار کر سکتا
ہے۔ شاید ہوتا یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی زبانی سن کر بچوں کو ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود ان کی یاد کا کمال ہو کہ انھیں اپنے بچپن کے
حالات اتنی چھوٹی سی عمر سے یاد ہیں"۔ ۵۲

---

۵۱ مجھے کچھ کہنا ہے اپنی زبان میں۔ خواجہ غلام السیدین صفحہ ۱۸
۵۲ " " " " " " " " صفحہ ۳۱

سیدین نے واضح طور پر اعتراف کیا ہے کہ انھیں اپنی زندگی کے ابتدائی چند سال کا کوئی واقعہ یاد نہیں۔ سنی سنائی روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے والدین کی کبھی کوئی حکم عدولی نہیں کی — آپ بیتی کے اعتبار سے یہ ایک اچھا طرز بیان ہے کیونکہ انھوں نے اپنی زندگی کے بیان میں حافظے اور یادوں کو بطور گواہ نہیں پیش کیا ہے۔ ابتدائی زندگی کی ساری باتیں صداقت سے کام لے کر سنی سنائی باتوں کے حوالے سے بیان کی گئی ہیں۔ لیکن یہ صرف اپنا تذکرہ ہی نہیں ہے۔ اپنے ساتھ ساتھ ماحول کی منظر کشی ہوتی جاتی ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی کا جب انتقال ہوا تو سیدین کی عمر دس سال تھی ان کے بارے میں جو دھندلی سی تصویر بنتی ہے سیدین نے وہی بنائی ہے۔

"بچپن کی یادوں میں جو اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں ایک محبوب یاد خواجہ الطاف حسین حالی کی ہے ان کے انتقال کے وقت میری عمر کوئی دس سال کی ہو گی لہذا میں اس وقت ان کی شاعرانہ عظمت اور اہمیت کو تو کیا سمجھتا لیکن جب میں ان سے ملتا تو یہ احساس ہوتا کہ ایک بہت ہی شفیق اور فرشتہ صفت انسان سے مل رہا ہوں (یہ لفظ تو اس وقت نہ جانتا تھا لیکن فرشتے کا کچھ ایسا ہی شعور میرے ذہن میں تھا)" [۵]

مولانا حالی کی موت سیدین کے لیے موت کا پہلا شعوری تجربہ تھی۔ یہ تجربہ ان کی ذہنی نشو و نما میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتا تھا۔ تصیاتی

---

[۵] مجھے کہنا ہے کچھ۔ خواجہ غلام السیدین۔ صفحہ ۳۶

زندگی۔ پرانے دور کی خوبیاں۔ عورتوں کی تعلیم۔ لکھنے کی ممانعت بزرگوں کی بے انتہا تعظیم یہ سب تذکرے ایک تسلسل سے کرنے کے بعد وہ اس مقام پر پہونچ جاتے ہیں جہاں ان کا تعارف اپنے والد کے کتب خانے سے ہوتا ہے۔

"مطالعے کی جو عادت پڑ گئی۔ وہ گویا عمر بھر کا روگ بن گئی۔"[۵۱]

علی گڑھ کی طالب علمی کا زمانہ ان کی زندگی کا اہم زمانہ تھا اس درس گاہ سے سیدین نے بہت کچھ حاصل کیا۔ اس کا اعتراف کئی جگہ کیا ہے یہاں زبانیں سیکھیں۔ لفظوں کے جادو سے متعارف ہوئے۔ کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ لکھنے اور تقریر کرنے کا فن سیکھا۔ یہ عطیات یہیں ختم نہیں ہوتے ہیں۔ ان کی جھولی میں علی گڑھ نے صرف درسی مضامین کا علم نہیں ڈالا۔ بلکہ اور بھی بہت سے بیش قیمت تحفے دیئے: ذہنی مسرت کی تلاش۔ ہم خیال دوستوں کی رفاقت کی دولت جس میں زبان۔ مذہب ملت کی کوئی قید نہ تھی۔ کتابوں کی محبت اور فکر کی دنیا میں پروانہ راہداری ــــ علی گڑھ میں انھوں نے عقل و علم کا جیتا جاگتا جلوہ دیکھا ہے۔ ان میں گاندھی جی ــ مولانا آزاد۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ــ علامہ اقبال اور سروجنی نائیڈو وغیرہ تھے۔

انگلستان کے سفر، ٹیچرس ٹریننگ۔ اور کشمیر کی ملازمت میں سیدین نے بہت کچھ کیا نصاب تعلیم میں اصلاح ان کا بڑا کارنامہ ہے اس کو انھوں نے بہت روشن رنگوں میں پیش کیا ہے مگر انکسار کا پہلو ہر جگہ نمایاں ہے۔ جس سے کچھ نہ کہہ کر بھی سیدین نے اپنے کردار کے بارے میں بہت کچھ کہہ دیا

---

۵۱ مجھے کہنا ہے کچھ۔ خواجہ غلام السیدین۔ صفحہ ۵۷

طالب علمی کے زمانے کے ساتھیوں۔ استادوں۔ قومی لیڈروں اور دیگر لوگوں کی قلمی تصویریں پیش کر کے انھوں نے اپنا جو تعلق بیان کیا ہے۔ یہ آپ بیتی کی پرانی روایت ہے۔ جسے سیدین نے برقرار رکھا۔

کتاب کا پہلا حصہ "عزیز سیدین" پر ختم ہوتا ہے۔ اس حصے میں نو عنوانات ہیں۔ آخری عنوان "عزیز سیدین" سیدین نے اپنی محبوب بیوی "عزیز جہاں" کے انتقال پر ان کی دائمی مفارقت کے غم انگیز جذبات سے پر ہو کر لکھا ہے۔ پوری کتاب میں سیدین کی ذات اور شخصیت کی جتنی مکمل عکاسی اس عنوان کے تحت لکھی تحریر میں ہوئی ہے کسی دوسرے باب میں نہیں ہوئی ہے ـــــ چونکہ سیدین کی طبیعت میں انکسار اور جھجک کا مادہ تھا۔ اس لیے اپنے احساسات۔ اپنی ذات کے بارے میں کھل کر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ ہمیں اس کتاب کے اسی حصے میں ملتے ہیں۔

"ہر شخص اپنی زندگی میں دوسروں کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرے اور جو کچھ نیکی کسی کے ساتھ کرنی ہے وہ ابھی کرے۔ کیونکہ دیر یا سویر وہ ناگزیر وقت آئے گا جب گھنٹہ بج جائے گا۔ دوست اور محبوب جدا ہو جائیں گے۔ اور ہمیں ان کے ساتھ نیکی کرنے کا موقع نہ ملے گا۔ کس قدر حسرتیں اب دل میں ابھرتی ہیں کہ تمھارے لیے یہ کیا ہوتا۔ وہ کیا ہوتا ـــــ لیکن اب کیا ہوتا ہے؟"[۵۱]

صالحہ عابد حسین نے جیسا کہ ابتدا میں لکھا ہے۔

"کہیں کہیں لفظوں کی ترتیب بدلنے یا خالی جگہ پر کرنے

---

۵۱ مجھے کہنا ہے کچھ۔ خواجہ غلام السیدین صفحہ ۳۱۶

کی کوشش کی ہے۔"[1]

لیکن بعض جگہ پر وہ خود بھی کچھ نہیں لکھ پائی ہیں کیونکہ مسودے میں کچھ صفحات خالی ملے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ پتہ چلنا ناممکن ہے کہ وہ اس جگہ پر کیا لکھنا چاہتے تھے۔ اس جگہ پر کچھ بھی لکھنا قیاسی گھوڑے دوڑانا ہوگا۔

---

[1] مجھے کہنا ہے کچھ۔ خواجہ غلام السیدین۔ صفحہ ۱۱

اپنی تلاش میں

(کلیم الدین احمد)

۱۹۷۵ء

اردو تنقید نگاری میں کلیم الدین احمد اپنے مخصوص لب و لہجہ کی وجہ سے دور ہی سے پہچان لیے جاتے ہیں ان کی تنقیدیں اور ان کے چونکا دینے والے جملے ان کے گرد انفرادیت کا ہالہ بناتے ہیں کلیم الدین احمد کے بارے میں جاننے کا اشتیاق اردو دانوں میں عام ہے ان کی شخصیت اس لیے بھی پراسرار رہی ہے کہ ان کے رسالے "معاصر" اور ان کی تحریروں کے علاوہ ذاتی زندگی کی پرچھائیاں بہت کم ملتی ہیں۔ اس لیے اپنی خود نوشت سوانح حیات "اپنی تلاش میں" جب وہ اپنی ذات کی تلاش میں نکلتے ہیں تو ہمیں بہت سی توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن اپنی سرگزشت بیان کرنے کے بنیادی مقصد سے وہ ابتدا ہی میں اتنی دور چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ اپنے موضوع سے یہ غیر متعلق طوالت بھی قاری کے لیے گوارا بن جاتی ہے اگر انداز بیان میں تازگی اور شگفتگی

ہوتی۔ اسی لیے اس کتاب کو انتہا تک پڑھنا صبر آزما ہو جاتا ہے۔

بالکل ابتدا میں کچھ فلسفیانہ قسم کی بحث چھیڑنے کی کوشش کی ہے ان کی بحث اپنی پیدائش کے بارے میں ہے۔ کہ پیدائش فلاں تاریخ کو فلاں دن کو ہی کیوں ہوئی؟

"قدرت کا کوئی اندھا قانون تھا یا خمیر قدرت میں اس کی کوئی وجہ بھی موجود تھی۔" [1]

پھر اس کے کچھ ہی بعد لکھتے ہیں۔

"نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟ خدا ہوتا؟ کچھ نہیں ہوتا؟ یہ تو محض شاعری ہے سوال یہ ہے! ہونے نے مجھ کو ڈبو دیا یا تیرایا؟ بلبلا ابھرتا ہے پھر ٹوٹ جاتا ہے یہ بننا بگڑنا کیوں؟ دریا کو بلبلوں کے بننے بگڑنے کی خبر ہے یا وہ بے خبر ہے۔" [2]

اپنی خود نوشت میں کلیم الدین اکثر اپنے موضوع سے دور جا نکلتے ہیں یہ بے ربطی ان کی خود نوشت میں تقریباً ہر جگہ کارفرما ہے۔ ایک جگہ یہ اظہار خیال کرتے ہیں۔ کہ ہر شخص یہاں تک کہ خدا بھی مجموعۂ اضداد ہے

"تضاد تو حقیقت ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اپنی حقیقت تک کیسے پہونچا جائے۔ اسے آئینہ کیسے دکھایا جائے۔ آئینہ تو اپنی آنکھوں کا ہے۔ دوسری آنکھوں کے آئینوں میں دیکھا جائے تو یہاں بھی دشواری ہے ان آئینوں میں بھی عکس بدل اور بگڑ جاتا ہے اور نامۂ اعمال میں تو مل ہی نہیں سکتا۔ جس میں

---

[1] اپنی تلاش میں۔ کلیم الدین احمد صفحہ ا
[2] ،، ،، ،، صفحہ ۳

شاید صحیح حلیہ ہو بحر خیالات کا پانی گہرا سہی لیکن اس کی تہہ کو ٹٹولنا ضروری ہے۔ آگے دیکھیں کیا کیا چیزیں نکلتی ہیں۔"[۵۱]

تہہ کو ٹٹول کر وہ جو چیز لاتے ہیں وہ ہماری متوقع آپ بیتی سے منفرق اشعار۔ غزلوں اور نظموں کے طول طویل سلسلے، ۲۷ صفحات کے حصہ اول میں ملتے ہیں۔ ان طویل شعری حوالوں کی آپ بیتی میں کہاں گنجائش ہو سکتی ہے ؟

ان اشعار کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا ہے کہ قاری ان سیکڑوں اشعار کا مطالعہ کر کے کلیم الدین احمد کی تحلیل نفسی کرے۔ اشعار کا یہ انتخاب اس دور کے ادبی مزاج اور مصنف کے ادبی ذوق کے اظہار میں مددگار ثابت ہوتا۔ اگر اس میں بھی ترک اور انتخاب سے کام لیا جاتا کیونکہ ذاتی مطالعہ الگ چیز ہے اور اپنی ذات اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ مصنف کو اپنی اس طول بیانی کا احساس بہت کم ہے۔ ہاں اس عیب پر ان کی نظر ضرور ہے۔

"مولانا محمد علی جوہر کی تقریریں ضرورت سے زیادہ لمبی ہوتی تھیں"[۵۲]

یا پھر روش صدیقی کی ایک نظم "اسرار" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"جو بات آٹھ مصرعوں میں کہی گئی وہ دو مصرعوں میں کہی جا سکتی تھی۔"[۵۳]

کلیم الدین احمد کے مزاج اور کردار کی تشکیل میں تین واضح عناصر کی

---

۵۱ اپنی تلاش میں ۔ کلیم الدین احمد صفحہ ۳
۵۲ " " " " صفحہ ۲۱۶
۵۳ " " " " صفحہ ۲۳۱

نشاندہی کی جاسکتی ہے ان میں پہلا اور سب سے اہم اثر ان کے والد ڈاکٹر
عظیم الدین احمد کا ہے جو جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری لائے تھے
اور اپنے دور کی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔

دوسرا اہم اثر وہابیت کا ہے جس پر کلیم الدین احمد نے دو ابواب
صرف کئے ہیں یہاں کلیم الدین احمد عام ہندوستانی مسلمان کے تاثرات و
تعصبات کی نمایندگی کرتے نظر آتے ہیں جو ان کی منطقی فکر اور جدید
ذہن کے برعکس ہے۔ مذہب اور شرک وغیرہ کے موضوعات پر بھی اپنی
رائے کا اظہار تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں۔ اپنی تشکیک کا اظہار بھی
کرتے ہیں مثلاً حضرت آدم کو سجدہ

"خدا نے خود شرک کی دعوت کیوں دی؟ اس قسم کے سوالات
اٹھتے تھے لیکن جواب نہ ملتا تھا" [1]

اس کے مقابلے میں یہ جملہ بھی قابل نمونہ ہے

"میں نماز اسکول میں داخل ہونے سے پہلے ہی چھوڑ چکا
تھا لیکن دل مومن تھا شاید اسی لیے سیماب کا یہ شعر پسند تھا

خراب فرد عمل ہو نہ جائے اے سیماب
اسے جناب رسالت مآب دیکھیں گے

اور محمد علی جوہر کی طرف طبیعت جھکی تو اس کی بھی وجہ یہی ہے
جوہر کا مقطع ہے۔

مٹے اسلام کا بھلا جوہر
نشہ چڑھ کر کہیں اترتا ہے

---

[1] اپنی تلاش میں۔ کلیم الدین احمد صفحہ ۲۱۷

"یہ نشہ ان کی غزلوں میں ہے اور یہی نشہ مجھے پسند آیا۔" [51]

مصنف کی شخصیت کی تشکیل کا تیسرا اہم جزو ادبی ہے مصنف کے والد محترم اور دادی کے والد حکیم عبدالحمید پریشان کی شاعری۔ شاد عظیم آبادی سے ان کی چشمکیں۔ مشاعرے اور ادبی محفلیں مصنف کے ادبی ذوق کی آبیاری کرتی ہیں۔ اپنے ادبی ذوق کے بارے میں خود مصنف کی رائے دلچسپی سے خالی نہیں۔

"عزیز۔ عابد۔ رعب۔ سیماب۔ جوش۔ تپش کی غزلوں اور شعروں کی نمائش اس لیے ضروری ہے کہ ذہنی رجحان واضح ہو جائے اب جو میں ان غزلوں کو پڑھتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیسے گوارا ہو گئی تھیں۔ اور تعجب ہوتا ہے کہ انسان کا ذہن کیسے بدل جاتا ہے۔ ہم اپنی مردہ خودیوں کے زینے پر اوپر چڑھتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ آخری زینے پر کیا وہی شخص ہے جو پہلے زینے پر تھا یا کوئی دوسرا نئی قماش کا ——— ارتقاء کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور اس حد سے گزر جانے کے بعد ماہیت بدل جاتی ہے اور نئے قسم کا انسان ذہنی لحاظ سے وجود میں آتا ہے اب جو میں دیکھتا ہوں تو عزیز۔ عابد اور رعب کی غزلوں کو بہ مشکل پڑھ سکتا ہوں۔" [52]

اس کے علاوہ شمشیر زنی خنجر بازی۔ کبوتر بازی۔ طلسم ہوش ربا کے چرچے۔ غرضیکہ ایک رنگین اور تہہ دار دنیا ہے۔ جو ایک سرے سے دوسرے

---

51 اپنی تلاش میں۔ کلیم الدین احمد صفحہ ۲۱۶

52 " " " " صفحہ ۲۱۴

سرے تک پھیلی ہوئی ہے۔

اس تمام دل کشی کے باوجود یہ بات البتہ کھٹکتی ہے کہ اس تہذیبی مرقع میں کلیم الدین احمد کی شخصیت کہیں کھو کر رہ گئی ہے۔ ان کی فرداتی زندگی کی تفصیلات کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اگر کہیں کوئی تذکرہ ہے بھی تو سرسری۔

"دو شادیاں بھی ہوئیں۔" [۵۱]

اور کیمبرج کا ذکر صرف اتنا ہے۔

"ہوا یہ کہ مجھے ۱۹۳۰ء میں اسٹیٹ اسکالرشپ مل گئی اور ستمبر میں امتحان کے بعد ہی انگلینڈ روانہ ہو گیا۔" [۵۲]

کلیم الدین احمد کی ۲۷۰ صفحات کی اس تلاش ذات میں سب سے زیادہ جس چیز کی کمی کھٹکتی ہے وہ ہے ان کی ادبی رائے کی تشکیل کا احوال۔ یہ مانا کہ قدیم بیاضوں میں ان کی ادبی پسند اور ناپسند کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن ادبی تنقید کا جو پورا نظام ان کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کا احوال اس آپ بیتی میں نہیں ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ دوسری جلد میں ان امور پر توجہ دی جائے۔

---

۵۱ اپنی تلاش میں۔ کلیم الدین احمد صفحہ ۲۱۷

۵۲ " " " " صفحہ ۱۷

جہانِ دانش

(احسان دانش)

سنہ ۱۹۷۵ء

مزدور شاعر احسان دانش نے اپنی خود نوشت "جہانِ دانش" کے پیش لفظ "دیباچۂ حیات" میں ایک بڑی عجیب اور متوجہ کن بات کہی ہے۔ اپنی خود نوشت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"میں نے اسے کئی بار لکھنے کا ارادہ کیا لیکن اپنے حالات کی طرف دیکھ کر اس خیال سے خاموش ہو گیا کہ کہیں پڑھنے والے اسے رحم کی درخواست نہ سمجھ لیں۔" [1]

اپنے ماضی کی یادیں مرتب کرتے وقت احسان دانش کی نظر خود نوشت سوانح حیات کے اس پہلو پر بھی پڑتی ہے جہاں زندگی کی دل گداز داستان اپنے تاثر کی وجہ سے رحم طلبی کی کوشش معلوم ہونے لگتی ہے احسان دانش کی خود نوشت کا مطالعہ کرتے وقت سب سے متاثر کن چیز

---

[1] جہانِ دانش۔ احسان دانش صفحہ ۱۱۔ دانش کدہ۔ انارکلی لاہور سنہ ۱۹۷۵ء

اس کا مجموعی تاثر ہے جو شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یادوں کا ایک مجروح لشکر نظر کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ جس میں یادیں بے شمار مصلوب۔ مجروح۔ محروم اور مہجور چہروں کی طرح ہیں اور ہر چہرے کو مصنف سے اپنی شناخت پر اصرار ہے۔

مصنف کو خود ہر قدم پر اپنی زندگی کے عجوبہ کار ہونے کا احساس ہے

"میری عمر کی باولی گہری ضرور ہے لیکن اندھیری نہیں جب میں اس میں جھانکتا ہوں تو چاروں طرف طاقوں سے چراغ جل اٹھتے ہیں اور سیڑھیاں اس قدر روشن ہو جاتی ہیں کہ درازیں تک نظر آنے لگتی ہیں مجھے میرے ماضی نے اس قدر کھندلا ہے کہ کہیں تو پٹخنیاں کھا کھا کر میرا بدن نیلا پڑ گیا اور کہیں جو ٹیلی جگہیں اپنی سطح سے ابھری کی ابھری رہ گئی ہیں مگر نظر میں نہ رسی رہ گئی ہے۔" [۵۱]

"میں نے جب اپنے ماضی کا دریچہ کھولا ہے میرے سامنے حادثات کے سیکڑوں آئینے جھلملانے لگے ہیں یہی نہیں بلکہ میرے زخمی اور مدفون لمحے مسافت کی دھول سے گردنیں اٹھا اٹھا کر مجھ سے مخاطب ہو گئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے اپنی عمر کے حافظہ خانے سے واقعات کی فائلیں اور حادثات کے موقع و محل کے نقشے تلاش کرنے میں دشواری نہ ہو گی۔" [۵۲]

---

۵۱ جہانِ دانش۔ احسان دانش صفحہ ۱۲

۵۲ ″ ″ ″ صفحہ ۱۲

جہانِ دانش میں زندگی کی سچائیاں بڑی سفاکی کے ساتھ یکجا کی گئی ہیں اور سچائی ہمیشہ تلخ ہوتی ہے، اسی لیے پڑھنے والے پر ایک نامعلوم سی اداسی چھا جاتی ہے اور زندگی خود اپنی زیادتیوں پر نادم ہوکر ٹھٹھک جاتی ہے۔ ۶۴۸ صفحات پر بکھری ہوئی شاعر مزدور کی یادیں پہلی بار ۱۹۷۵ء میں منظر عام پر آئی ہیں۔ یہ تصنیف ۱۹۲ عنوانات پر مشتمل ہے ان عنوانات کے تحت احسان دانش نے اپنی زندگی کا تقریباً ہر اہم واقعہ بیان کیا ہے ان عنوانات میں انگریزی بال اسکول سے فرار بکری پالنا۔ اگیا بیتال۔ تیل کی چوری سے لے کر علامہ اقبال سے ایک ملاقات۔ جوش سے پہلی ملاقات اور تقسیم ملک کا ہنگامہ اور قائد ملت کی شہادت، جیسے اہم موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ احسان دانش کی زندگی کے واقعات اتنے عجیب و غریب ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے کہ کیا زندگی کی لڑی میں اتنے تجربات اور حادثات بھی پروئے ہوئے ہوتے ہیں۔

مصنف نے اپنی زندگی میں جو مختلف النوع خدمات انجام دی ہیں ان میں چند درج ذیل ہیں۔ انک مین۔ رنگ سازی۔ کتب فروشی۔ مہاجن کی نوکری۔ مزدوری۔ پترولی (نقشہ سازی) درزی خانے کی نوکری۔ ریلوے میں چپراسی۔ نامہ نویسی۔ نمبر اندازی۔ میم صاحب کی نوکری۔ رہٹ کھینچنا۔ کانجی ہاؤس میں مویشیوں کی چوکیداری وغیرہ وغیرہ۔

واقعات کی تفصیل میں تسلسل نہیں ملتا ہے۔ جہاں پر جو بات یاد آجاتی ہے وہ اسی سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ یادوں کے ہجوم میں احسان

دانش گھبرائے تو ضرور ہیں مگر بیان کرنے کا اسلوب اتنا فطری ہو کہ پڑھنے والوں کو بے ربطی کا احساس نہیں ہو پاتا۔

کیونکہ اس داستانِ حیات کی بے ربطی بہت کچھ حیات انسانی سے مشابہت رکھتی ہے۔

احسان دانش نے اپنی آپ بیتی اپنے بچپن سے شروع کی ہے۔ اور ہم ان کے بچپن کے ساتھ ساتھ ان کے وطن کاندھلہ کی تہذیبی اقدار، معاشرتی روائتیں اور جغرافیائی خصوصیات سے بھی متعارف ہوتے ہیں۔ بچپن کی یادوں والا حصہ اس تصنیف کا سب سے دل گداز اور معصومیت سے لبریز حصہ ہے۔ اگرچہ اپنے بچپن کی یادوں کو دہراتے ہوئے انھیں احساس ہے کہ

"۔۔۔ آج کی طرح مجھے شعور اور احساس کی دولت نصیب نہ تھی اس لیے ہر مشاہدہ ذہن سے پانی کی بوند کی طرح ڈھلک جاتا یا خشک ہو جاتا۔" [1]

اس احساس کے باوجود ان کی بچپن کی یادیں اتنی نازک اور شگفتہ ہیں کہ وہاں تک رسائی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ احسان دانش محنت کش مزدور کی اکیلی اولاد ہیں۔ ایک بار بچپن میں باغ کی نگرانی کے لیے انھیں رات میں اکیلے رکنا پڑا تنہائی اور سناٹے کو فطرت ایک جفاکش بچے کے لیے کس طرح انجمن میں تبدیل کرتی ہے۔

"میرا جی وہاں بالکل نہ لگتا باغ کے اندر کی تاریکیوں کے علاوہ باغ کی کھائی سے باہر بھی چاروں طرف اندھیرے کے انبار

---

[1] جہانِ دانش۔ احسان دانش صفحہ ۱۸

لگے پڑے تھے اتنے میں جنگل کے کنارے درختوں کی ٹہنیوں
سے چاند نے اجال لے لی جیسے بسنت کی دیوی کی چتا سلگ
اٹھے دیکھتے دیکھتے تاروں کی جگمگ دھیمی پڑ گئی اور باغ
کا مشرقی افق ایسا لگنے لگا جیسے رات کی سنہری زلفوں کا
الاؤ بھڑک اٹھا ہو۔ صبح کو آنکھ کھلی تو آسمان کے کھیتوں
میں املتاس پھولا ہوا تھا اور صبح کے مولود سے سورج شفق
کی سرخی میں تانبے کے کٹورے کی طرح تیرتا ہوا ابھر رہا تھا۔[۵۱]

احسان دانش نے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی
ستم شعاریاں سہی ہیں انھیں خود کو مزدور اور مزدور کا بیٹا کہلانے
پر خوشی ہوتی ہے۔ نوکری کی تلاش میں ترک وطن کر کے لاہور جاتے
وقت محنت کے لیے ان کے دل میں وہی جذبات ہیں جو کسی عابد کے
اپنی عبادت کے لیے ہوتے ہیں۔

"جب میں لاہور سے جا رہا تھا اس وقت میرے محنتی بدن
اور میرے ماں باپ کی نصیحتوں کے علاوہ میرے پاس مصارف
اس قدر نہ تھے کہ مہینے دو مہینے بیکار رہ کر کھا سکتا۔ میں لاہور
کا سفر اس طرح کر رہا تھا جیسے تبت اور چین سے آنے والے
بدھ مت کے زائرین عقیدتوں کے سہارے چلتے ہیں۔ تو
مشک۔ مونگا اور چنور بیچتے بیچتے اپنی زندگی کو کشی نگر کے
تیرتھ پر لا ڈالتے ہیں جہاں مہاتما بدھ کا سونے کا استوپا ہے۔"[۵۲]

---

۵۱ جہان دانش۔ احسان دانش۔ صفحہ ۳۳
۵۲ ″ ″ ″ ″ صفحہ ۲۱۳

"مزدور کے لیے کسی غیر کی مدد کا تصور براہ راست خالق کی توہین ہے اس نے انسان کو خود اپنی مدد کی قوت اور صلاحیت دی ہے۔ آنکھ۔ ناک۔ کان۔ چہرہ یا کنپٹی پر کسی قسم کا حملہ ہوتا ہے تو ہاتھ بے ارادہ بڑھتے اور مقابلہ کرتے ہیں۔" [51]

وہ محنت کی بڑائی کے راگ ہی نہیں گاتے ہیں بلکہ مزدور کی زندگی پر ان کا دل خون کے آنسو بھی روتا ہے۔

"چٹھا بانٹتے وقت ٹھیکیدار کی بے پروائی اور بدکلامی پر میں جل بھن جاتا مگر کیا کرتا اگر وہ پیش پر نظر کرتا تو بے کسی کی زنجیروں کے سوا کوئی سہارا نظر نہ آتا لیکن یہ خیال ضرور آتا کہ مشرکوں فاجروں اور بے رحم لوگوں کی دعائیں فرشتے آسمان پر کیوں لے جاتے ہیں۔ کیا ان ظالموں کے اعمال فرشتوں کی نظر سے اوجھل ہیں۔" [52]

"ان دنوں اکثر خیال آتا کہ کیا ساری دنیا اسی معاشرے کی چکی میں پستی رہے گی؟ کیا غریب لوگ اسی طرح اپنے گرم خون کی خدمت سے معدے کے لیے ایندھن مہیا کرتے رہتے ہیں اور کرتے رہیں گے کیا ناداروں کے شباب اور جسم کی قوتیں اسی طرح کم کرائے پر چلتی رہیں گی۔" [53]

---

[51] جہانِ دانش۔ احسان دانش صفحہ ۲۱۰
[52] " " " " صفحہ ۸۸
[53] " " " " صفحہ ۹۰

"سرمایہ دار پر کبھی کوئی جادو اثر نہیں کرتا ہے وہ ظالم کا ظالم ہی رہتا ہے۔ اور غریبوں کے خون کا ایثار اسے اور بھی چٹورا بنا دیتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ مظلوموں اور مقتولوں سے بھی باز پرس ہوگی کہ تم نے قاتلوں اور ظالموں کو ایسا موقع کیوں دیا کہ وہ ظلم کریں اور قتل کا بیڑا اٹھائیں اس کا سد باب کیوں نہیں کیا۔"؟ [51]

احسان دانش نے مدرسے میں صرف چوتھی جماعت تک تعلیم پائی علم طلبی انھیں کالج کی چپراس اور بورڈنگ ہاؤس کی بیراگیری تک لے گئی۔

"جیسے ایک پیاسا زبان پر کانٹے پا کر پانی کے بند نلوں کی طرف بھی دوڑنے لگتا ہے" [52]

علمی دنیا احسان دانش کو ایک شاعر کے علاوہ ماہر علم زبان لغت نویس، اور ریاضی کی متعدد کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے جانتی ہو مگر یہ اندازہ "جہان دانش" پڑھنے کے بعد ہی ہوتا ہو کہ احسان دانش کے تلخ تجربات ان کی ادبی خدمات سے کم قابل احترام نہیں ہیں۔

یہ کرشمہ سازی صرف خود نوشت سوانح حیات ہی میں ممکن ہے کہ فن کار کی زندگی کی تصویر اتنی قدآور ہو جائے کہ خود اس کا فن بھی کوتاہ قد معلوم ہونے لگے۔

اردو میں خود نوشت سوانح حیات لکھنے والوں نے اپنے خارجی

---

[51] جہان دانش۔ احسان دانش صفحہ ۲۷۲

[52] 〃 〃 〃 صفحہ ۲۷۷

حالات تو تفصیل سے بیان کیے ہیں مگر اتنی ہمت کم ہی لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔ کہ نہاں خانہ دل کے اس گوشے سے بھی پردہ اٹھا سکیں جہاں معشوق کے علاوہ کسی دوسرے کا گذر نہیں ہو سکتا ہے۔ (جوش کی خود نوشت "یادوں کی برات" کے معتوب ہونے کی سب سے بڑی وجہ ان کے اٹھارہ معاشقے ہی ٹھہرائے جاتے ہیں) احسان دانش بھی اپنے عشق کی داستان سناتے ہیں۔ وہ ہر واقعہ بیان کرتے ہیں مگر کسی مقام پر کوئی جذبہ اظہار میں مانع نہیں ہوا ہے۔

"شمعی میرے حالات میں میرے لیے ایسی تھی جیسے قیدیوں کو خوش رکھنے کے لیے جیلر ڈرامے وغیرہ کا تفریحی پروگرام بھی روا رکھتے ہیں تاکہ سارے دن کی جانگداز محنت انہیں جینے سے بے زار نہ کر دے" [۵۱]

"شمعی کی غزل نے میری رگ رگ میں درد بھر دیا اس نے الاپ کی آریوں سے میری ضبط کی چٹانیں کاٹ دیں اور میں آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکا۔ مجھے آب دیدہ دیکھ کر شمعی کی آنکھوں کے دونوں پلّوں میں بھی تارے تلنے لگے۔ میں نے پہلے کبھی اس کی آنکھوں میں ایسا روپہلی لچکا نہیں دیکھا تھا" [۵۲]

جہان دانش میں مصنف نے اپنے عہد کی ہر بڑی سیاسی اور ادبی تحریک کا ذکر کیا۔ ان کے یہاں صرف نظیر۔ انیس۔ اقبال اور جوش کی عظمتوں کا اعتراف نہیں ہے۔ بلکہ فیض احمد فیض۔ تصدق حسین خالد

---

۵۱ جہان دانش ۔ احسان دانش صفحہ ۱۷۰

۵۲ " " " صفحہ ۲۱۱

میراجی۔احمد ندیم قاسمی۔مصطفیٰ زیدی اور احمد فراز کی شاعری پر بھی اظہار خیال ملتا ہے۔

انھوں نے اپنے شاعرانہ مسلک سے قاری کو تفصیل سے آگاہ کرایا ہے احسان دانش کی آپ بیتی سے ہی ان کے فکر کے تدریجی ارتقا کو سمجھا جاسکتا ہے۔اپنے کارناموں کی "تام جھام" بیان کرنے کی مصروفیت میں عموماً خود نوشت نگاروں کی نظر آپ بیتی کے اس کارآمد پہلو پر نہیں جاپاتی ہے۔

"میں قدیم رنگ میں شعر کہنے کا عادی ضرور تھا جو نتیجہ تھا نظیر اکبرآبادی اور میر انیس کے مطالعے کا لیکن چونکہ مغربی علوم سے بے بہرہ تھا اس لیے مجھے یہی بہتر معلوم ہوا کہ فطرت کے حسن اور اپنے ارد گرد کے تجربات اور مشاہدات کو قلم بند کردوں۔میری اکثر نظمیں مزدوری کے ایام کی روداد یں اور ساتھیوں کے تجربات اور مشاہدات کے مرقعے ہیں یہ ایک اتفاق ہے کہ اب تک میرے سوا اس میدان میں کوئی ایسا شاعر پورے ملک میں نہ تھا جو مشقت کے شکنجوں سے نکل کر ادب کے میدان میں داخل ہوا ہو" [۵۱]

"مجھے غزلوں کی گھسی پٹی روایتی شاعری اور حسن عشق کے اچھے سے اچھے چونچلوں سے نفرت ہوتی جارہی تھی اور میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اب تک شعرا کا طبقہ انسانی زندگی کے مطالعے اور مشاہدے سے محروم کیوں ہے۔قدیم شعرا تو بادشاہوں

---

۵۱ جہان دانش۔ احسان دانش صفحہ ۳۴۴

نوابوں اور رئیسوں کے وظائف پر پلتے تھے اور زندہ رہتے
تھے اس لیے ان کی شاعری بھی انہیں کی خوشنودی کے لیے
تھی اور وہ اپنے مسلک وفا میں بالکل درست تھے لیکن آج
کے شعرا عوام کی ترجمانی کیوں نہیں کرتے ؟ " [۵۱]

احسان دانش کی خود نوشت حقیقت نگاری اور شخصیت نگاری
کی کسوٹی پر تو پوری اترتی ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود نوشت کی
فنی اہمیت۔ زندگی کے تجربات اور واقعات سے قطع نظر جہان دانش
ادبی اعتبار سے بھی ایک بے مثل چیز ہے شعر و ادب میں نظم کو تاثر کا جو جادو
ملا ہے اسے احسان دانش نے اپنی نثر میں جگا کر ایک نیا تجربہ کیا
ہے۔ محاکات اور تشبیہات سے ایسا لگتا ہے جیسے مصنف نے قلم
ہاتھ سے رکھ کر کسی مصور کا موقلم اٹھا لیا ہو۔

" گرمیوں میں جب بارش ہوتی تو مندر سے آبادی کا منظر ایسا
معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نہایت حسین سبزی پر شیشے کی چھت ہوا
سے ہل رہی ہو۔" [۵۲]

" پگڈنڈیاں ان ذی روح اور تازہ دم کھیتوں میں ایسی
معلوم ہوتیں جیسے مخمل کے سبز شلوکوں سے فطرت کی لوچدار
بانہیں نکل کر دامنوں تک پہونچ رہی ہوں۔" [۵۳]

" سمندر کا رنگ ایسا ہو رہا تھا جیسے سرمے میں جست مل

---

[۵۱] جہان دانش۔ احسان دانش صفحہ ۲۵۷
[۵۲] " " " " صفحہ ۱۸
[۵۳] " " " " صفحہ ۱۹

جائے ادھر زرد رو چاند ایک بیمار حبشنہ کی طرح سجدے میں جھکا ہوا تھا۔" [51]

"پہاڑوں کی چھٹی ہوئی کھال میں چیڑ اور دیودار کے شاداب درخت زمین کی سینہ زور نسل کے سلوگن (نعرہ) معلوم ہو رہے تھے۔" [52]

جہاں تک واقعات کی بے ربطی کا تعلق ہے احسان دانش کو خود اس کی کمی کا پورا احساس ہے۔

"مجھے احساس ہے کہ میں واقعات کی ترتیب میں بھکا ہوں لیکن کہاں تک نہ بھکتا؟ میں نے جہاں اور جس نشیب سے سفر شروع کیا ہے وہ ایسا تھا کہ علم و ادب کے قافلے اس سے بہت آگے جا چکے تھے ــــ اور وہاں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کبھی ایسا وقت آئے گا کہ مجھے اپنی آپ بیتی لکھنے کا ناگوار فرض ادا کرنا پڑے گا۔" [53]

آپ کو اس سوانح میں سِنین نہیں ملیں گے ویسے بھی مجھے سنہ نام اور رشتہ اچھی طرح یاد نہیں رہتا نہ کبھی یاد رکھنے کی کوشش کی علاوہ ازیں میری کتاب کوئی تاریخ کی کتاب نہیں یہ تو میرے غیر منظم اور مختصر واقعات کی یادداشتیں ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ میرے دھندلے دھندلے نقوش حیات ہیں۔" [54]

---

[51] جہانِ دانش ۔ احسان دانش ۔ صفحہ ۳۵۱
[52] " " " " صفحہ ۴۱۶
[53] " " " " صفحہ ۱۳
[54] " " " " صفحہ ۱۳

جہانِ دانش کا آخری عنوان "قائد ملت کی شہادت" ہے حالانکہ اس کے بعد پیش آنے والے واقعات پہلے بیان ہو چکے ہیں ۔ لیکن یادوں کے ہجوم سے وہ بیچ سے ہی یہ کہہ کر دامن چھڑا لیتے ہیں کہ

"میں اپنی اس کتاب جہانِ دانش کی پہلی جلد یہیں تک لکھتا ہوں۔"[1]

بہت سے دوسرے خود نوشت نگاروں کی طرح احسان دانش نے بھی قاری کی بے قراری کو آیندہ وعدے پر برقرار رکھا ہے شاید اکثر خود نوشت نگار یہ وعدہ اس احساس کے تحت کرتے ہیں کہ سب کچھ کہہ کر بھی ان کے دل میں یہ خلش باقی رہ جاتی ہے کہ "کچھ" کہنے سے رہ گیا ہے وہ آپ بیتیاں جو مصنف کی زندگی میں پوری نہ ہو سکیں یا مصنف کو بعد میں وقت نے مہلت نہ دی۔ ان کی بات دوسری ہے۔ ورنہ جس وقت تک کی روداد بیان کی ہے اس کے بعد کے حالات بھی بیان کر دینے کی خواہش بڑی حد تک فطری ہے۔ مثلاً جوش کی خود نوشت سوانح حیات "یادوں کی برات" کے شائع ہونے کے بعد برصغیر میں اس کتاب کی ضبطی کے علاوہ بھی ردعمل ہوا ہے۔ اگر جوش صاحب اس کے بارے میں اپنے خیالات تحریر کریں تو وہ بھی "یادوں کی برات" سے کم دلچسپ چیز نہ ہو گی ۔

"جہانِ دانش" اردو خود نوشت سوانح کی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے احسان دانش کی صاف گوئی اور انسانی عظمت پر اعتماد سے اردو آپ بیتی میں زبان و بیان کے نئے معیار متعین ہوں گے اور بہت سی آپ بیتیاں جو لکھنے والوں کی ناکافی جرأت کی وجہ سے ابھی تک یادوں کے اندھیروں میں گم ہیں۔ انھیں سچائی کے سورج کے سامنے آنکھیں کھولنے کی طاقت مل سکے گی۔

---

[1] جہانِ دانش۔ احسان دانش۔ صفحہ ۶۴۴

زرگزشت

(مشتاق احمد یوسفی)

سنہ ۱۹۷۶ء

طنز و مزاح کے اس بادشاہ کی بانکی نگارشات سے ہندوستان کا ادبی حلقہ کم ہی واقفیت رکھتا ہے اس کا سبب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوری تو ہے لیکن مشتاق احمد یوسفی سے ناواقفیت کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ یوسفی ہر کہ و مہ کی نہیں بلکہ خواص کے لطف اندوز ہونے کی چیز ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی نے اپنی سرگزشت "زرگزشت" کے عنوان سے لکھی بینک سے سالہا سال ملازمت کا تعلق ہونے کے سبب انھوں نے اس کتاب کو زرگزشت کا نام دیا ہے۔ دیباچے کا عنوان "تزک یوسفی" قائم کر کے لکھتے ہیں

"ایک زمانے میں دستور تھا کہ امرا و رؤسا عمارت تعمیر کراتے تو اس کی نیو میں اپنی حیثیت و مرتبے کے مطابق کوئی قیمتی چیز رکھ دیا کرتے تھے۔ نواب واجد علی شاہ اپنی ایک منہ چڑھی بیگم معشوق محل سے آزردہ ہوئے تو اس کی حویلی ڈھا کر ایک نئی عمارت تعمیر

کرائی، معشوق محل ذات کی ڈومنی تھی۔ اسی نسبت سے اس کی تذلیل و تضحیک کے لیے نیو میں طبلہ و سارنگی رکھوا دیے۔
میں نے اس کتاب کی بنیاد اپنی ذات پر رکھی ہے جس سے ایک مدت سے آزردہ خاطر ہوں کہ ہمیشہ سمجھتے تھے جیسے ہو گئی وہ ذات اپنی۔" [1]

"زرگزشت" کم و بیش بیس سال پرانی یادوں اور باتوں کی داستان ہے اس کی پہلی قسط ۱۹۷۲ء میں مکمل ہو گئی تھی لیکن اشاعت اوّل اپریل ۱۹۷۶ء میں ہوئی۔ سوانح عمری لکھنے کے سلسلے میں تحدیث نعمت یوسفی بھی کرتے ہیں لیکن نظر ثانی کے مرحلے پر۔ تین سال تک نظر ثانی کی نوبت نہیں آئی۔

"ستمبر ۱۹۷۵ء میں جب خون آنے لگا اور ڈیڑھ مہینے تک نقل و حرکت بستر کے حدود اربعہ تک محدود ہو کر رہ گئی تو بارے یکسو ہو کر زندگی کی نعمتوں کا شمار و شکر ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ مسودے پر نظر ثانی کرنے کا مرحلہ بھی لیٹے لیٹے طے ہو گیا۔" [2]

زرگزشت میں مشتاق احمد یوسفی نے اپنی آشفتہ سری اور خاک بسری کی داستان مزے لے لے کر سنائی ہے اردو میں مزاحیہ آپ بیتیوں کی تعداد بہت ہی کم ہے اپنے وسیلۂ اظہار مزاح کے باب میں بھی یوسفی نے بڑی نازک اور خوب صورت بات کہی ہے۔

---

[1] زرگزشت۔ مشتاق احمد یوسفی صفحہ ۹ مکتبہ دانیال کراچی۔ اپریل ۱۹۷۶ء

[2] " " " " " " ۹ " " "

یہاں ایک چھوٹی سی جھلک دنیا کی دکھانی مقصود ہے جس کا
ہر خانہ ہر کا یک۔ بھانت بھانت کے فرماں روایانِ ناوقت
کا حجلہ پندار ہے۔"

منشا سبق آموزیِ جہاں نہیں ہے، نہ اپنے سینے میں کوئی
امانت یا آگ کہ امیر خسرو کی طرح یہ کہہ سکیں کہ اس صندوق
استخوانی میں بے شمار تحفہ ہائے آسمانی ایسے تھے جو میں نے
اس دن کے لیے بچا رکھے تھے۔ اپنے وسیلۂ اظہار، مزاح کے
باب میں میں کسی خوش گمانی میں مبتلا نہیں۔ قہقہوں سے
قلعوں کی دیواریں شق نہیں ہوا کرتیں۔ چٹنی اور اچار لاکھ
چٹخارے دار سہی لیکن ان سے بھوکے کا پیٹ نہیں بھرا جا سکتا
نہ سراب سے مسافر کی پیاس بجھتی ہے۔ ہاں ریگستان کے شدائد
کم ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز، اندوہ انبساط، کرب و
لذت کی منزلوں سے بے نیازانہ گذر جانا بڑے حوصلے کی بات
ہے۔ مگر یہ بھولنا نہ چاہیے کہ خوش دلی کی ایک منزل بے حسی
سے پہلے پڑتی ہے۔ اور ایک اس کے بعد آتی ہے۔" [1]

یوسفی کو مزاح کی معنویت کا پورا پورا احساس ہے اسی لیے اپنی
زرگزشت میں انھوں نے اپنے مزاح سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ اور
بڑے چپکے سے وہ باتیں کہہ گئے ہیں۔ جنھیں سنجیدہ اسلوب میں کہا جائے
تو پورا دفتر درکار ہو۔

"سبھی کی مسکراہٹیں ایک جیسی نہیں ہوتیں کوئی بڑا اگر تا ہی

---

[1] زرگزشت۔ مشتاق احمد یوسفی صفحہ ۱۳

تو چھوٹے ٹھٹھے لگاتے ہیں تو میں جب اللہ کی زمین پر اتر کر
چلنے لگتی ہیں تو زمین اپنے ہی زہر خند سے شق ہو جاتی ہے
اور تہذیبیں اس میں سما جاتی ہیں۔ شیر خوار بچے خوش ہوتے
ہیں تو کلکاریاں مارتے ہیں۔ ہمک کر ماں کی گود میں چلے جاتے
ہیں۔ ادھر مونا لزا ہے کہ صدیوں سے مسکرائے چلی جا رہی ہے
اور ایک مسکراہٹ وہ بھی ہے جو نروان کے بعد گوتم بدھ کے
لبوں کو ہلکا سا خمیدہ کر کے اس کی نظریں جھکا دیتی ہے۔ یہ
سب سہی لیکن ماورائے تبسم وہ اہتزاز اور مزاح جو سوجھ بوجھ سچائی
اور دانائی سے عاری ہے دریدہ دہنی پھکڑپن اور ٹھٹھول
سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ زر، زن، زمین اور زبان
کی دنیا یک رنگوں یک چشموں کی دنیا ہے مگر تتلی کی سیکڑوں آنکھیں
ہوتی ہیں۔ اور وہ ان سب کی مجموعی مدد سے دیکھتی ہے۔
شگفتہ نگار بھی اپنے پورے وجود سے سب کچھ دیکھتا ہے سنتا
سہارتا چلا جاتا ہے اور فضا میں اپنے سارے رنگ بکھیر کر کسی
نئے افق کسی اور شفق کی تلاش میں گم ہو جاتا ہے۔"[51]

یوسفی کی مسکراہٹوں کے پس منظر میں ان کی آنکھوں کے گوشوں کی
نمی۔ ان کے اندر چھپے ہوئے انسان دوست فن کار کو بے نقاب کر دیتی
ہے۔ زرگزشت کی گیلری میں آشنا و نا آشنا۔ خنداں و خانماں خراب مردم
آزار و مردم گزیدہ مہربان و بے مہر۔ بہار اور رونق کی دھول میں اٹے
ہوئے سبھی طرح کے چہرے نظر آتے ہیں ان کے خدوخال کو نمایاں کرتے

51۔ زرگزشت۔ مشتاق احمد یوسفی صفحہ ۱۴

ہوئے یوسفی نے شگفتگی بشاشت روی اور زندگی سے شیفتگی کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔

"یہ طغیان شباب کی لاف ہائے شادکامی معاصرانہ چشمکوں اور سیاست کی شوراشوری کی داستان نہیں نہ کسی کی مہم جوئی اور کشورکشائی کا ساگا ہے۔ نہاں خانۂ دل کی ہیروگیلری پر نگاہ کی تو کسی کی رمق تک اپنی ذات میں نظر نہ آئی۔ ہاں ذہن پر زرا زور ڈالا تو بعض مشاہیر کے چیدہ چیدہ اوصاف اور شباہتوں کا اپنی ذات میں جمگھٹا نظر آیا۔ کاش وہ نہ ہوتیں تو زندگی سنور جاتی ــ مثلاً نپولین کا قد۔ جولیس سیزر کا چیٹل سر۔ چینا لولو بریجڈا کا وزن۔ سموئیل جانسن کی بینائی ناک بالکل قلوپطرا کی مانند کہ اگر $\frac{1}{2}$ انچ بھی چھوٹی ہوتی تو اس دکھیا کا شمار بدصورتوں میں اور اپنا خوبصورتوں میں ہوتا۔" [۵۱]

آپ بیتی کے بارے میں یوسفی کی رائے بڑی حد تک صحیح ہے کہ

"آپ بیتی میں ایک مصیبت یہ ہے کہ آدمی اپنی بڑائی آپ کرے تو خودستائی کہلائے اور ازراہ کسرنفسی یا جھوٹ موٹ اپنی برائی خود کرنے بیٹھ جائے تو یہ احتمال کہ لوگ جھٹ یقین کرلیں گے۔ ممکن ہے کہ بعض پڑھنے والوں کو اس خودنوشت سوانح عمری میں لکھنے والا خود کہیں نظر نہ آئے۔ اگر ایسا تاثر ہے تو یہ عین ترین حقیقت ہوگا اس لیے کہ اپنی زندگی میں

---

۵۱ زرگزشت۔ مشتاق احمد یوسفی صفحہ ۱۰

بھی ہر قدم پر دوسرے ہی زیادہ دخیل نظر آتے ہیں۔" ؎۱

اپنی اس خود نوشت میں مزاح کے پیرائے میں کہیں کہیں یوسفی ایسی باتیں بڑی سادگی سے کہہ گئے ہیں جسے سنجیدہ پیرائے میں زبان تک لانا محال تھا۔

"ان واقعات، مشاہدات اور تاثرات کا تعلق میرے بینکنگ کیریر کے ان ابتدائی چھ سات برسوں سے ہے جب اس پیشے کا بھرم قائم تھا۔ البتہ انشورنس ایجنٹوں سے لوگ چھپتے پھرتے تھے پھر وہ زمانہ آیا کہ انشورنس ایجنٹ تک بینکروں سے منہ چھپانے لگے۔

ع پھرتے ہیں سود خوار کوئی پوچھتا نہیں

نامۂ اعمال میں چند تبدیلیاں بوجوہ ناگزیر تھیں اس میں پردہ نشینوں کے علاوہ کچھ کرسی نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ چنانچہ باستثنائے مسٹر اینڈرسن نام و مقام بدل دیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں واقعات و ابواب میں تقدیم و تاخیر نظر آئے گی چند کردار بھی عمداً "اگڈ مڈ" کر دیے ہیں۔ اور خوف فساد خلق سے سیاہ و سفید کو سفید و سیاہ کر دیا ہے۔ اس کے باوجود اگر کہیں کسی شخصیت یا حقیقت سے مماثلت پائی جائے تو اسے "فکشن" کا سقم تصور کیا جائے۔ کہ یہ ایک نو آموز بینکر کی آشفتہ بیانی ہے کسی مقتول کا بیان نزعی نہیں جس کے اختتام پر اسے مرنے کی اجازت اور ملزم کو پھانسی دے دی جائے۔

ع کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرز ادا ہے۔" ؎۲

؎۱ زرگزشت۔ مشتاق احمد یوسفی صفحہ ۱۱ ؎۲ زرگزشت مشتاق احمد یوسفی صفحہ ۱۱

اپنے اسی مخصوص پیرایۂ بیان کی وجہ سے یوسفی کی تصنیف اردو خود نوشت نگاری میں ایک نئے باب کا آغاز ہے۔ ۱۱۲ ابواب پر مشتمل یہ "سوانح یوسفی" اگرچہ یوسفی کے بینکنگ کے تجربات کے ارد گرد گھومتی رہتی ہے۔ لیکن یہ مصنف کے فن کا کارنامہ ہے کہ اس نے اس میں نہ جانے کتنی سفاک حقیقتوں اور بندہ مزدور کے اوقات کی تلخیوں کو گوارہ بنا دیا ہے۔ زخم کھانا، اور دل گرفتہ نہ ہونا یہی اس کا ادبی مسلک ہے۔

یوسفی کے یہاں مزاح کی شگفتگی کے علاوہ ایک اور چیز جو بہت اہم ہے وہ ہے ان کے مزاح کا کلاسیکی رچاؤ اور علاقائی زبانوں کی تازگی اور توانائی ـــــ ان کا اسلوب لفظی الٹ پھیر اور خوش وقتی ہی نہیں ہے بلکہ ماورائے تبسم ـــــ اپنی حماقتوں پر خود ہنسنا اور دوسروں کو اس ہنسی میں شریک کر لینا ایک فن کار کی کشادہ دلی ہے۔ جو زندہ رہنے والے ادب کی پہچان ہے۔ یوسفی کی آپ بیتی اردو آپ بیتیوں میں ان کے اسلوب کی طرح ہی منفرد ہے۔

آپ بیتی

(عبدالماجد دریابادی)

۱۹۷۰ء

مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب اپنی "آپ بیتی" کے محرکات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"عزیزوں دوستوں اور مخلصوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کا اصرار ہے کہ ۷۴، ۷۵ سال کا پیرنابالغ اپنی آپ بیتی دوسروں کو سنائے اور نادانیوں سفاہتوں کی لمبی سرگزشت دنیا کے سامنے اپنی زبان سے دہرائے! اللہ جانے انسان کو انسان کی پستیوں، رسوائیوں، خفتوں کی داستان سننے میں کیا مزہ آتا ہے۔؟

اور یہاں تو خیریت سے سادہ دل بندوں کا ایک جم غفیر اس دھوکے میں پڑا ہوا ہے کہ جلوے کسی عالم فاضل اہل اللہ کے ان صفحات میں دیکھنے میں آئیں گے؟ اللہ اللہ

اس عالم آب و گل میں کسی کی صفت ستاری سے کیسے کیسے پردے عیبوں مجرموں خاطیوں کے جہکر پر اور اچھے اچھے دانش و بصیرت رکھنے والوں کی فہم و نظر پر ڈال رکھے ہیں[۵۱]

مولانا عبدالماجد صاحب کی آپ بیتی تقریباً پونے چار سو صفحات کا احاطہ کرتی ہے اس کتاب کی اشاعت مولانا کے انتقال کے دو سال بعد ہوئی۔ ان کی شخصیت میں دوسرے پہلوؤں کے علاوہ مذہب اور ادب سب سے مقدم رہے ہیں مذہب کے زاویے سے دیکھا جائے تو اس سے پہلے مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا محمد زکریا آپ بیتی لکھ چکے ہیں۔ سرگزشت ماجدان دونوں کے مقابلے میں مختصر ہے اور اس کا انداز ان دونوں سے منفرد ہے۔ زکریا صاحب اور حسین احمد مدنی دونوں ہی نے تحدیث نعمت پر خصوصیت سے زور دیا عبدالماجد صاحب نے اس کا ذکر تو نہیں کیا لیکن بہرحال بین السطور میں یہ جذبہ بھی کارفرما ہے۔

مولانا کی شخصیت اور حالات زندگی دوسروں سے زیادہ پر پیچ اس لیے نظر آتے ہیں کہ وہ متضاد اور متصادم قسم کے مرحلوں سے گزر کر بالآخر روحانیت اور مذہبیت پر واپس آ گئے تھے۔ ان کے زمانہ الحاد کے ہیرو اور فلسفی جان اسٹوارٹ مل نے بھی اپنی آپ بیتی لکھی تھی اس کا شمار انگریزی کی بہترین خود نوشت سوانح عمریوں میں ہوتا ہے مل کی خود نوشت کی بنیاد اس پر رکھی گئی کہ لکھنے والا اپنی پہلودار شخصیت کی تہیں کھولے اور ذہن کے ارتقا اور نشو و نما کا جذبات

---

۵۱ آپ بیتی۔ عبدالماجد دریابادی صفحہ ۱۲ مکتبہ فردوس۔ مکارم نگر۔ لکھنؤ ۱۹۷۸ء

سے عاری حال بیان کرے۔ آج کل اسی قسم کی آپ بیتیوں کو بہترین قرار دینے کا رجحان ہے اور اسی وجہ سے مِل کی خود نوشت کو ممتاز ترین کہا جاتا ہے۔

مِل سے کسی زمانے کی عقیدت کا ذکر مولانا نے بار بار کیا لیکن دیباچے میں یہ ذکر نہیں ملتا ہے کہ مل کی تقلید میں آپ بیتی لکھی گئی۔ مولانا نے اپنی ذہنی نشو و نما کا بیان بہت خوب کیا ہے جو شاید اس پائے کے کسی ادیب نے اپنی خود نوشت میں نہیں کیا انھوں نے بڑی ترتیب اور سلیقے سے بتایا ہے کہ ان کا ذہن علم کی کھوج میں کن بھول بھلیوں سے گزرا تھا۔

نثر نویسی میں مولانا کا نہایت مسلسل اور زرخیز تجربہ تھا مگر اس کا اعتراف وہ بار بار کرتے ہیں کہ خود گزشت لکھنا ایک مشکل مسئلہ ہے ترک و انتخاب کی کشاکش اس الجھن میں ڈالتی ہے کہ کیا لکھا جائے کیا چھوڑا جائے کہاں تفصیل بتائی جائے کس جگہ ایجاز اور اختصار سے کام لیا جائے۔ تسوید اور تحریر کی پہلی بنیاد جولائی ۱۹۵۴ء میں پڑی اور تکمیل فروری ۱۹۶۷ء میں ہوئی گویا تیرہ سال میں یہ کام انجام تک پہونچا۔ اس سے مشکلات کا اندازہ نہ صرف اس شخص کی کاوش کا کیا جا سکتا ہے جو قلم کا دھنی تھا — عامیوں کی دشواری کا بھی کچھ اندازہ اس سے ہوتا ہے۔

سرگزشت کے ضمن میں سچ اور جھوٹ کی بابت مولانا نے کسی حد تک نئی بات کہی ہے ان کی دعا ہے کہ جو کچھ آپ بیتی ہے اسے بشری حد تک بے کم و کاست سپرد قلم کرنے کی توفیق ہو جائے وہ اسی کو بہت سمجھتے ہیں

"قلم کا دامن کذبِ صریح اور افترا مبین سے آلودہ نہ ہونے پائے"۔[1]

ان کا خیال بظاہر یہ ہے کہ سو فی صدی سچ بولنا نبی معصوم کے سوا کسی کے لیے ممکن نہیں ہے۔

مولانا نے اپنے بچپن کی بے مروتی اور اکل کھرے پن اور عمر بھر جاری رہنے والی مخصوص نہاد کے کچھ واقعات کی مثالیں دی ہیں اور اپنے ساتھ کسی مروت سے کام نہیں لیا ہے اپنے حسب حال یہ مصرعہ بھی درج کیا ہے

ع ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سر نوشت کو

ساری آپ بیتی میں مزاج کی خشکی اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہی عاجزی اور انکساری کا انداز اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بچپن کی کچھ یادوں کا خال خال تذکرہ بھی اس کتاب میں ہے اور مصنف نے بڑی حسرت کے ساتھ اس مصرعے کو کئی بار دہرایا ہے۔

ع دو دن کو اے جوانی دے دے ادھار بچپن

بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی

"یہ کتاب ان کی زندگی کا مرقع ہے ہی اس دور اور معاشرت کا بھی آئینہ ہے جس میں انھوں نے آنکھیں کھولیں اور زندگی کا سفر طے کیا کسی زمانے میں بلکہ قریبی زمانے میں اہل قلم اور مورخوں کو بھی اس سے بڑی مدد ملے گی جو اس دور کے تمدن اور معاشرت پر کچھ لکھنا چاہیں گے۔ اس کتاب

---

[1] آپ بیتی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی صفحہ ۱۲

میں ان کو بعض ایسے اشارے ملیں گے جن سے بہت کام لے سکتے ہیں۔ اور اس زمانے کی بولتی ہوئی تصویر پیش کر سکتے ہیں ادب کے طالب علموں بلکہ ادب کے استادوں اور معلموں کو اس میں ادب و زبان کی خوبیاں لکھنؤ اور اودھ کے محاورے اساتذہ کے آبدار اشعار اور جاندار مصرعے۔ اردو ادب اور زبان کے گزشتہ دور اور لکھنؤ کے ادیبوں اور شاعروں سے تعارف ہوگا۔" [1]

مولانا عبدالماجد نے الحاد اور ارتداد کی طرف جانے کی مختلف منزلوں کی نشان دہی کی ہے اور اس سلسلے میں ایک ایک تفصیل بیان کی ہے کس کتاب اور کن کتابوں نے اس راہ پر ڈالنے کی راہ ہموار کی اس کا حال تفصیل سے بتایا ہے۔ کم و بیش ۷۰ صفحات الحاد کے رنگ میں رنگنے اور اسلام کی جانب واپس آنے کے بارے میں ہیں یہ ایک بہت اچھا تجزیہ ہے اور اس میں ذیل میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ الحاد کی لپیٹ میں آنے کے باوجود کھانے پینے۔ وضع و لباس عام معاشرت میں بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک حد تک جذباتی حیثیت سے وہ مسلمان ہی رہے یہی نہیں جب کوئی غیر مسلم اسلام پر معترض ہوتا تو دل تائید رسم زبانی کو نہ اٹھتا بلکہ جی اس کا جواب دینے پر ہی آمادہ ہوتا۔ اس سے ایک اندرونی کشمکش کا پتہ چلتا ہے۔ جس کی نوعیت خفتہ سی تھی بالفاظ دیگر ساری عقلیت اور فلسفے کے باوجود ان کے اندر ایک مسلمان چھپا ہوا تھا اور دس سال بعد وہ کھل کر باہر آ گیا۔

---

[1] آپ بیتی۔ عبدالماجد دریابادی صفحہ ۱۱ پیش لفظ از ابوالحسن علی ندوی

ازدواجی زندگی کے بارے میں مولانا نے جو پچاس صفحات لکھے ہیں وہ آپ بیتی کے نقطۂ نظر سے ان کی قلبی کیفیات کی بڑی خوبصورت تصویرکشی کرتے ہیں۔ اس میں انھوں نے یادوں کا جو دفتر کھولا ہے۔ اس میں بڑی معصومیت، امنگ اور ترنگ۔ کیف و مستی اور عشق و محبت کی داستان سرائی ہے ایک جگہ تو قلم کی رو میں یہ جملہ بھی لکھ گئے ہیں۔

"زندگی کے اتار چڑھاؤ سے اس باب کو کوئی واسطہ نہیں اس میں گفتگو صرف زوحیات کے سلسلے کی ہوگی۔" [۵]

ہپناٹزم کا عمل اپنی نفسیات دانی کی راہ سے نیا نیا سیکھا تھا اور خوب اس کی مشق تھی بیماروں کو منٹوں میں اچھا کر دیا کرتے جس لڑکی سے بعد میں شادی ہوئی اس کی ٹانگوں میں درد رہا کرتا تھا۔ اپنی مہارت سے اس کا بھی کامیاب علاج کیا۔ مولانا کے الفاظ میں۔

"دو چار منٹ قبل کہاں تو بیٹھی کراہ رہی تھیں اور کہاں اب جو آنکھ کھولی ہے تو درد کافور تھا۔ ہشاش بشاش مسکراتے ہوئے چہرے سے دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنی والدہ کو پکار کر بولیں" باجی! اب ہم بالکل اچھے ہیں۔"

نوجوان قبول صورت لڑکی کی مسکراہٹ اور اس پر مسرت آواز میں جادو کا اثر تھا مریضہ کا چہرہ آناً فاناً معالج کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بن گیا۔ اب وہ میری مریضہ نہ تھی اتنی ذرا سی دیر میں "کچھ اور" بن گئی اور معالج اب خشک معالج نہ رہا خود علاج طلب مریض بن گیا

---

[۵] آپ بیتی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی صفحہ ۱۸۲

ع شکار کرنے کو آئے شکار ہو کر چلے

شاعری نہیں اب واقعہ تھا۔ کہاں تو آنے میں یہ پس و پیش تکلف اور حجاب تھا اور اب اٹھنے میں طرح طرح کی بہانہ بازیاں اور حیلہ سازیاں۔"[1]

نوجوان عبدالماجد سے ان صاحب نے جو بعد میں ان کے خسر ہوئے تحریر کے ذریعے شادی کے بارے میں ان کا عندیہ معلوم کرنا چاہا یہ سمجھے کہ اپنی لڑکی کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں حالانکہ معاملہ یہ نہیں تھا اب اس تحریر کے ملنے کے بعد عبدالماجد کی کیفیت خود ان کے قلم سے

"پڑھتے ہی یہ معلوم ہوا کہ جیسے کسی تیز نشے سے مست ہوا جا رہا ہوں شراب کبھی چکھی نہ تھی لیکن دل نے گواہی دی کہ اس میں کچھ ایسا ہی جوش اور سرور ہوتا ہوگا۔ طبیعت فرطِ مسرت سے ابلی پڑتی اچھلی پڑتی۔ مچلی پڑتی تھی کسی سے کہہ سن ڈالتا تو شاید طبیعت ہلکی ہو جاتی لیکن اس وقت رات میں راز دار کون ہاتھ آتا۔ عزیزوں، قریبوں میں اس وقت تک کسی سے ذکر نہ آیا۔ ایک آدھ دوست البتہ خیال میں تھے وہ اس وقت کہاں ملتے۔ بے کلی میں نیند خاک آتی جاڑوں کی لمبی پہاڑ سی رات صبح کس طرح ہو جب تو جواب لکھوں۔ لیکن طبیعت نہ مانی اٹھ بیٹھا۔ اور رات ہی میں میز پر جواب لکھنے بیٹھ گیا۔"[2]

---

[1] آپ بیتی۔ عبدالماجد دریابادی صفحہ ۱۶۱

[2] " " " صفحہ ۱۶۷

مولانا دریا بادی کی بہت سی شخصیتوں سے بحثیں اور معرکے رہے لیکن اس کتاب میں ایک خاص بات یہ ہے کہ تقریباً کسی شخص کو برے الفاظ میں نہیں یاد کیا ہے۔ چار ایسے اشخاص کا ذکر ہے جو شدت کے ساتھ ان کے مخالف تھے لیکن ان میں سے کسی شخص کی برائی اپنے قلم سے نہیں کی۔ کسی کا نام بھی نہیں لیا ہے صرف اشارے کر دیے ہیں اور ان کو سمجھنا ہر شخص کے لیے ممکن نہیں ہے۔ مولانا آزاد کا ذکر کیا ہے اور مولانا کا نام ان لوگوں کی فہرست میں شامل کیا ہے جنھوں نے ان کی ادبی زندگی پر عملی اثر ڈالا۔ محسن اور عزیز شخصیتوں کی فہرست میں بہت سے نام آتے ہیں اور کسی قدر وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ کس کس سے کیا سیکھا۔ بیعت مولانا حسین احمد مدنی سے تھے لیکن بے پناہ عقیدت مولانا اشرف علی تھانوی سے رہی اس معاملے کو بھی تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح مولانا تھانوی مرید کرنے پر تیار نہ ہوئے اور یہ کام مولانا مدنی کے سپرد کیا۔ مولانا مدنی سے اپنے اختلافات کا ذکر کھل کر کیا ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ پیری مریدی کے تعلقات کیوں استوار نہ رہ سکے۔

چند مظلوم اور مرحوم شخصیتوں کے عنوان سے جو باب کتاب میں شامل ہے اس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ اس سلسلے میں ہے کہ ان کے تعلق سے مولانا دریا بادی سے کوئی نہ کوئی لغزش ہوئی تھی۔ مولانا عبدالباری کے سلسلے میں ان کو اعتراف ہے کہ نادانی کی بنا پر مخالفین کے کہنے سننے میں آ گئے۔ مولانا آزاد کے سلسلے میں بھی اذیت اور دل آزاری کا

اقرار کیا ہے لیکن عذر یہ پیش کیا ہے کہ دوسروں کی روایتوں کے بھروسے پر رہے یہ باب ایک لحاظ سے (Confessions) کی حیثیت رکھتا ہے ملازموں اور خدمت گاروں سے جو سختی کی تھی اس پر بہت ندامت اور شرمندگی کا اظہار کیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی آپ بیتی بہترین تو نہیں بہترین آپ بیتیوں میں شامل کرنے کے قابل ضرور ہے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھی خود نوشت میں ہونی چاہیے۔ مثلاً یہ کہ مولانا کا شمار مشاہیر میں ہوتا ہے۔ وہ ایک عمدہ ادیب اور صاحب طرز انشاپرداز تھے۔ جو کچھ گفتنی تھا وہ سب انھوں نے بیان کر ڈالا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قدم قدم پر گزرے ہوئے دور کا تجزیہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ جہاں جذبات کے اظہار کی ضرورت ہوئی وہاں اس کا اظہار ضرور کیا لیکن ایک شگفتہ علمی انداز شروع سے آخر تک چھایا رہا۔

اردو خود نوشت سوانح حیات
ایک جائزہ

خود نوشت سوانح عمری کی ابتدا کا ثبوت مہیا کرنا دشوار ہے، اپنی ذات کے بارے میں اظہار خیال کرنا اور اپنے تجربات میں دوسروں کو شریک کرنا بہت پرانا رویہ ہے۔ انکشاف ذات کا رجحان انسان میں ہمیشہ سے پایا جاتا ہے۔

اردو نثر میں اس کے ابتدائی نقوش ہمیں صوفیائے کرام کے ملفوظات وغیرہ میں ملتے ہیں۔ لیکن انہیں ہم آپ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی کی غیر شعوری کوشش کہہ سکتے ہیں۔ یہ سلسلہ ایک طویل عرصے تک قدرے بے ضابطہ شکل میں چلتا رہا۔

فارسی اور اردو میں جو تعلق ہے اس کے لیے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ فارسی میں آپ بیتی کی روایت واضح شکل میں کافی پہلے سے موجود تھی۔ امیر تیمور کے ملفوظات کے علاوہ تزک

بابری اور تزک جہانگیری سے ہندوستان میں آپ بیتی کے ابتدائی حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فارسی آپ بیتیوں میں شیخ علی حزیں کی آپ بیتی خاص اہمیت کی حامل ہو حزیں اپنی خود نوشت سوانح میں اپنی زندگی کے حالات کے ساتھ تاریخی اور سوانحی حالات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ میر تقی میر کی آپ بیتی "ذکر میر" بھی فارسی کی ہی تصنیف ہو۔ اس آپ بیتی میں انکشاف ذات کا رویہ واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ اگرچہ یہ رویہ میر کی شاعری میں بھی عیاں ہو لیکن اگر میر اپنی آپ بیتی نہ چھوڑ جاتے تو شاید میر کی مخصوص افتاد طبع اور غم پسندی ہمیشہ مبہم ہی رہتی اس کے علاوہ شاہ جہاں کے زمانے کے شاعر منیر لاہوری نے ایک خط میں اپنے حالات اس طریقے سے لکھ دیے ہیں کہ وہ خط ذات کے بیان کا مرقع بن گیا ہو۔ اردو میں پہلے پہل دکن کی مثنویاں بھی ایسی ملتی ہیں جن میں بعض شاعروں نے اپنے حالات زندگی کو موضوع بنایا ہے۔

اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اس کام کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ اگرچہ دھندلے دھندلے نقوش فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی تالیفات کے دیباچوں وغیرہ میں بھی ملنے لگے تھے۔

تاہم آپ بیتی یا سرگزشت کی قدرے ترقی یافتہ صورت کافی بعد میں سامنے آئی۔ اردو میں خود نوشت سوانح حیات کی جھلکیاں مختلف صورتوں میں نظر آتی ہیں۔ مگر مستقل طور پر آپ بیتی کا رواج ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہوا۔ حالات اور حادثات کی یورش میں انسان جب زیادہ تنہائی محسوس کرتا ہے تو اپنی ذات

کے تحفظ کے لیے مختلف گوشے تلاش کرتا ہے۔ اور پھر اسے سب سے محفوظ جگہ خود اپنی ذات نظر آتی ہے جس میں ایک جہان آباد ہے جس میں آرزوؤں اور تمناؤں کے چراغ بھی ہیں اور محرومی اور ناکامی کے داغ بھی ہیں۔

اردو میں دستیاب ہونے والی پہلی تحریر جو خود نوشت کی صفت رکھتی ہے اور مصنف کی زندگی کا تقریباً پورا احاطہ کرتی ہے۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری کی تصنیف "تاریخ عجیب" (کالا پانی) ہے ایک مجاہد آزادی کی حیثیت سے انھوں نے انڈمان میں کالے پانی کی سزا کاٹی، اس خودنوشت کی اہمیت اولین آپ بیتی ہونے کے علاوہ اس لیے بھی ہے کہ یہ اس زمانے میں لکھی گئی جب حق گوئی کے لیے زبان پر مہریں لگی تھیں۔

دوسری اہم آپ بیتی ظہیر دہلوی کی تصنیف "داستان غدر" (سنہ ۱۹۱۰ء) ہے۔ جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

چہ پرسی از سروسامانیم عمریست چوں کاکل
پریشاں روزگارم خانہ بردوشم

ظہیر دہلوی کی داستان حیات کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ یہ تحریر دہلی کی تاراجی کے اندوہ سے بوجھل ہو گئی۔

"آدھی رات کے وقت سیاہ انگریزی نے یکایک کشت وخون کرنا شروع کر دیا اور سوتے آدمیوں کو گھروں میں گھس کر اور سیڑھیوں کے ذریعے چڑھ کر ہلاک کرنا شروع کر دیا۔ اب شہر کی یہ کیفیت کہ دکانیں سب بند

اور رسد آنی بند۔ دانہ پانی خلقت پر حرام لگے بھوکوں
پیاسوں مرنے تین روز یہی کیفیت رہی۔ آخر تیسرے
روز شام کے وقت بادشاہ قلعے سے نکل کر ہمایوں کے
مقبرے پہونچے اور رعیت بھی سراسیمہ۔ حیران اور پریشان
ہو کر شب کے وقت سب گھربار چھوڑ کر اپنے بال بچوں اور
عورتوں کا ہاتھ پکڑ کر نکلنے لگی۔" [1]

غدر میں اہل دہلی کی کیفیات کے بیان کے سلسلے میں منشی محمد عنایت حسین کی "ایام غدر" بھی بہت اہم ہے اس کے مطالعے سے لال قلعے کی زوال پذیر تہذیب اور معاشرے کی تاراجی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگرچہ ان آپ بیتیوں میں بہت اختصار اور احتیاط سے کام لیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود سیاسی نظریات اور دلی کیفیات کا اظہار ہر لفظ سے ہو رہا ہے۔

تقریباً اسی عہد کی ایک معروف شخصیت عبدالغفور نساخ کی آپ بیتی بھی دریافت ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ آپ بیتی ابھی تک مخطوطے کی شکل میں ہی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال لائبریری کلکتہ میں موجود ہے۔ اس خود نوشت کا دلچسپ پہلو اس زمانے کی معاصرانہ چشمکوں کا بیان ہے ۱۸۶۶ء میں نساخ دہلی گئے تھے۔ دہلی میں ان کی ملاقات مفتی صدر الدین آزردہ ضیاء الدین خاں نیر مصطفی خاں شیفتہ۔ مولانا الطاف حسین حالی اور مرزا اسد اللہ خاں غالب سے ہوئی تھی مرزا غالب سے ملاقات کا تذکرہ خاصہ طویل اور دلچسپ ہے

---

[1] داستان غدر۔ ظہیر دہلوی صفحہ ۱۴۱

اس خود نوشت میں سب سے قابل غور بات یہی ہے کہ۔ مولانا جعفر تھانیسری۔ ظہیر دہلوی اور علامہ فضل الحق خیر آبادی کے زمانے کی مخلوق ہونے کے باوجود بھی۔ وہ حب الوطنی کے اس احساس سے نا آشنا ہیں جس نے دوسروں کے سینے میں آگ لگا رکھی تھی۔

خواجہ حسن نظامی نے اپنی آپ بیتی (۱۹۱۹ء) جسے وہ "عرفان مستی کا بہی کھاتہ" کہتے ہیں مرتب کی ان کی آپ بیتی کا "البیلا" طرز تحریر ہے جو آپ بیتی۔ سفر نامے اور روز نامچے کی شکل میں متفرق صفحات پر بکھرا ہوا پڑا ہے اگر ان تینوں چیزوں کو قرینے سے یکجا کیا جائے تو نہ صرف خواجہ حسن نظامی کی بلکہ اس دور کی سیاسی اور ادبی سرگرمیوں کی مستقل تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔

دیوان سنگھ مفتوں مدیر "ریاست" بڑے نڈر صحافی تھے ان کی خود نوشت سوانح حیات "ناقابل فراموش" صرف بر ملا گوئی اور راز کشائی کا وصف نہیں رکھتی ہے بلکہ اپنی شگفتہ بیانی کے سبب اردو خود نوشت کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ مفتوں کی زندگی کے حالات پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسے انسان کی کہانی ہے جس نے زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ ان کی اصول پرستی کی جھلکیاں ان کے کردار پر جا بجا روشنی ڈالتی رہتی ہیں۔ ناقابل فراموش کا ہر واقعہ، ہر قصہ دل چسپ سبق کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی عہد میں وہ تذکرہ بھی لکھا گیا جسے اگرچہ مصنف نے "برق خرمن کے معاملے" کے استعارے میں پیش کیا ہے۔ لیکن یہ تذکرہ آپ بیتی نہ ہونے

کے بعد بھی آپ بیتی ہی کہلائے گا۔ مولانا ابوالکلام کا تذکرہ (۱۹۱۹ء) اس بات کی دلیل ہے کہ آپ بیتی صرف اپنی ذات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ہر شخص اپنے علاوہ اپنے خاندان کی کئی پشتوں کے تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ تذکرہ ہم کو یہ بتاتا ہے کہ زندگی خط مستقیم کا نام نہیں ہے اس تصنیف کا انوکھا پن یہی ہے کہ سب کچھ کہا گیا ہے مگر استعارے کی زبان میں حقیقت پر مجاز کے دبیز پردے ڈال کر

"عالم انفس آفاق میں جو کچھ بھی ہے ان میں سے کوئی بھی نہ تھا جس کی ابرو پر گرہ یا آنکھوں میں غمزہ ہو۔ سب کی زبانیں گویا سب کے اشارے آشکارا۔ سب کی سطریں ابھری ہوئی نہ کوئی لب بند رہا۔ نہ کوئی جلوۂ مستور۔ نہ آنکھوں نے دیکھنے میں کمی کی نہ کانوں نے سننے میں چشم و گوش نے جو کچھ بہم پہونچا دیا دل کی وسعت نے اسے سمیٹ لیا۔"[1]

اسلوب کی تاریخ میں مولانا کے طرز تحریر کو تجریدی آرٹ بھی کہا گیا ہے۔ اسے جرأت کی کمی کہہ لیجئے یا مولانا کی خود پسندی اور انفرادیت کہ وہ ہر خاص و عام کے سامنے زندگی کے سارے اسرار رموز، الم و طرب کی تشہیر کرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ کہنا چاہتے ہیں مگر کہہ نہیں پاتے ہیں۔

سیاسی آپ بیتیوں میں مولانا حسرت موہانی کی "قید فرنگ" کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا نے بڑی جرأت حق گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنے ایام قید و بند کا جائزہ لیا ہے اس کے علاوہ چودھری

---

[1] تذکرہ ۔ مولانا ابوالکلام آزاد صفحہ ۳۲۵

فضل الحق کی دو آپ بیتیاں "دوزخ" اور "میرا افسانہ" کا شمار بھی اس دور کی سیاسی آپ بیتیوں میں ہوتا ہے پولیس کے محکمے میں ملازم ہونے کی وجہ سے اگرچہ سیاست ان کے لیے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن انھوں نے اپنے زمانے کی سیاست پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے

اردو کی سب سے قابل ذکر آپ بیتی جسے ہم اردو میں آپ بیتی کی شعوری اور واضح کوشش کہہ سکتے ہیں سر سید رضا علی کی "اعمال نامہ" (۱۹۴۲ء) ہے سر سید رضا علی انگریزی داں طبقے سے تعلق رکھتے تھے، ظاہر ہو کہ انگریزی کی اہم آپ بیتیاں ان کی نظر سے ضرور گزری ہوں گی اور غیر شعوری طور پر رضا علی نے ان کا اثر بھی ضرور قبول کیا ہو گا! اعمال نامہ میں رضا علی نے ملکی سیاست۔ ہندی اردو نزاع۔ علی گڑھ کے تعلیمی دور اور مختلف سیاسی اور معاشرتی موضوعات کا بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ آپ بیتی مصنف کی ذاتی زندگی کی عکاسی سے نہیں بلکہ فنی اور معلوماتی خوبیوں سے بھی مزین ہے۔

حکیم احمد شجاع کی آپ بیتی "خوں بہا" ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی یہ مصنف کی زندگی کے پچاس سالوں کا احاطہ کرتی ہے مصنف کی ذات کے علاوہ اس زمانے کے بہت سے اہم واقعات پر دل چسپ اور شگفتہ انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے ان کے انداز بیان میں ایک خاص قسم کی معصومیت اور بھولا پن ہے جس نے اس کتاب کے حسن کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔ "خوں بہا" میں مقامی اور شخصی رنگ غالب ہونے کے بعد بھی قاری اس آپ بیتی میں گہری دل چسپی محسوس کرتا ہے۔

نواب ڈاکٹر سر احمد سعید خاں آف چھتاری کی خود نوشت سوانح

۱۹۴۹ء میں "یادِ ایام" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ یہ خود نوشت دوسری تمام خود نوشتوں سے قدرے مختلف حیثیت کی مالک ہے۔ نواب چھتاری انگریزوں کے زمانے میں وزیر، گورنر اور ریاست حیدرآباد کے وزیرِ اعظم جیسے عہدوں پر فائز رہے۔ صلح کل پالیسی پر کاربند رہنے کی وجہ سے وہ ہمیشہ حکومت وقت کے خاص آدمیوں میں شمار کیے جاتے رہے۔ یادِ ایام میں ان کے مختلف کارناموں کی تفصیل تو ملتی ہے مگر دل کو چھو لینے والی کیفیت ان کی تحریر میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ تمام تذکرے سپاٹ ہیں۔ تحلیل اور تجزیے کو ان کی تحریر میں دخل نہیں ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی کی "نقشِ حیات" (۱۹۵۲ء) اپنے ہر جملے میں وہ حرارت سمیٹے ہوئے ہے جو ایک محبِ قوم کے دل میں شعلہ بن کر بھڑکتی رہتی ہے۔ قدم قدم پر تحدیثِ نعمت کا فرض ادا کرتے رہنے اور محاسبہ نفس سے پوری طرح باخبر ہونے کے بعد بھی مولانا کی خود نوشت نقشِ حیات میں سیاسی واقعات اور دوسری خارجی تفصیلات بڑی چابکدستی سے یکجا ہیں۔

شاد عظیم آبادی کی آپ بیتی: "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" ہوش بلگرامی کی سرگزشت حیات "مشاہدات" اور ڈاکٹر اعجاز حسین کی "میری دنیا" تینوں خوب صورت آپ بیتیاں ہیں۔

شاد عظیم آبادی کی آپ بیتی کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ یہ شاید اردو کی تنہا آپ بیتی ہے جس کا مصنف آپ بیتی کو اپنے بجائے دوسروں کے نام سے شائع کروانا چاہتا ہے۔ اس خود نوشت کو شاد عظیم آبادی نے اپنے ایک شاگرد مسلم عظیم آبادی کے نام سے لکھا تھا اور اس کا عنوان

"کمال عمر" رکھا تھا۔ جسے شاد کی وفات کے بعد "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" (۱۹۵۱ء) کے عنوان سے شاد عظیم آبادی کے نام سے ہی شائع کیا گیا۔

"میری دنیا" (۱۹۵۵ء) ڈاکٹر اعجاز حسین کی اپنی دنیا ہے جوان کی تعلیمی زندگی ان کے عزیز طالب علموں اور شاعرانہ مسلک کے تذکروں سے معمور ہے۔

"مشاہدات" (۱۹۵۵ء) ہوش بلگرامی کے گوناگوں تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ ہے یہ کتاب حیدرآباد کی تاریخ کے پرآشوب دور میں لکھی گئی ــــ ہوش یار جنگ کا حیدرآباد کی سیاست سے گہرا تعلق رہا ہے اس تصنیف میں حقیقت کی تلخی کے ساتھ زبان کی حلاوت ایک عجیب کیفیت پیدا کردیتی ہے۔

تقریباً اسی زمانے میں نقی محمد خاں کی "عمر رفتہ" اور ہمایوں مرزا کی "میری کہانی میری زبانی" منظر عام پر آئیں۔

عبدالمجید سالک کی "سرگزشت" (۱۹۶۶ء) میں شائع ہوئی۔ سالک بنیادی طور پر خاکہ نگار ہیں۔ یہی خوبی ان کی تحریروں میں جگہ جگہ نمایاں ہوجاتی ہے ــــ اقبال۔ ظفر علی خاں۔ حسرت موہانی اور ابوالکلام آزاد وغیرہ کا ذکر اپنی شخصیت کے بیان کے ساتھ ساتھ وہ بڑی خوبی سے کرتے ہیں ــــ چراغ حسن حسرت "سرگزشت" کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

> "وہ انشاپردازی کے کوچے کی رسم وراہ سے آگاہ اور سوانح عمری کے آداب سے پوری طرح واقف ہیں۔"

۱۹۶۷ء میں یوسف حسین خاں نے اپنی یادیں "یادوں کی دنیا"

کے عنوان سے مرتب کیں۔ چونکہ اس خود نوشت کو مرتب کرنے والا ایک مورخ ہے لہٰذا اس خود نوشت میں خصوصی منصوبہ بندی اور ترتیب سے کام لیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ اس وقت تک خود نوشت کی تاریخی اور سوانحی اہمیت کا احساس خود نوشت سوانح نگار کے یہاں بیدار ہو چکا تھا۔

چودھری خلیق الزماں کی خود نوشت Pathway to Pakistan کا ترجمہ اردو میں "شاہراہ پاکستان" کے نام سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ چودھری خلیق الزماں کی یہ تصنیف ادبی سے زیادہ سیاسی اور تاریخی اہمیت کی حامل ہے ۱۱۱۲ صفحات کی یہ داستان ہندوستان کے مخصوص تاریخی دور کی روداد ہے۔ اس آپ بیتی میں اگرچہ جگ بیتی کا عنصر غالب ہو لیکن اپنی طرز کی یہ الگ کہانی ہے۔

اردو کی تمام خود نوشت سوانح عمریوں کو اگر تاریخی اعتبار سے سلسلہ وار پڑھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ایسی سوانح عمریاں بہت کم ہیں جن میں سیاسی کش مکش، معاشرتی انتشار کی عکاسی نہ ہو۔ اردو خود نوشت سوانح نگار اپنے ساتھ اپنے پس منظر کو ہمیشہ نظر میں رکھتا ہے۔

"بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل" شورش کاشمیری کی پر آشوب زندگی کی داستان ہے یہ آپ بیتی ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ شورش کی تین آپ بیتیاں اور ہیں۔ "تمغۂ خدمت" "موت سے واپسی" "پس دیوار زنداں" شورش کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی زندگی میں ادب اور سیاست پہلو بہ پہلو چلتے ہیں اگر ایک طرف وہ اپنی سیاسی زندگی

اور سیاسی مسلک پر اظہار خیال کرتے ہیں تو دوسری طرف لاہور کی ہر قابل ذکر ادبی ہستی اور ادبی تحریکوں کا ذکر بھی کرتے ہیں ——

شورش کی آپ بیتی میں ذہنی نشو و نما اور ذہنی ارتقاء کے موضوع پر کھل کر بات کی گئی ہے یہ وہ موضوع ہے جسے انگریزی خودنوشت میں جدید رجحان کے بموجب سب سے اہم عنصر سمجھا جاتا ہے مگر اردو آپ بیتی نگار اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے اب بھی جھجکتے ہیں۔

شورش کی خودنوشت نے اردو خودنوشت سوانح حیات میں زبان اور بیان کے نئے معیار مرتب کئے ہیں۔

"یہ محض انشا نہیں یہ آپ بیتی ہے اور جگ بیتی میں گندھی ہے یہ ان طویل و عمیق اور رفیق و شفیق یادوں کا مجموعہ ہے جو طوق و سلاسل سے آب و گل میں ڈھلتی رہیں۔"

اردو میں اب تک جتنی آپ بیتیاں منظر عام پر آئی ہیں ان میں جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی یادوں کی برات (۱۹۷۰ء) ایسی ہے جو خودکشائی کے بے باک رویے کے تحت لکھی گئی ہے جوش کی آپ بیتی اردو آپ بیتی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہے جوش سے بیشتر ایک عام رجحان یہ تھا۔

"اگر ہم میں سے کسی کو جستجو ہو کہ اردو میں روسو کے اعترافات کی طرح کتنی چیزیں لکھی گئیں تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ شاید ایک بھی نہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ اردو کا آپ بیتی نگار مشرق میں بیٹھا ہے۔ جہاں اس کے لیے ممکن نہیں کہ سچائی

یا سچی تصویر کشی کی آڑ لے کر اپنی بداعمالیوں کی تشہیر کرے[1]

'بداعمالیوں کی تشہیر' جوش کی آپ بیتی کا عیب ہے اور ان کا ہنر بھی (جوش کی آپ بیتی پر تفصیلی تبصرہ پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے) یادوں کی برات اردو کی ان نثری تصنیفات میں ہے جن کی شدت کے ساتھ تحسین، تنقیص اور تنقید کی گئی ہے مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ جوش کی خود نوشت فن اور شخصیت کا خوبصورت امتزاج ہے۔

جدید خود نوشتوں میں جناب کلیم الدین احمد کی "اپنی تلاش میں" خواجہ غلام السیدین کی "مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں" اور احسان دانش کی "جہان دانش" خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

کلیم الدین احمد کی شخصیت اور فن دونوں کی حیثیت اردو میں بڑی چونکا دینے والی رہی ہے اس لیے ان کی خود نوشت (۱۹۷۵ء) سے توقع ہوئی تھی کہ یہ تصنیف ان کی پراسرار شخصیت اور مخصوص ادبی رویے کو سمجھنے میں مددگار ہوگی مگر اس تصنیف میں ان کی اپنی شخصیت منتشر خیالات میں ایسی گم ہوئی ہے کہ قاری آخر تک اسے تلاش ہی کرتا رہتا ہے۔ اور اسی نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ کلیم الدین احمد صنف خود نوشت سوانح پر اپنی انفرادیت کا کوئی نشان ثبت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

خواجہ غلام السیدین اپنی خود نوشت "مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں" (۱۹۷۴ء) اپنی زندگی میں مکمل نہ کرسکے جسے بعد میں ان کی بہن صالحہ عابد حسین صاحبہ نے مکمل کیا ہے اس خود نوشت سوانح کے

---

[1] ڈاکٹر سید عبداللہ۔ آپ بیتی۔ صفحہ ۶۶ نقوش (لاہور) جون ۱۹۶۴ء

نامکمل حصے بھی سیدین کی سادہ لوح اور منکسر طبیعت کی مکمل تصویر قاری کے سامنے کھینچنے میں کامیاب ہیں ماہر تعلیم ہونے کی وجہ سے ان کی تحریر میں اصلاحی اور اخلاقی پہلو ہر جگہ نمایاں ہے۔

۱۹۷۵ء میں مزدور شاعر احسان دانش کی خود نوشت "جہانِ دانش" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ "جہان دانش" کو اگر اردو کی بہترین خود نوشت کہا جائے تو غلط نہ ہوگا ــــــ انکشاف ذات کے ضمن میں جوش نے اپنی کمزوریاں اس طرح یکجا کردی ہیں کہ ان کی شخصیت جگہ جگہ پر مسخ ہوگئی ہے۔ لیکن احسان دانش کی کمزوریاں اور محرومیاں ہی ان کی شخصیت کے دھندلے دھندلے نقوش اجاگر کرتی ہیں۔ دھند چھٹتی ہے، انسانیت اور رواداری کے جذبوں سے خلوص کی کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں۔

۱۹۷۶ء میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کی "آپ بیتی" شائع ہوئی آپ بیتی کا طرز تحریر سادہ۔ شگفتہ اور اپنے اندر علمی وقار لیے ہوئے ہے۔ مولانا عبدالماجد صاحب کی آپ بیتی اس لحاظ سے نہایت اہم ہو کہ مولانا نے الحاد سے ارتداد کی طرف جانے والی مختلف منزلوں کی نشان دہی بڑی تفصیل سے کی ہے۔ الحاد کے بعد اسلام کی طرف واپس آنے کا تجزیہ خوبصورت ہے۔

مولانا کی آپ بیتی میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھی خود نوشت میں ہونی چاہیے۔

اپنے حالات مزاح کے شگفتہ پیرائے میں بیان کرنا بھی ایک بامعنی طریقہ ہو۔ حالات کی زہرناکی پہ مسکراہٹ کے پردے ڈال دینا اردو میں نیا نہیں

"ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے"...؛

"لوگ روٹی کھاتے ہیں میں کپڑا کھاتا ہوں"...؛

جیسی تلخ حقیقتیں اگر سنجیدہ پیرائے میں لکھی جاتیں تو ان کی تاب لانا مشکل ہوتا، مگر مزاح نگار حالات کا زہر پی کر بھی مسکراتا رہتا ہے۔

اردو میں خطوط غالب کے بعد پہلی مزاحیہ خود نوشت "ما بدولت" شوکت تھانوی نے ۱۹۴۶ء میں لکھی تھی۔ یہ شوکت تھانوی کے مزاحیہ اسلوب کا ایک خوب صورت نمونہ ہے "ما بدولت" کی اشاعت کے تقریباً تیس سال بعد ۱۹۷۶ء میں مشتاق احمد یوسفی نے اپنی سرگزشت "زرگزشت" کے عنوان سے مرتب کی اور دیباچے کا عنوان "تزک یوسفی" قائم کیا۔

آپ بیتی کے بارے میں یوسفی کی یہ رائے بڑی تیکھی اور بڑی حد تک صحیح ہے۔

"آپ بیتی میں ایک مصیبت یہ ہے کہ آدمی اپنی برائی آپ کرے تو خودستائی کہلائے اور از راہ کسر نفسی یا جھوٹ موٹ اپنی برائی کرنے بیٹھ جائے تو احتمال یہ کہ لوگ جھٹ یقین کر لیں گے" [۱]

مزاح کے پیرائے میں یوسفی وہ باتیں کہہ گئے ہیں جسے سنجیدہ گفتگو میں زبان تک لانا محال تھا۔ یوسفی کے یہاں مزاح کے ساتھ ساتھ ادب کا کلاسیکی رچاؤ اور علاقائی زبانوں کو توانائی ملتی ہے یوسفی کی آپ بیتی اپنے اسلوب کی وجہ سے اردو میں منفرد ہے۔

---

[۱] زرگزشت مشتاق احمد یوسفی صفحہ ۱۳

یوسفی کے علاوہ مزاحیہ پیرائے میں ابن انشا نے بھی جستہ جستہ اپنی حکایات ہستی مزاحیہ پیرائے میں بیان کی ہیں جسے ہم آپ بیتی سفرنامے اور روزنامچے کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں۔ ابن انشا کی سوانحی تصنیفات اپنے اسلوب کی آپ مثال ہیں ابن انشا، واقعات سے وقتی اثر قبول کرتے ہیں اور خوش مزاج راہ رو کی طرح آگے بڑھ جاتے ہیں۔ تاریخ عجیب سے لے کر موجودہ زمانے تک خود نوشت سوانح عمری کا جائزہ لیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ خود نوشت سوانح حیات کئی اہم منزلیں طے کر کے موجودہ مقام تک پہونچی ہے۔ آج کا خود نوشت نگار بیان کی آزادی سے ہی نہیں بلکہ فکر کی دولت سے بھی مالامال ہے۔ آج کا فن کار صرف اپنی خوبیوں پر نازہی نہیں کرتا بلکہ خامیوں کے اعتراف کی اخلاقی جرأت بھی اس میں موجود ہے۔

موجودہ عہد خود نوشت سوانح عمری کے لیے سازگار ہے کیونکہ آج فن کار اپنی ذات کی پہچان اور فکر کی شناخت کا اپنے فن میں اصرار کر رہا ہے ادھر دو چار سال میں لکھی جانے والی خود نوشت سوانح عمریوں میں سب سے معرکتہ الآرا سوانحی تصنیف قرۃ العین حیدر کی "کار جہاں دراز ہے" اگرچہ مصنفہ نے اسے "سوانحی ناول" یا "فیملی ساگا" ہی تسلیم کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ سوانحی ادب کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

سید اطہر حسین (آئی۔ اے۔ ایس) کی سرگزشت حیات "ایک سویلین کی سرگزشت" کے عنوان سے ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی ہے یہ ان کی ملازمت کے دوران ہونے والے متنوع تجربات اور مشاہدات کی خوبصورت داستان ہے۔

آپ بیتی کا فن چونکہ صرف فن سے نہیں بلکہ نفس انسانی سے بھی وابستہ ہے اس لیے اس پر نہ تو کوئی اصول وضوابط نافذ کئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی اس کے عروج وزوال کو گراف پر دکھایا جاسکتا ہے۔ اسی لیے اردو خود نوشت سوانح عمری کی صورت حال کا جائزہ لینا تو ممکن ہے لیکن ارتقاء کی مرتب اور منضبط تصویر بنانا مشکل ہے۔ کیونکہ آپ بیتی اب ایک فن ہی نہیں سائنس بھی ہے مذاق زمانہ وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے شخصیت کے جن پہلوؤں پر پچھلے دور کے لوگ زور دیتے تھے یہ ضروری نہیں کہ موجودہ نسل کے لوگ بھی انہی کو پسند یا ناپسند کریں۔ درباداری کے دور میں جو قدریں قابل قدر تھیں جمہوری زمانے میں اکثر ناپسندیدہ ہوگئی ہیں۔ شعور، تحت الشعور، اور لاشعور کی منزلوں سے گزر کر علم ذات تک پہونچنا خود نوشت سوانح نگار کا کام ہے جیسے جیسے نفسیات اور تجزیہ نفس کی ترقی ہوگی۔ آپ بیتی کا فن اور زیادہ واضح شکل میں آگے کی طرف بڑھے گا۔

پانچواں باب

(۱) خود نوشت سوانح حیات کی خوبیاں اور قاری کی توقعات

(۲) خود نوشت سوانح حیات کے مسائل اور ترقی کے امکانات
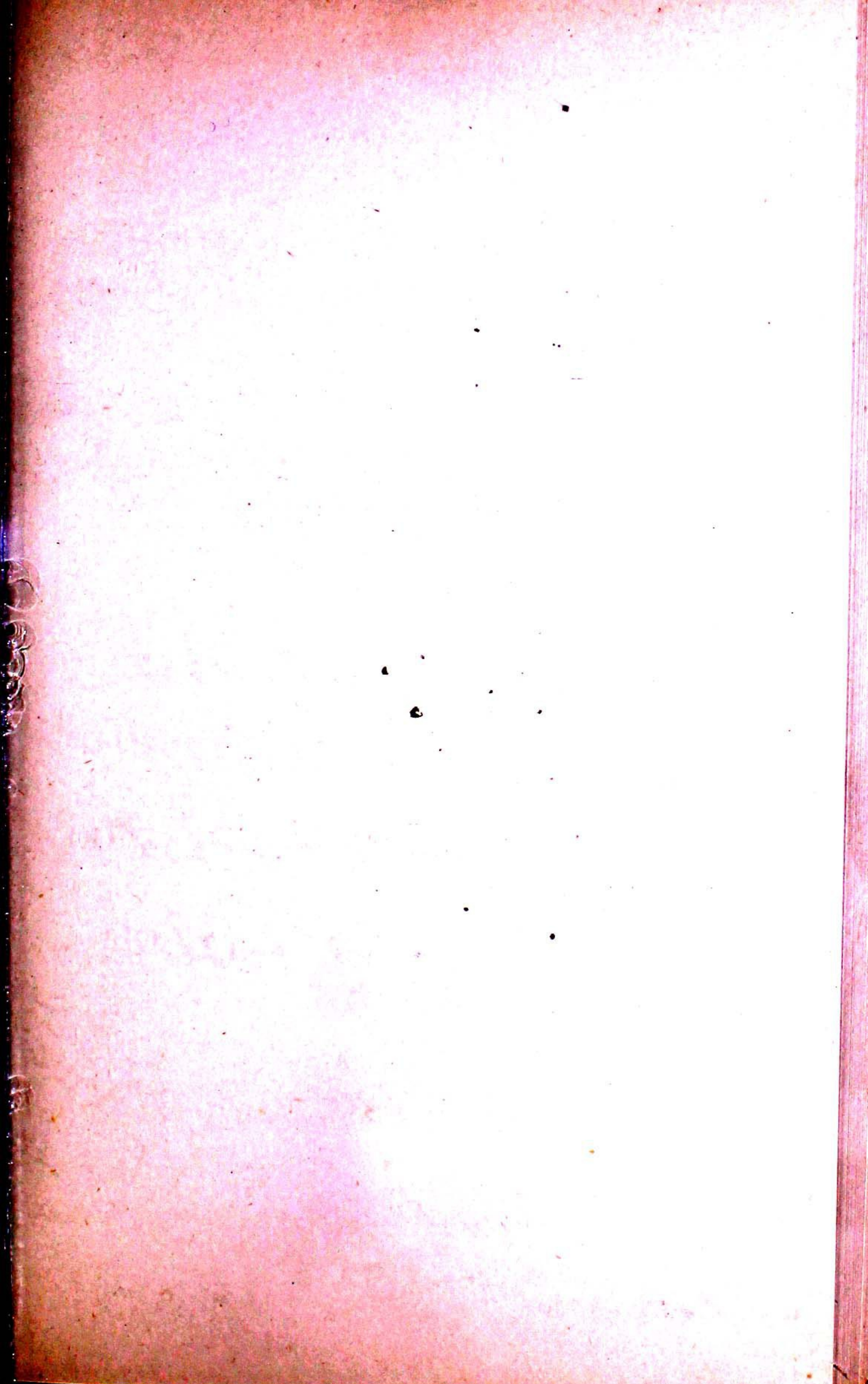
خود نوشت سوانح حیات کی خوبیاں اور قاری کی توقعات

آپ بیتی زندگی کی اس تصویر کا نام ہے جس میں مصور اپنی تصویر کے خاکے میں خود رنگ بھرتا ہے۔ جس طرح زندگی میں پیش آنے والے واقعات کسی ضابطے کے پابند نہیں ہوتے ہیں اسی طرح آپ بیتی بھی بندھے ٹکے اصولوں کی پابند نہیں ہو سکتی ہے۔

سچائی۔ شخصیت اور فن وہ بنیادی عناصر ہیں جن کے بغیر ہر آپ بیتی ادھوری ہے۔ ان تینوں خصوصیات پر ابتدائی صفحات میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔ لیکن سچائی کی تابناکی، شخصیت کی پرچھائیوں اور فن کی لطافتوں کے بعد بھی کچھ خوبیاں ایسی ہیں جن کی توقع ایک قاری آپ بیتی میں کرتا ہے۔ خود نوشت نگار کو چاہیے کہ وہ ان خوبیوں پر نظر رکھے کیونکہ خود نوشت کی مقبولیت کا بہت کچھ انحصار ان خوبیوں پر ہے۔

واقعات کا صحیح انتخاب خود نوشت کی اہم خوبیوں میں شمار ہوتا ہے۔ خود نوشت کا موضوع انسان کی اپنی ذات ہے اور زندگی میں وہ واقعات کے لامتناہی سلسلے سے گزرتا ہے جن کو ایک مربوط شکل میں جس طرح کہ وہ پیش آئے ہوتے ہیں، بیان کرنا ناممکن ہے اس کے علاوہ زندگی کا ہر کام کارنامہ نہیں کہا جا سکتا۔ لہذا واقعات کا انتخاب بہت مہارت اور ذہانت کا کام ہے۔ بہت ممکن ہے کہ جو واقعہ قاری کے لیے بالکل غیر اہم ہے مصنف نے اسے غیر معمولی اہمیت دے کر اپنی کتاب کی معنویت کو کم کر دیا ہو۔

Design and truth in autobiography اپنی مشہور کتاب میں Roy Pascal نے بڑے واضح پیرائے میں لکھا ہے۔

"ایک کامیاب آپ بیتی کے لیے زندگی کے پیچ در پیچ حالات سے واقعات کا صحیح انتخاب ان کے درمیان حسن تناسب اور حفظ مراتب کا لحاظ رکھنا اور ذہانت کے ساتھ رد و قبول کے بعد خوش سلیقگی سے پیش کرنا نہ صرف اہم بلکہ لازمی ہے"[1]

جیمس جوائس کے مشہور تاریخی فرد یولیسس کی ایک دن کی مصروفیات فرضی پیرائے میں بیان کرنے کے لیے آٹھ سو صفحات ناکافی ہیں تو زندگی کے ہزاروں دنوں کے بیان کے لیے کتنے دفتر چاہیے۔ اسی بات کا Augustine نے اپنی سوانح حیات Confession میں جو دنیا کی

---

[1] Design and truth in autobiography By Roy Pascal
Reprint 1960 By Page bros (Norwish) Ltd (Great Britain)

پہلی عظیم آپ بیتی کہی جاتی ہے اعتراف کیا ہے۔
"میں حافظے کے وسیع اور بے کراں تہہ خانے

(Larg and boundless Chamber of memory)

سے صرف تھوڑے سے واقعات سچائی تک پہونچنے کے
متعلق اپنی جدوجہد بیان کرنے کے لیے پیش کر رہا ہوں"۔۵

Augustine نے بھی صرف منتخب سچ Selected truth

بیان کیا ہے۔ نہ کہ مکمل سچ Whole truth پسکال بھی سچائی کی
اس قطع و برید کو جائز سمجھتا ہے ۔۔۔ آپ بیتی کی حیثیت ایک فن پارے
کی ہے وہ پھولوں کی خود رو جھاڑی نہیں ہے۔ آپ بیتی کو پھولوں
کے صحیح انتخاب کے بعد چابک دستی سے بنایا ہوا ایک گلدستہ
ہونا چاہیے۔

واقعات کے صحیح انتخاب کے ساتھ موضوع کا صحیح استعمال بھی
نہایت اہم ہے۔ آپ بیتی میں کیا کیا ہونا چاہیے؟ اس سوال کے
مختلف جوابات ملتے ہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ خود نوشت نگار کا یہ
کام نہیں کہ وہ صرف دوسروں کے کردار پیش کرے جن کا وہ مشاہدہ
کرتا ہے۔ اس کا کام اپنی تصویر پیش کرنا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال
ہے کہ زندگی ایک سفر ہے اور جینے والے کو چاہیے کہ بجائے
اپنے رخت سفر اپنے افعال اور اپنے ماضی کی یادوں کے اپنے
مشاہدات مشاہیر سے ملاقات ان کے کردار اور گفتار وغیرہ کا حال
بیان کرے ایک سوال یہ بھی ہے کہ آپ بیتی میں مصنف اپنی
زندگی کے واقعات بیان کرے یا روح کردار کی تصویر پیش کرے

آپ بیتی کے موضوعات کے سلسلے میں ایک اور بات بھی اہم ہے وہ یہ کہ اکثر مصنف واقعات کے بہاؤ میں اپنے موضوع سے دور چلے جاتے ہیں اور بہت دور تک کسی انجانے راہ رو کے ساتھ چلنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ غلط راستے پر آ نکلے ہیں۔ یہ خامی اردو خود نوشت نگاری میں بہت عام ہے سیاسی زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنی ذات کے ذکر سے آگے بڑھ کر سیاسی اور تاریخی واقعات میں اپنے آپ کو گم کر دیتے ہیں۔ بعض آپ بیتی لکھنے والے اپنے حسب نسب اور جد امجد کے ذکر میں آپ بیتی کو تذکرہ بنا دیتے ہیں ذات سے باہر کے واقعات خواہ کتنے ہی پر لطف اور بامقصد کیوں نہ ہوں قاری ان واقعات سے صرف اتنی دلچسپی رکھتا ہے کہ ان واقعات کے پس منظر میں خود نوشت نگار کی شبیہ ابھرتی ہے۔ اسی لیے خود نوشت لکھتے وقت حافظے کی ترغیب اور اس کی روک تھام کے لیے ایک مکمل طور پر قابل اعتماد دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہر شخص کا اپنی سیرت اور صورت کے بارے میں بڑا مبالغہ آمیز تصور ہوتا ہے۔ ہر آدمی کا "ہیرو" خود اس کی اپنی ذات ہوتی ہے اور یہ خود نوشت نگار کی خود پسندی ہے کہ وہ اپنی تصویر بناتے وقت اکثر اپنے آئیڈیل کی تصویر بنانے لگتا ہے اسی طرح جن واقعات کا بیان کیا جاتا ہے بہت ممکن ہے کہ ان کے وقوعہ

کے وقت ان میں سے بہت سے ان کے حاشیے خیال میں بھی نہ ہوں کیوں کہ ہر وکیل عدالت کے فیصلے کے بعد اس کے متعلق پہلے سے زیادہ اچھی بحث کر سکتا ہے اسی لیے آپ بیتی لکھتے وقت آپ بیتی نگار کو اپنی خود پسندانہ خواہشوں سے محتاط رہنا چاہیئے۔

اگرچہ خود نوشت نگار سے رنگین بیانی کی توقع غیر ضروری ہے لیکن اردو خود نوشت نگاری کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قبولیت عام انہیں آپ بیتیوں کو نصیب ہوئی ہے جو حقیقت نگاری کے ساتھ زبان اور بیان کا بھی کارنامہ ہیں۔

گوئٹے نے کمال دانائی سے اپنی آپ بیتی کا نام "شاعری اور سچائی" رکھا تھا۔ کیونکہ خود نوشت نگار صرف اپنی زندگی کا وقائع نگار ہی نہیں بلکہ اس کا فلسفیانہ مورخ بھی ہے۔ خود نوشت صرف سائنسی دستاویز نہیں بلکہ ایک فنی کارنامہ بھی ہوتی ہے۔ کسی بھی شخصیت کا بیان صرف واقعیت پسندانہ تذکرے سے نہیں ہو سکتا ایک سائنسی تصنیف بھی بہترین ترتیب پاکر آرٹ کا نمونہ بن جاتی ہے۔

اسلوب بیان ہر شخص کا الگ ہوتا ہے ہر آپ بیتی نوعیت کے اعتبار سے مصنف کی شخصیت کے تابع ہوتی ہے اور وہ اتنی نئی اور غیر متوقع ہو سکتی ہے جتنی کہ ایک اجنبی شخصیت کیونکہ ایک اسلوب بیان بھی مصنف کی شخصیت کا جزو ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ بیتی کا گھروندا شخصیت کی بنیاد پر بنتا ہے مگر اس گھروندے کی آب و تاب کا انحصار ادبی گارے اور مسالے پر ہوتا ہے عمدہ نثر نگاری

اور آرائش ہو تو گھروندا محل بھی بن سکتا ہے۔ خود نوشت میں حسن بیان اور اندازِ بیان کی بہر حال اہمیت ہوتی ہے یہ کام منجھا ہوا ادیب ہی آسانی سے کر سکتا ہے۔ نواب چھتاری نے اپنی آپ بیتی دو جلدوں میں لکھی لیکن وہ صاحب طرز نہیں ہیں انھوں نے جو کچھ قلم بند کیا اسے بس واقعات کی طویل فہرست ہی کہا جا سکتا ہے زندگی کے اہم سے اہم واقعات مصنف کے اوپر سے یوں گزر جاتے ہیں جیسے مصنف اس کا راوی ہو، یا تماشائی ہو۔ دل پر گزرنے والی کیفیت کی تہہ تک ان کا قلم اکثر نہیں پہونچا ہے۔

ان کے مقابلے میں سر رضا علی ہیں جن کی کوئی معروف یا معلوم تصنیف نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی خود نوشت ایک اہم اور قابل لحاظ دستاویز ہے جو ان کی نستعلیق زندگی اور سلیقہ مند تحریر کی آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور خواجہ غلام السیدین کی آپ بیتیوں پر مصنف کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ مولانا عبدالماجد اس فن کے استاد ہیں الفاظ کے انتخاب اور استعمال پر انھیں جو قدرت حاصل تھی اس کی جھلکیاں ان کی خود نوشت میں بھی شوخ رنگ میں ملتی ہیں۔ کوئی کم اہم یا معمولی شخصیت الفاظ کی بازی گری سے اپنے آپ کو رفیع الشان اور دیو ہیکل بنانے کی کوشش کر سکتی ہے لیکن جاننے والے معاصرین فوراً گرفت کر لیں گے۔ جوش کی شخصیت اور شاعری مسلم ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے 'یادوں کی برات'

میں جو کچھ لکھا ہے اس کی ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں پر گرفت کی گئی ہے۔

خود نوشت سوانح عمریوں کی ان کے عہد کے لحاظ سے تقسیم نہیں کی جا سکتی ہے ایک ہی عہد میں مختلف اقسام کی خود نوشت لکھی گئی ہیں کوئی واقعہ کسی کو ذہنی طور پر جھنجھوڑ دیتا ہے اور کوئی اس پر تبصرہ کیے بغیر سرسری طور پر گزر جاتا ہے اس سلسلے میں ظہیر دہلوی اور عبدالغفور نساخ کی مثالیں بہت واضح ہیں دونوں ایک ہی عہد کی پیداوار ہیں مگر زاویہ نگاہ میں فرق ہے جوش اور جواہر لعل نہرو تقریباً ایک ہی زمانے کی داستان بیان کرتے ہیں مگر دونوں کے ذہنی اور سماجی رویے مختلف ہیں —— ان تمام خصوصیات کے بعد ایک چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ آپ بیتی کا لکھا جانا ایک اتفاقی چیز ہے صرف اپنی مرضی اور مزاج کے تابع ہو کر ہی ایسا کام کیا جا سکتا ہے۔ اور لکھنے والے کو یہ خیال بھی نہیں آتا یا وہ یہ گوارا نہیں کرتا کہ کوئی اصول سامنے رکھے۔ کیونکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ بیتی لکھنے والا اگر بندھے ٹکے اصول بنا کر اور منصوبے کے تحت کام کرے گا تو آپ بیتی میں فطری بہاؤ پیدا نہ ہو سکے گا۔ اور آپ بیتی کا اصل مقصد باوجود خلوص نیت کے ادھورا رہ جائے گا۔ شاعری کی طرح فن کار کی ذات پر بیتنے والی کیفیات خود بخود اپنے اظہار کا سانچہ اور اسلوب متعین کرتی ہیں۔

کچھ افسانہ، کچھ حقیقت اور کچھ طرز ادا ہونے کے بعد بھی یہ لکھنے

والے کی جدوجہد زندگی کی سب سے اہم دستاویز ہوتی ہے اس کو پڑھتے وقت قاری کو لازماً اپنے آپ کو جج اور مصنف کو ملزم نہ سمجھ بیٹھنا چاہیئے بلکہ حتی الوسع جذباتی ہمدردی اور ذہنی ہم آہنگی کے ساتھ اپنے آپ کو اس کا رفیق اور ہم سفر بنا کر اسے نیک نیتی سے سمجھنے اور دیکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ بہترین قاری وہ ہے جو اپنے آپ کو مصنف کی جگہ دے کر اسے پڑھ سکے۔ ناصح اور نقاد تو بننا آسان ہے لیکن کسی کی خامیوں، کوتاہیوں، اور گمراہیوں پر کوئی حکم لگانے سے پہلے اس کی محرومیوں اور حالات کے جبر کو بھی پیش نظر رکھنا دیدہ وری کا تقاضہ ہے ؎

گنو سب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں
مرے قاتل حساب خوں بہا ایسے نہیں ہوتا

خود نوشت سوانح حیات کے مسائل اور ترقی کے امکانات

معرفت ذات صرف صوفیوں کی ہی فکر کا حصہ نہیں ہے۔ میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟ یہ سوال تقریباً ہر شخص کے دل میں طرح طرح سے سر اٹھاتا رہتا ہے۔ چونکہ یہ سوال خود اس کی ذات کی گہرائیوں سے اٹھتا ہے اس لیے جواب بھی ذات کی گہرائیوں میں تلاش کیا جاتا ہے۔

اردو میں Confession کی روایت نہیں ہے Confession بنیادی طور پر عیسائی عقیدے کی پیداوار ہے اردو میں براہ راست اعترافات بڑی حد تک مفقود ہیں۔ انگریزی میں Confession کے قسم کی آپ بیتیاں Spiritual autobiographies کے ذیل میں آتی ہیں بقیہ

آپ بیتیاں Secular autobiographies تصور کی جاتی

ہیں۔ اس قسم کی تقسیم انگریزی میں کافی پرانی ہے۔ لیکن اردو کی

زیادہ تر آپ بیتیاں ایسی ہیں جن پر سیکولر چھاپ ہے۔ روحانی طرز
کی آپ بیتیاں بہت کم نظر آتی ہیں۔

اردو خود نوشت سوانح حیات کے سرمائے پر جب ہم نظر ڈالتے
ہیں تو ذہن میں خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا زندگی کے
ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے اپنے حالات زندگی قلم بند
کرنے کی زحمت گوارا کی؟

مجاہد آزادی جعفر تھانیسری۔ غدر ۱۸۵۷ء کے داستان گو ظہیر دہلوی
اور منشی عنایت حسین، مورخ یوسف حسین خاں، صحافی عبدالمجید
سالک، دیوان سنگھ مفتون، قدوس صہبائی، شورش کاشمیری۔
شاعر جوش ملیح آبادی۔ شاد عظیم آبادی۔ احسان دانش۔ نقاد
کلیم الدین احمد، اختر رائے پوری۔ انشاء پرداز مفسر قرآن عبدالماجد
دریابادی۔ معلم اور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین، ڈرامہ نویس احمد شجاع
معروف عربی درس گاہوں کے استاد مولانا حسین احمد مدنی اور
مولانا محمد زکریا۔ متنوع ادیب خواجہ حسن نظامی۔ سیاست داں
اور اکابرین عصر چودھری خلیق الزماں اور چودھری فضل الحق
نواب چھتاری اور سر سید رضا علی اور منظوم آپ بیتیوں میں
واجد علی شاہ اور منیر شکوہ آبادی کے نام سامنے آتے ہیں۔ یہ کوئی
مکمل فہرست نہیں ہے لیکن کئی شعبے ایسے ہیں جن سے متعلق نا سیر

نے اس طرف مطلق توجہ نہیں کی مثلاً فنون لطیفہ موسیقی مصوری سنگ تراشی۔ دستکاری علاج معالجہ۔ تجارت و کاروبار اور کھیل کود
عبدالرحمن چغتائی۔ استاد فیاض خاں۔ بیگم اختر (اختری بائی فیض آبادی)

اور بسم اللہ خاں نے اگر اپنے حالات صفحہ قرطاس پر بکھیر دیئے ہوتے تو ان کی حیثیت قابل قدر اور قابل لحاظ اضافے کی ہوتی ادب کی مختلف اصناف کے سلسلے میں جائزہ لیجئے تو پتہ چلے گا کہ بہت سی اصناف کے کاملین اور سربراہوں نے اپنی ذات کی گہرائیوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش یا جرأت نہیں کی ہے۔ ماضی قریب اور حال میں بہت سی ایسی شخصیتیں تھیں اور ہیں جو عوام کی توجہ کا مرکز بنی رہیں لیکن ان کے سرچشمۂ فیض سے کسی آپ بیتی کا اجراء نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال مولانا ابوالکلام آزاد۔ جگر مراد آبادی۔ امتیاز علی عرشی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ ڈاکٹر احتشام حسین۔ آل احمد سرور۔ پریم چند۔ فراق گورکھپوری۔ فیض احمد فیض وغیرہ کے نام ابھر کر سامنے آتے ہیں ان حضرات نے اور دیگر مشاہیر نے آپ بیتی کی صنف کو در خود اعتنا نہیں سمجھا یا ان کو فرصت نہیں ملی یا موت نے مہلت نہ دی یا رازِ درون پردہ کو باہر لانا خلاف مصلحت سمجھا گیا۔ اس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہا نہیں جا سکتا ہے اس جگہ تھوڑا سا گریز کر کے آرتھر کوئسٹلر کے اس اظہار خیال کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا جو اس کی آپ بیتی کے دیباچے میں درج ہے۔

"To write one's memoirs before one has reached the age of fifty may seem a premature and some what presumptu-ous Under-taking. But if one's Past is worth recording at all, this should be done before its colour and fregrance have faded. Gains in distance and perspective must be balanced against losses in emotional freshness for facts are more-easily retained than feeling. Facts can be complemented by files and newspaper records, emotions not .

This point will become .Painfully apparent to the reader through the first five or six chapters of this book, which deal with my early communist days in Berlin and Russia . I found it possible to revivenaive enthusiasm of that period. I could analyse the ashes, but not resurrect the flame. I disliked writing these chapters, but felt the chronicler's compulsion to record material which eppears to him trivial and boring in the hope that at some future date it will appear less so. The reader is advised to get through these opening chapters as fast and as quielty as he can."

"پچاس سال کی عمر تک پہونچنے سے پہلے اپنی یادوں کو احاطہ تحریر میں لانا قبل از وقت اور کسی قدر بے باکانہ کوشش ہوگی تاہم اگر کسی کا ماضی اس لائق ہے کہ اس کا حال سپرد قلم کیا جائے تو یہ کام اس کا رنگ پھیکا پڑ جانے اور اس کی خوشبو اڑ جانے سے پہلے ہی کر لینا چاہیے فاصلے اور ظاہری نسبت میں ہونے والی یافت اور دوسری طرف جذباتی تازگی میں ہونے والے خسارے کے درمیان توازن لازماً برقرار رکھنا چاہیئے کیونکہ احساسات کے مقابلے میں حقائق کو آسانی کے ساتھ برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ حقائق کو فائلوں اور اخبارات کے ریکارڈ کا سہارا مل سکتا ہے جذبات کے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔

قاری کے لیے یہ نکتہ اس کتاب کے پانچویں یا چھٹے باب سے گزرتے وقت تکلیف دہ حد تک عیاں ہو جائے گا۔ اس کا تعلق برلن اور روس میں میرے ابتدائی کمیونسٹ زمانے سے ہے اس دور کے بے تصنع جوش و خروش کو پھر سے زندہ کر دکھانا میرے لیے ناممکن ثابت ہوا میں راکھ کا تجزیہ تو کر سکا لیکن شعلے کو پھر سے فروزاں نہ کر سکا۔ ان ابواب کا لکھنا مجھے پسند نہ تھا۔ لیکن واقعہ نگاری کے تقاضے نے مجھے ایسی باتیں جو اسے (قاری کو) اکتا دینے والی اور بے کیف معلوم ہوں گی، اس امید میں لکھنے پر مجبور کیا کہ کسی وقت مستقبل میں ایسی کیفیت نسبتاً کم ہو گی۔ قاری کو مشورہ دیا

جاتا ہے کہ شروع کے ان ابواب سے جس قدر تیزی اور خاموشی سے ہو سکے گزر جائے۔"

کوئسٹلر نے کیسی معنی خیز بات کہہ دی ہے کہ "میں راکھ کا تجزیہ تو کر سکا لیکن شعلے کو پھر سے فروزاں نہ کر سکا۔" یہ بیان ایک تجربے کا نچوڑ ہے اس کے ذریعہ یہ وضاحت مقصود ہے کہ ماضی کے جھروکے سے یادوں کو باہر لانا اور قلم کی جادو بیانی کے باوجود ان کی بارات کو تازگی اور شگفتگی کے ساتھ پھر سے آراستہ کرنا کس قدر مشکل کام ہے پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اسے قبول عام حاصل ہوگا۔ کون جان سکتا ہے کہ ہمارے بعض ادیبوں نے ممکن ہے کوشش کی ہو اور پھر پتھر بھاری ہونے کی وجہ سے اسے چوم کر چھوڑ دیا ہو۔

خود نوشت سوانح حیات کی ایک اہم دشواری حافظے کی بھول بھلیاں ہے۔ یاد رکھنے کی قوت کا انحصار مصنف کے متواتر بدلتے ہوئے درجہ شعور پر ہوتا ہے اہم باتیں ذہن سے محو ہو جاتی ہیں اور غیر اہم باقی رہ جاتی ہیں۔ کبھی ناپسندیدہ باتیں ہم بھول جاتے ہیں اور کبھی وہ ناپسندیدہ باتیں بے جا اہمیت کی مالک بن جاتی ہیں عمر کے اعتبار سے حافظے کی قوت میں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے مثلاً پندرہ سے تیس سال کا وقفہ بہترین ہوتا ہے اسی طرح بچپن کا بیان عموماً سرسری یا غیر مستند ہی ہوتا ہے۔ کش مکش اور دشواریوں میں گزرا ہوا بچپن بہ نسبت ایک خاموش اور خوش حال بچپن کے زیادہ یاد رہتا ہے اکثر اس عہد کے حالات کے لیے بزرگوں کا سہارا لینا پڑتا ہے اس زمانے کو بیان کرنا گویا ان کی آنکھ سے دنیا کو دیکھنا ہو۔

"شائد ہوتا یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی زبان سے سن کر بچوں کو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہ خود ان کی یاد کا کمال ہے کہ انھیں اپنے بچپن کے حالات اتنی چھوٹی سی عمر سے یاد ہیں۔"[۵۱]

مولانا عبدالماجد دریابادی کی پوری عمر لکھنے پڑھنے میں گزری انگریزی ادب اور فلسفے سے بہت اچھی واقفیت تھی یقین کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے انگریزی اور دیگر زبانوں مثلاً فارسی عربی اور اردو کی بہت سی آپ بیتیاں پڑھی ہوں گی اور ان کی روایت سے آشنا رہے ہوں گے لیکن جب اپنے حالات زندگی لکھنے بیٹھے تو کام کے پھیلاؤ اور دشواریوں کا اندازہ ہوا نظر ثانی کے تمام مراحل کو شامل کر کے تقریباً چار سو صفحے کی آپ بیتی کم و بیش تیرہ سال میں مکمل کر پائے۔ دیباچے میں اس کا حال مختصراً یوں لکھا ہے۔

"تسوید اور تحریر کی پہلی بنیاد تو جولائی ۱۹۵۴ء میں پڑی اس وقت خود گزشت کی ترتیب تاریخی پیش نظر تھی مگر اس طرح تحریر بڑی ہی طویل و ضخیم ہوتی جارہی تھی چند ہی ورق کے تجربے کے بعد کام روک دینا پڑا اور جنوری ۱۹۵۶ء کے اخیر سے نقشہ بدل کر اور طوالت سے بچ کر قلم برداشتہ از سر نو لکھنا شروع کر دیا اس کے لیے وقت پابندی کے ساتھ روزانہ نہ نکل سکا۔

وقفے اور ناغے درمیان میں کثرت سے اور لمبے لمبے ہوتے

---

۵۱ مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں۔ خواجہ غلام السیدین صفحہ ۲۱

رہے جوں توں مسودۂ اول ۱۴ر اگست ۵۸ءکو ختم ہو گیا لکھنے کی واقعی مدت کل پانچ مہینے کی رہی مسودہ کٹ پٹ بہت گیا تھا بیسیوں بعد کسی کے چلائے نہ چلتا اس لیے یوم جمعہ ۲۶ر جون ۵۶ء (۱۸ر ذی الحجہ ۱۳۷۵ھ) کو اسے اپنے ہاتھ سے دوبارہ لکھنا شروع کیا اور ظاہر ہے کہ یہ صفائی محض نقل ہی نہ رہی۔ اضافہ۔ ترمیم، کاٹ چھانٹ اچھی خاصی ہو گئی اور مکمل ستمبر ۵۹ء میں ہو پائی نظر ثانی کا سلسلہ ہر سال دو سال کے بعد وقتہً فوقتہً ۶۴ء اور ۶۵ء کی نظر ثانی اچھی طرح یاد ہے اور اب تازہ نظر ثانی کی نوبت ۶۷ء میں آ رہی ہے جب سن کا ۷۴، واں سال ختم ہو کر ۷۵، واں شروع ہونے کو ہے اور یہ سطریں اللہ کا نام لے کر جمعرات ۳ر فروری ۶۷ء ۱۲ر شوال ۸۶ھ کو ختم ہو رہی اور آئندہ کا حال کون جانے۔" [۵۱]

سودہ فروری ۱۹۶۷ء میں مکمل ہوا اور فروری ۱۹۷۷ء میں انتقال ہوا وفات سے چند سال قبل بیماری کے اثرات رہے اس لیے یہ سمجھنا چاہیئے کہ خود نوشت سوانح حیات نے زندگی کے بہت بڑے حصے کے واقعات کا احاطہ کر لیا ہے مولانا کے کچھ معمولات تھے جن کی وہ سختی سے پابندی کرتے تھے۔ انگریزوں کی وقت کی پابندی انھیں بیحد پسند تھی کیونکہ وہ خود وقت کے بڑے پابند تھے صبح سے رات تک کا ایک نظام اوقات انھوں نے بنا رکھا تھا جس پر وہ کاربند

---

[۵۱] آپ بیتی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی۔ صفحہ ۱۳

رہتے تھے۔ ان کی زندگی میں جو نظم تھا وہ اردو کے کسی اور ادیب کے یہاں مشکل سے ملے گا۔ ایسے شخص کی خود نوشت کی تکمیل میں اتنا عرصہ لگ گیا۔ اس سے کام کی وسعت کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے لیکن ایک خوبی بہر حال تسلیم کرنا ہو گی کہ انھوں نے مدعا کو ملحوظ رکھا۔ اپنی ذات کے بارے میں حالات بیان کرنے پر اپنی توجہ مرکوز رکھی اور کہیں کوئی غیر متعلق بحث نہیں چھیڑی۔

آپ بیتی غزل نہیں کہ اس میں مطلع اور مقطع ہو۔ ناول نہیں جو طربیہ یا المیہ ہو اور جس میں پلاٹ یا کلائمیکس ہو۔ اس کا کوئی طریق کار۔ کوئی اصول کوئی ضابطہ کوئی معیار آج تک کسی نے مرتب نہیں کیا ہے۔ اردو میں ہی نہیں شاید کسی زبان میں کوئی متعین رہبر اصول نہیں ہے سارا انحصار صاحب ترتیب و تصنیف پر ہے وہ جو راہ چاہے اختیار کرے آپ بیتی لکھنے کا فن ایسا ہے جس پر جہاں تک پتہ چل سکا ہے کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہر اکا دکا مضامین مل جائیں گے۔ یہ صورت حال اس صنف کی کم مائیگی کی نشان دہی کرتی ہے۔ غزل۔ قصیدہ۔ مرثیہ۔ ناول۔ افسانہ پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں۔ خود نوشت کو نظر انداز کرنے کا رجحان عام ہے۔ اپنی ذات و شخصیت کو، اپنی صفات و خوبیوں کو منظر عام پر لانے کا یہ ایک اچھا وسیلہ ہے۔ نظم میں نہ سہی نثر میں۔ جولانی کا ایک وسیع میدان ہے۔ لیکن اس طرف بہت کم مشاہیر توجہ کر رہے ہیں۔

اپنی سرگزشت کو تسلسل سے بیان کرنے میں روزنامچے اور خطوط بہت معاونت کر سکتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں یا یوں سمجھئے

کہ اردو میں روزنامچہ لکھنے کا رواج تقریباً نہیں ہے۔ خطوط باقاعدگی سے رکھنے کی بھی روایت نہیں ہے۔ شائد اس کا تعلق قومی مزاج سے ہے۔ جن مشاہیر کے خطوط منظر عام پر آئے وہ بھی بے ترتیب سے ہیں۔ روزنامچہ نویسی ایک قسم کی پابندی کا تقاضہ کرتی ہے دن بھر کے قابل ذکر واقعات معلومات اور تاثرات کو رات کے وقت قلم بند کر دیا جائے۔ اس کی پابندی بے ترتیب زندگی میں بہت مشکل کام ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی شخص سرگرم زندگی سے فرصت پاکر اپنے حالات لکھنے کی بات سوچے تو اس خیال کو عملی جامہ کیونکر پہنائے۔ حافظے اور یادداشت کے نخرے نرالے ہوتے ہیں کبھی بہت پرانی بات ذہن کے آئینے پر نسبتاً صاف شفاف عکس کی طرح ابھر آتی ہے اور کبھی کچھ دیر پہلے کی بات یاد ہی نہیں آتی۔ کوئی تسلسل کوئی ربط زمانی نہیں رہ پاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے حالات لکھنے کا ارادہ رکھنے والا جھنجھلاتا ہے اور اکتا کر خیال ترک کر دیتا ہے

رحم علی الہاشمی، موتی لال نہرو کے اخبار سے وابستہ رہے اور حکومت ہند کے آرکائیوز شعبہ میں برسوں کام کرتے رہے۔ چند سال قبل انھوں نے اپنی یادوں کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ ان کا بیان ہے کہ کسی زمانے میں انھوں نے اپنے حالات سے متعلق ایک مسودہ تیار کیا تھا جسے ایک صاحب اشاعت کے لیے لے گئے لیکن ان کا انتقال ہو گیا اور اس مسودے کا پتہ نہ چل سکا۔ کم و بیش ۸۰ سال کی عمر کو پہنچ کر پرانی یادوں کو تازہ کرنا بے حد مشکل کام ہے۔ نتیجہ ان کی کتاب کی شکل میں سامنے آچکا ہے واقعات اکھڑے اکھڑے اور تشنہ ہیں جیسے

تفصیل خود مصنف کے ذہن سے محو ہو چکی ہو۔

ہمارے زمانے کی ایک ممتاز ترین شخصیت مولانا ابو لکلام آزاد کو افسوس اس بات کا تھا کہ زمانہ ان کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے ناسازگار تھا ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"غالب کو تو صرف اپنی شاعری کا رونا تھا، نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔" [1]

اس بات سے انکار شاید مشکل ہوگا کہ اگر آزاد کھل کر اپنی مکمل خود نوشت سوانح حیات چھوڑ جاتے تو اس کا مقام اردو کے ادب عالیہ کے صف اول میں ہوتا۔ مولانا شائد ان لوگوں میں تھے جو اپنے قلم سے اپنی پہلودار شخصیت کے متعلق تفصیل سے لکھنا ایک طرح کی اشتہار بازی سمجھتے تھے اس کے باوجود اپنی ذات اور احساس برتری سے مسحور ہو کر ان کے قلم سے اکثر بے اختیارانہ کچھ خودستائی کے الفاظ بھی نکل گئے ہیں مثلاً

"بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مذہب، علوم و فنون۔ ادب انشاء، شاعری کوئی وادی ایسی نہیں جس کی بے شمار راہیں مبدأ فیض نے مجھ نامراد کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن و ہر لحظہ نئی نئی بخششوں سے دامن مالامال نہ ہوا ہو، بلکہ یکہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزل کی

---

[1] نقش آزاد۔ صفحہ ۱۵۷۔ کتاب محل لاہور سنہ ۱۹۵۹ء

جلوہ طرازیاں عائد کر دیتی ہیں۔ لیکن افسوس جس ہاتھ نے
فکر و نظر کی ان دولتوں سے گرانبار کیا۔ اس نے شاید سر و سامان
کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا
ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے
کر دیا گیا۔" [1]

اس تحریر کے تیور بتاتے ہیں کہ مولانا آزاد اگر آپ بیتی لکھنے کی طرف رخ کرتے تو اپنی جامع صفات شخصیت میں اپنے منفرد انداز بیان سے چار چاند لگا دیتے اور اردو کی خود نوشت کے آفاق بلند اور وسیع تر ہو جاتے۔ حصول آزادی کے بعد ان کو کئی سال کی مہلت ملی۔ اس عرصے کی (غالباً پندرہ سولہ سال) ایک انگریزی کتاب India wins freedom کے سوا جو ہمایوں کبیر کی معرفت بعد میں منظر عام پر آئی کوئی اور تحریر کتابی شکل میں تشنگان علم و ادب کو نہ مل سکی۔

فراق گورکھپوری نے ہر چند کہ خود نوشت سوانح حیات قلم بند نہیں کی لیکن ایک مضمون میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی انا کا واضح اظہار ہوتا ہے اور اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ انھیں اپنی برتری کا احساس کس شدت سے ہے ذیل میں اسی مضمون کے دو اقتباسات مختصراً دیے جا رہے ہیں۔

"اپنی قصیدہ خوانی میری مراد نہیں بلکہ آپ حضرات کو
دعوت فکر دینا مراد ہے۔ اردو نظم کے مشاہیر نظیر اکبر آبادی
سودا۔ انیس۔ اکبر۔ چکبست درگا سہائے سرور۔ اقبال

---

[1] نقش آزاد صفحہ ۱۵۷-۱۵۸

حفیظ جالندھری۔ حالی۔ اختر شیرانی کے کارناموں سے انکار کرنا ممکن نہیں لیکن حفیظ کے گیتوں کو اگر ہم الگ کردیں تو ان تمام مشاہیر کی سنجیدہ مسلسل نظموں میں اسلوب کا تنوع اور اس کی رنگارنگی نہ ملے گی۔ جوش ملیح آبادی کے یہاں دو تین اسالیب بیان ضرور مل جائیں گے مگر میں عرض کروں گا کہ تعداد میں اتنے زیادہ مختلف اسالیب بیان جتنے میرے یہاں پیش کئے گئے ہیں کہیں نہیں ملتے ہیں۔" ۵۱

بعض بلند پایہ علمی و ادبی شخصیتوں نے اپنی تحریروں میں جگہ جگہ اپنی نااہلی اور ہیچ مدانی کا ذکر کیا ہے لیکن فراق اور ابوالکلام کے یہاں وہ چیز نہیں ملتی ہے جسے انکسار کہتے ہیں۔

"شہرت میرے لیے مصیبت ہوگئی ہے پھر میری حیثیتیں بھی کئی ہیں اردو ہندی۔ انگریزی تمام حلقوں سے نظموں غزلوں نثر کے مضامین پیغامات۔ صلاح و مشورے کی مانگیں آتی رہتی ہیں جو ذہن میں ایک پراگندگی اور انتشار پیدا کردیتی ہیں۔" ۵۲

پال ڈیلانی نے ایک جگہ اپنی یہ رائے دی ہے کہ انگریزی میں آپ بیتی لکھنے والی خواتین نے مردوں کے مقابلے میں جذبات اور احساسات کا گہرا اظہار کیا ہے۔ ایک خاتون جین کارلائل نے لکھا ہے کہ

---

۵۱ نقوش آپ بیتی نمبر صفحہ ۱۳۶۳ جون ۱۹۶۴ء

۵۲ " " " " ۱۳۷۰ " "

"اگر میں اپنی سوانح عمری شروع سے آخر تک بغیر کسی قسم کے اخفاء اور بغیر کسی جھوٹے رنگ کے لکھتی تو کسی خامی کے لیے نہ سہی میرے ملک کی عورتوں کے لیے ایک نایاب دستاویز ہوتی مگر شائستگی مانع ہے۔" [1]

منجملہ دیگر باتوں کے ایک کمی اردو خود نوشت سوانح حیات کے سلسلے میں یہ بھی ہے کہ خاتون قلم کاروں کی قابل لحاظ تعداد ہونے کے باوجود ان کو اس وادی میں قدم رکھنے میں تامل رہا ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال کی خود نوشت سوانح حیات "تزک سلطانی" یعنی "تاج الاقبال" ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی۔ اگرچہ یہ تالیف اس زمانے کی ہے جب خود نوشت کی روایت زیادہ عام نہ تھی۔ لیکن اس میں بھی ہمیں ایک عورت کا دل دھڑکتا ہوا نظر نہیں آتا ہے۔ ریاست کی سیاسی ریشہ دوانیوں اور انتظامی امور کی دشواریوں کا تفصیلی بیان ہی ملتا ہے۔

عصمت چغتائی نے اپنے بچپن کی یادیں اور خاندانی حالات "کاغذی ہے پیرہن" کے عنوان سے لکھنا شروع کئے ہیں۔ یہ یادیں قسط وار مضامین کی شکل میں ماہنامہ "آج کل" دہلی میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مگر ابھی تک یہ یادیں memoires خود نوشت کی مربوط شکل میں سامنے نہیں آئی ہیں ان مضامین میں بھی جیسا کہ پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے مرکزی اہمیت مصنفہ کی ذات اور شخصیت کو نہیں بلکہ اس مخصوص ماحول کو دی گئی ہے جس میں انکا بچپن گزرا ہے۔

---

[1] جین کارلائل۔ بہ حوالہ اردو میں سوانح نگاری (سید شاہ علی) صفحہ ۵۷

ایک زمانے میں ان کے افسانوں کی بے باکی پر بڑی بحثیں ہوئی تھیں اور اردو ادب تقریباً ایک زلزلے سے دوچار ہوا تھا۔ لیکن جس نے بے دھڑک افسانے لکھے اس وقت کی اخلاقی قدروں کی مطلق پرواہ نہ کی اور ایک بڑے طبقے میں بدنامی مول لی اسے اپنے حالات نسبتاً کم بے باکی سے سہی لکھنے میں تامل ہے۔

خاتون ادیبوں میں ذاتی جھلکیاں دکھانے والی قلم کاروں میں قرۃ العین حیدر سرفہرست ہیں۔ ان کی ضخیم کتاب "کارِ جہاں دراز" اپنی نوع کی منفرد کتاب ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان کے طرز تحریر میں نرالا بانکپن ہے بہرحال سوانح حیات کا تانا بانا مصنفہ نے اپنے گرد نہیں بنا ہے بلکہ اس بسیط کتاب میں یہ کوشش ملتی ہو کہ ایک شخصیت اپنے چہار اطراف کے ماحول، خاندانی حالات، موروثی عادات، مختلف کردار، عقیدت اور تجربے کے امتزاج سے کس طور پر نکھرتی اور تکمیل تک پہونچتی ہے۔ کسی شخصیت کو جب ہم ان عوامل کے پس منظر میں دیکھتے ہیں تو بڑی جاذب نظر اور جامع تصویر ابھرتی ہے۔ بلاشبہ یہ تمام خوبیاں قرۃ العین کی تصنیف میں ملتی ہیں لیکن انھوں نے اسے سوانحی ناول یا "فیملی ساگا" کا نام دیا ہے واقعات اور کرداروں کا ایک تسلسل ہے جن کا ناول نگار کے تہذیبی نشو ونما میں نمایاں حصہ رہا اور جو اس توسط سے ناول میں ابھرتے ہیں۔ یہ خود نوشت سوانح حیات سے زیادہ مصنفہ کے خاندان کی تاریخ ہے کیونکہ کہانی۔ بارھویں صدی سے شروع ہوتی ہے اور ہمارے زمانے تک چلتی رہتی ہے۔

ملک کے مختلف شعبوں میں ہر طرح کی ترقیوں اور قلم کی آزادی کے باوجود
خواتین کے لیے بے جھجھک ذاتی اظہار آسان کام نہیں ہے
دوسروں کے جذبات اور احساسات کا بیان اردو کی ادیب خواتین
نے خوب خوب کیا ہے مگر اپنے ذاتی جذبات اور تجربوں کے بیان میں
تقریباً خاموش ہی ہیں۔ اردو ظاہر ہے کہ پنجابی سے زیادہ وسیع ہے
لیکن پنجابی میں مشہور ادیبہ امرتا پریتم نے خود نوشت کو منظر عام پر لانے
میں تامل نہیں کیا۔ امرتا پریتم کی خود نوشت کا انگریزی ترجمہ
Revenue Stamp "رسیدی ٹکٹ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اپنی
اس تصنیف میں امرتا پریتم نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے اور دل
کے معاملات بڑی صفائی اور بے باکی سے بیان کیے ہیں۔

ترقی پسندوں نے اردو کو بہت کچھ دیا۔ ہماری زبان میں سب ہی
لوگ ایسے نہیں ہیں جو ترقی پسند ادب کی ہر تحریر پر خط تنسیخ پھیرنا چاہیں
گے بہتوں نے اسے گوارہ کیا ہے۔ ترقی پسند ادب کے تیور چونکا دینے
والے رہے ہیں کیونکہ اس کی روایت انحراف اور بغاوت کی رہی ہے
لیکن اب وہ لوگ بھی اس کوچے میں آرہے ہیں جو پرانے ترقی پسند ہیں
اور اپنی ذات سے زیادہ اجتماعیت پر زور دیتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین
رائے پوری اور قدوس صہبائی نے اس کی ابتدا کی ہو لیکن یہ دونوں حضرات
پاکستان میں ہیں۔ اور ان کی خود نوشت کے بس اقتباس ہی یہاں تک
پہونچ سکے ہیں۔ علی سردار جعفری نے دہلی کے ماہنامے "بیسویں صدی" میں
ایک سلسلہ شروع کیا لیکن اس میں اوروں کا ذکر زیادہ ہو اور اپنا ذکر نہیں کے
برابر ہے۔ اقبال اور جوش کی شاعری کے مقابلے پر طویل اظہار رائے ہو

لیکن یہ سب باتیں مصنف کی ذات سے قطعی غیر متعلق ہیں۔

ہمارے ملک میں انگریزی کے اثرات نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں کی خاطر خواہ ترقی میں حائل ہیں۔ اس بحث میں پڑے بغیر کہ ملک کی مختلف زبانوں میں رابطے اور کڑی کی حیثیت کس زبان کو حاصل ہوگی۔ ایک حقیقت کا بیان مقصود ہے اور وہ یہ کہ تقریباً بلا استثنا تمام پڑھے لکھے لوگ جو کسی قدر صاحب حیثیت بھی ہیں اپنے بچوں کو انگریزی ذریعہ تعلیم کے اسکولوں میں داخلہ دلانے کی جدوجہد کرتے ہیں، مادری زبان کو نظر انداز کرنے کا ایک عام رجحان پایا جاتا ہے۔ جواہر لعل نہرو۔ راجندر پرشاد ایوب خاں۔ نراد چودھری۔ مرارجی ڈیسائی۔ دی۔ دی گری۔ خواجہ احمد عباس وغیرہ سب نے خود نوشت انگریزی میں لکھی۔ زمانہ حال میں فوج کے کئی افسران نے قلم اٹھایا تو وہ بھی انگریزی میں انگریزی بلاشک وشبہ ایک اہم اور بین الاقوامی زبان ہے جس نے ہمارے ذہنی افق کو نئی وسعتیں عطا کی ہیں۔ سوچنے سمجھنے اور اظہار رائے کے بہت سے وسیلے انگریزی نے فراہم کیے ہیں لیکن صورت حال کچھ اس قسم کی ہے کہ انگریزی کے تناور درخت کے سائے میں بے شمار پودے اُگ تو سکتے ہیں لیکن اس کا ہمہ گیر سایہ چھوٹے پودوں کی بالیدگی میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ اس کا ایک تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ اردو کے بہت سے انگریزی داں انگریزی میں سوچتے ہیں اور ان کی تخلیق میں طبع زاد چیزیں کم اور ترجمے، چربے اور سرقے نمایاں ہوتے ہیں۔ انگریزی کا جو معیار اور رتبہ ہے کوئی دوسری زبان اس معیار تک پہونچ نہیں سکی ہے ملکی زبانوں میں صحت مند مقابلہ نہیں ہو رہا ہے کیونکہ آج بھی انگریزی کو Status Symbol یا حیثیت کی

علامت سمجھا جاتا ہے وہ شخصیتیں یقیناً قابلِ تعریف ہیں جو انگریزی بہت اچھی لکھنے کی صلاحیت کے باوجود اپنی مادری زبان میں اظہارِ رائے کو ترجیح دیتی ہیں۔

کے۔ ایم۔ پانیکر کا شمار ملک کے ممتاز ترین منتظموں اور سفارت کاروں میں ہوتا تھا۔ انھوں نے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ ریاستی منصبوں اور سفارتی عہدوں پر فائز رہے لیکن انھوں نے اپنی خود نوشت ملیالم زبان میں ہی لکھی جس کا ترجمہ حال ہی میں انگریزی میں ہوا ہے۔ مارکسی کیمونسٹ پارٹی کے مشہور لیڈر اور کیرالا کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر ای۔ ایم۔ ایس۔ نمبودری پد کی خود نوشت سوانح حیات بھی مادری زبان میں ہے۔ خواجہ غلام السیدین انگریزی میں اچھے سے اچھا لکھ سکتے تھے لیکن ان کی آپ بیتی نامکمل سہی اردو میں ہی ہے۔ ان کے مقابلے میں ان کے رشتے کے بھائی خواجہ احمد عباس جنھوں نے اردو میں اب تک بہت کچھ لکھا ہے اور اب بھی لکھ رہے ہیں اپنی آپ بیتی انگریزی میں[1] لکھی۔ ممکن ہے وہ اردو میں بھی قلم اٹھانے کا ارادہ رکھتے ہوں لیکن ان کا انگریزی میں خود نوشت لکھنا بہرحال اردو کا نقصان ہے۔ سید رضا علی بھی انگریزی میں لکھنے پر قدرت رکھتے تھے اور ان کا ارادہ بھی انگریزی میں لکھنے کا تھا مگر اردو کی محبت غالب آئی اور اپنی مادری زبان کی خود نوشت کے ذخیرے میں انھوں نے ایک قابلِ قدر اضافہ کیا۔ چودھری خلیق الزماں بنیادی طور پر ایک سیاست داں تھے اور ان

---

[1] I am not an island, An experiment in autobiography
By K. A. Abbas

کی آپ بیتی اگرچہ سیاسی نوعیت کی ہے لیکن انھوں نے اردو میں سیکڑوں صفحات میں اپنی خودنوشت تحریر کی اس کے مقابلے میں ان کی انگریزی آپ بیتی ضخامت کے اعتبار سے کم ہے۔

خودنوشت سوانح حیات کے سلسلے میں ایک اور قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ مصنف اپنی خودنوشت کی اشاعت کب کرے۔ موت کا وقت معین نہیں ہے۔ اچھی صحت رکھنے والے جلد مر جاتے ہیں اور خراب صحت رکھنے والے لمبی عمر پاتے ہیں۔ یہ کوئی کلیہ نہیں لیکن مشاہدے میں ایسے بے شمار واقعات ہیں۔ سوال یہ ہے کہ خودنوشت زندگی میں شائع ہو تو کس عمر میں؟ یہ ایسا معاملہ ہے جس کی طرف شاید کسی نے توجہ نہیں کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سید رضا علی کی خودنوشت اعمال نامہ کا صرف پہلا حصہ شائع ہو سکا دوسرے حصے کا ذکر ان کے پہلے حصے میں ملتا ہے۔ لیکن دوسرے حصے کا کہیں پتہ نہیں چلتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے حصے میں چونکہ مرحوم کی دوسری بیوی کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ جو غیر مذہب کی تھیں اس لیے مرحوم کی اولاد نے اس کو منظر عام پر نہ لانے کا فیصلہ کیا ہو۔ سبب کچھ بھی ہو نقصان اردو کو ہی پہونچا ہے۔

خواجہ غلام السیدین نے خودنوشت لکھنا شروع کی۔ عنوانات قائم کر دیئے لیکن آدھے سے کم عنوانات کا احاطہ کر پائے تھے کہ اچانک انتقال ہو گیا۔ جوش ملیح آبادی نے ۱۹۷۰ء میں یادوں کی برات لکھی اور آپ بیتی اپنی جگہ پر مکمل کر دی۔ مگر آپ بیتی شائع ہونے کے بعد اس کے ردعمل میں ان کی زندگی میں بہت سے اہم انقلابات ظہور پذیر ہوئے۔

اُن کی آپ بیتی پر جو اعتراضات ہوئے جوشؔ صاحب ان اعتراضات پر یقیناً اپنی رائے دینا چاہتے ہوں گے۔ جو ان کے شائقین کے لیے یادوں کی برات کے برابر ہی دلچسپ ہوتے۔ مگر یہ توقع پوری نہ ہو سکی کہ جوشؔ صاحب یادوں کی برات کی دوسری قسط لکھتے ایران کے شاہ رضا شاہ پہلوی کی خود نوشت "وطن کے لیے میرے عزائم" ان کی پر شکوہ اور پر عزم زندگی کا پورا پورا احاطہ کرتی ہے لیکن شاہ کی زندگی کا نامکمل نقشہ ہے۔ عروج سے زیادہ قابلِ ذکر شاہ کا زوال اور اس کے تاثرات تھے شاہ کی خود نوشت تکمیل کے بعد بھی ادھوری رہ گئی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے آپ بیتی کا مسودہ لکھا اور زندگی میں ہی بتا دیا تھا کہ اس کی اشاعت ان کی وفات کے بعد ہو۔

اردو ادب میں شعر و شاعری، افسانہ اور ناول کی بھرمار ہے تخلیقات کا ایک سیلِ رواں ہے تنقید پر بھی اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے لیکن سوانح حیات کم ہیں اور خود نوشت سوانح حیات اس سے بھی کم ہیں۔ آپ بیتی لکھنے کا فن شاید ایسا ہے جسے سب سے زیادہ نظر انداز کیا گیا ہو یہ ایک آہستہ خرام چھوٹی سی ندی کے مانند ہے۔ شاعروں اور افسانہ نگاروں کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس بات کی شاید سوچتے بھی نہیں لیکن انھی کے علاوہ موجودہ زمانے میں بھی ایسی ہستیاں موجود ہیں جن کی خود نوشت پڑھنے والوں کے لیے بے پناہ دلچسپی کا باعث ہو گی لیکن یہ سب لوگ اپنی موجودہ سرگرمیوں میں ایسے مصروف ہیں کہ اپنے حالات اور اپنی ذات کی بابت کچھ قلم بند کرنے کا خیال بھی نہیں آتا ہے۔

آپ بیتیوں کی کمی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اردو کے ادیب کی مالی حالت عموماً اچھی نہیں ہوتی اور اگر وہ ہزار دو ہزار روپے آپ بیتی پر خرچ کرنے کی قدرت رکھتا ہو تو بھی یقینی نہیں کہ یہ رقم اسے واپس مل جائے گی —— اس لیے ہر ایک اس وادی دشوار میں قدم رکھنے کی بات نہیں سوچ سکتا —— خود نوشت کے سلسلے میں باوجود معتوب ہونے کے جوش صاحب سے زیادہ خوش قسمت رہے کیونکہ نہ صرف شاعری کی دنیا میں ان کا ایک علیحدہ مقام ہے بلکہ ان کی آپ بیتی جس طرح ہاتھوں ہاتھ لی گئی ہے اس کی مثال شائد کسی اور نثری تصنیف کے سلسلے میں نہ مل سکے گی۔

اردو کی راہ میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ گزشتہ پینتیس[35] سال میں جو نسل ابھری ہے اس کا اہم حصہ اردو سے نابلد ہے اردو دانوں کی تعداد میں روز بروز کمی ہوتی جا رہی ہے۔ قیام پاکستان کی وجہ سے اردو دانوں کا ایک طبقہ الگ ہو گیا ہے اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں سے ہماری واقفیت بہت سطحی رہ گئی ہے۔

شعر و شاعری اور افسانوں کی اشاعت کے لیے مختلف رسائل، مقامی ادبی نشستیں وغیرہ ہوتی ہیں لیکن خود نوشت کی اشاعت کی گنجائش صرف مطبوعہ کتابوں میں ہوتی ہے خود نوشت کی دشواری اور پذیرائی کی دقت ایسی چیزیں ہیں جو حوصلہ شکنی کے لیے ہر وقت موجود ہیں۔

اردو آپ بیتی میں ایک بات قابل ذکر ہے کہ آپ بیتی لکھنے والوں نے عموماً یہ ظاہر نہیں کیا ہے کہ وہ کسی اور خود نوشت سے متاثر ہوئے ہیں۔ انگریزی میں آپ بیتیاں بہت لکھی گئی ہیں۔ روسو، اسپنسر،

گبن اور جے. ایس. مل جیسے مصنفوں کی آپ بیتی پڑھنا فخر سمجھا جاتا ہے انگریزی داں حضرات مثلاً رضا علی. خواجہ غلام السیدین. یوسف حسین خاں. مولانا عبدالماجد دریابادی نے مذکورہ ادیبوں اور دیگر مصنفوں کی آپ بیتیاں ضرور پڑھی ہوں گی. فارسی دانوں نے شیخ علی حزیں اور بابر کے اس قسم کے رشحات قلم کا ضرور مطالعہ کیا ہوگا. لیکن کسی نے صراحت کے ساتھ اس کا تذکرہ نہیں کیا ـــــ شعوری طور پر پڑنے والے اثرات کا اعتراف کسی نے نہیں کیا ہے. مختلف لوگوں نے اسباب تحریر بتائے ہیں. لیکن ان میں یکسانیت نہیں ہے کسی نے تحدیث نعمت بتایا ہے، کسی نے دوستوں کا اصرار بتایا ہے کسی نے دلچسپ مشغلہ قرار دیا ہے. غرض کہ سب نے الگ الگ وجوہات بیان کئے ہیں. مقصد اور مدعا کے بارے میں بھی اختلاف ہے. ایک تجزیہ اس بات کا ہوتا ہے کہ آپ بیتی لکھنے والے کا قاری سے کس قسم کا تعلق ہے؟ وہ اس کے سامنے خود کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے؟ اپنی تصویر کا خاکہ کیسا بناتا ہے؟ یہ بات طے شدہ ہے کہ مصنف اپنا ایک کردار متعین کر لیتا ہے پھر اسی کے مطابق اپنے جوہر دکھاتا ہے. اسٹیج پر ایک کے بعد ایک پردے اٹھتے جاتے ہیں. عموماً خاندانی حالات اور بچپن کے کوائف بیان کئے جاتے ہیں. پھر پردہ اٹھتا ہے اور اس کے بعد یہ سلسلہ آخر تک چلتا رہتا ہے کہیں کوئی بات حذف کی جاتی ہے اور کہیں زور دیکر کوئی بات کہی جاتی ہے منجھا ہوا ادیب عموماً متعین کردار سے کہیں گریز نہیں کرتا ہے جس انداز میں ابتدا کرتا ہے عموماً اسی انداز میں تکمیل تک پہونچتا ہے. معاشرتی. سیاسی اور ادبی حیثیت غالب رہتی ہے.

اردو میں خود نوشت سوانح حیات کی خصوصیات اور اس کی راہ میں حائل دشواریوں پر نظر ڈالنے کے بعد ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ بہ حیثیت صنف ادب کے موجودہ عہد میں اس صنف کے پھلنے پھولنے کے نئے امکانات ہیں بھی یا اردو میں خود نوشت سوانح حیات کی صورت حال ہمیشہ یہی رہے گی کہ جب کبھی کوئی منچلا دل کی بات سنانے کی ہمت کرے گا۔ ایک خود نوشت کے منظر عام پر آنے سے آپ بیتی کی سطح آب پر موجوں کا ایک جال سا بچھے گا اور تھوڑا وقت گزرنے کے بعد پانی کی سطح پھر برابر ہو جائے گی۔

سگمنڈ فرائڈ (۱۹۳۹-۱۸۵۶) نے علوم انسانی میں علم نفسیات کے وسیلے سے انسانی عزم وارادہ اور آزادی کا احساس دلانے میں بڑا قابل ذکر کام انجام دیا ہے اور نئی نسل کو نفسیاتی تجزیے کا رویہ عطا کیا ہے ایک کردار مختلف اور متضاد شخصیتوں کا مرکب ہوتا ہے۔ انسانی ذات کی نہ صرف کئی تہیں ہوتی ہیں۔ بلکہ کئی نقاب بھی ہوتے ہیں جو حسب ضرورت وموقع اوڑھ لیے جاتے ہیں۔ (اردو میں اس کی مثال غالب شبلی اور اکبر وغیرہ سے دی جا سکتی ہے) خود نوشت سوانح حیات غیر شخصی ریکارڈ سے زیادہ روح کی نشوونما اور سنجیدہ اور سچے داخلی مطالعے کی شکل میں شخصیت کے راز کو آشکارا کر کے علم نفسیات کے لیے مفید ثابت ہوئی ہے۔

موجودہ عہد آزادیٔ فکر کا عہد ہے اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا اعتراف خود شناسی کی دلیل ہے جوش کی آپ بیتی کی اہمیت اس کے تضادات سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہوتی ہے۔ جوش کی یہ جرأت قابل تحسین ہو کہ انھوں

نے واردات قلبی اور تاثرات ذہنی کو جوں کا توں پڑھنے والوں کے سامنے رکھ دیا پڑھنے والے کیا رائے قائم کرتے ہیں اس سے جوش بری الذمہ ہیں۔ تنقید کا سب سے زیادہ آلۂ کار بننے کے باوجود یہ تسلیم کرنے میں کسی کو عار نہ ہوگا کہ "یادوں کی برات" کا شمار اردو نثر کی ان کتابوں میں ہوتا ہے جو زیادہ سے زیادہ پڑھی گئی ہیں۔

موجودہ معاشی تگ ودو، اقدار کی شکست و ریخت، ذہنی ہیجان اور سماجی مسائل سے پُراس دور میں آج کا فرد اپنی ذات سے سماج کی طرف جانے کے بجائے۔ سماج سے ذات کی طرف بڑھ رہا ہے متفکر چہروں کے سیلاب میں اسے اپنے چہرے کی شناخت پر اصرار ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سمٹ کر اپنی ذات میں محدود ہو رہا ہے بلکہ اپنے آپ کو گم شدگی سے بچانے کے لیے اپنے وجود کے اثبات پر وہ پہلے سے زیادہ زور دے رہا ہے، کیونکہ نفسیاتی کش مکش ہمیشہ آپ بیتی کے لیے سازگار ثابت ہوئی ہے۔ جس بے چینی کا اظہار، ظہیر دہلوی جعفر تھانیسری مولانا فضل الحق خیرآبادی اور حسرت موہانی اپنے عہد کے توسط سے کر رہے تھے۔ آج فن کار اس بے چینی کا اظہار "میں" کے وسیلے سے کریگا آج کا فن کار خود آگہی اور انکشاف ذات کی زیادہ ضرورت محسوس کر رہا ہے۔

انقلاب فرانس۔ انقلاب روس ۱۸۵۷ء کا پرآشوب زمانہ سرسید کا اصلاحی دور، سیاست فنون لطیفہ، ادب اور فلسفے وغیرہ کی نئی جہتیں، جد و جہد اور اس کے اظہار کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ حالات کا از سر نو تجزیہ خود شناسی کی ضرورت بھی پیدا کرتا ہے۔ عموماً ایسی

کش مکش احتساب نفس کا باعث بنتی ہے اور ایک مروجہ فکر کی سطح کے نیچے ضرورت اظہار سر اٹھاتی ہے۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ یہ "معجزہ" ہمیشہ کشاکش کے دور میں رونما ہو سکتا ہے۔ چپکے چپکے نئے خیالات سر اٹھاتے ہیں اور اپنے کو سمجھنے کی کوشش کا اظہار آپ بیتی کی یا آپ بیتی کی کسی دوسری شکل میں شخصی ریکارڈ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ مختلف زمانوں میں عظیم تحریکوں کے اپنے آپ پر اثرات کا مشاہدہ انسان کی اپنے آپ میں نئی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے۔ کبھی عدم تحفظ کا ماحول ایک سنجیدہ دماغ میں اپنے لیے نئی راہیں بناتا ہے اور خود نوشت کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے۔

خود نوشت نسبتاً ایک اہم اور مشکل صنف ادب ہے اس لیے افسانے اور ناول کی طرح اس صنف میں بہتات کے امکانات تو نہیں ہیں لیکن اس بات کی توی توقعات ہیں کہ مستقبل میں اچھی اور جامع خود نوشت لکھی جائیں گی۔ خود نوشت گذری ہوئی زندگی کا عکس ہے اور جب تک زندگی میں دلکشی، جاذبیت دوسرے کے حالات معلوم کرنے کا تجسس اور اپنے دل پر گزرنے والی کیفیات کے اظہار کی بے چینی۔ برقرار ہے۔ خود نوشت کی اہمیت باقی رہے گی۔

خود نوشت سوانح حیات کا مستقبل اس وقت تک روشن ہے جب تک انسان میں اپنی ذات کے وسیلے سے کائنات کو سمجھنے کا تجسس موجود ہے۔

کتابیات

ابوالکلام آزاد   تذکرہ سنہ ۱۹۲۵ء   کتاب محل۔ لاہور
غبار خاطر   آزاد اکیڈمی۔ دہلی
آزاد کی کہانی سنہ ۱۹۵۸ء   والی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی
نقش آزاد سنہ ۱۹۵۹ء   کتاب محل۔ لاہور
احسان دانش   جہان دانش سنہ ۱۹۷۵ء   دانش کدہ۔ لاہور
احمد شجاع حکیم   خوں بہا سنہ ۱۹۴۳ء   تاج کمپنی۔ لاہور (طبع اول)
اختر واجد علی شاہ   حزنِ اختر سنہ ۱۹۲۲ء
پری خانہ سنہ ۱۹۲۶ء
عشق نامہ
آزاد جگن ناتھ   میرے شب و روز سنہ ۱۹۶۵ء   مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی
اعجاز حسین ڈاکٹر   میری دنیا سنہ ۱۹۶۵ء   کاروان پبلشرس منٹو روڈ۔ الہ آباد
آل احمد سرور   نظر اور نظریے سنہ ۱۹۷۳ء   مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی
انیس قدوائی بیگم   آزادی کی چھاؤں میں سنہ ۱۹۷۵ء   قومی ایکتا ٹرسٹ۔ دہلی
احمد سعید خاں چھتاری   یاد ایام سنہ ۱۹۴۹ء   مسلم ایجوکیشنل پریس۔ علی گڑھ

الطاف فاطمہ	اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء سنہ ۱۹۷۴ء	اعتماد پبلشنگ ہاؤس اردو بازار دہلی ۶
احمد شاہ علی	اردو میں سوانح نگاری سنہ ۱۹۶۱ء	گلڈ پبلشنگ ہاؤس کراچی
احتشام حسین	تنقیدی جائزے	دانش محل۔ لکھنؤ
ابن انشاء	آوارہ گرد کی ڈائری سنہ ۱۹ء	مکتبۂ دانیال۔ کراچی
	دنیا گول ہے سنہ ۱۹۷۲ء	〃 〃 〃 〃
	ابن بطوطہ کے تعاقب میں سنہ ۱۹۷۵ء	〃 〃 〃 〃
اسداللہ خاں غالب	عودِ ہندی سنہ ۱۹۷۲ء	اسرار کریمی پریس۔ الہ آباد
اختر حسین رائے پوری	گرد راہ سنہ ۱۹۴۰ء	انجمن ترقی اردو ہند۔ دہلی
باقر مہدی	تنقیدی کشمکش سنہ ۱۹۷۹ء	خیاباں پبلی کیشن۔ بمبئی
جعفر تھانیسری	تواریخ عجیب	
جوش شبیر حسن خاں	یادوں کی برات سنہ ۱۹۷۳ء	اردو پبلشرس۔ لکھنؤ
حسین احمد مدنی	نقش حیات سنہ ۱۹۵۲ء	مطبوعہ الجمعیتہ پریس۔ دہلی
حسرت موہانی	قید فرنگ	
خلیق الزماں چودھری	شاہراہ پاکستان سنہ ۱۹۶۷ء	انجمن اسلامیہ۔ پاکستان
خواجہ حسن نظامی	آپ بیتی سنہ ۱۹۱۹ء	دلی پرنٹنگ ورکس۔ دلی
〃 〃	روزنامچہ	〃 〃 〃 〃
〃 〃	سفرنامہ پاکستان سنہ ۱۹۵۲ء	مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دفتر خواجہ حسن نظامی۔ دلی
خواجہ غلام السیدین	مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں سنہ ۱۹۷۲ء	سیدین میموریل ٹرسٹ جامعہ نگر نئی دہلی

راجیندر پرشاد	میری کہانی	
رشید احمد صدیقی	آشفتہ بیانی میری سنہ ۱۹۵۸ء	مسلم ایجوکیشنل پریس۔ علی گڑھ
رضا علی	اعمال نامہ سنہ ۱۹۴۲ء	رنگ محل پبلشرس۔ دہلی
رضا شاہ پہلوی	وطن کے لیے میرا عزم سنہ ۱۹۷۱ء	
زکریا شیخ محمد	آپ بیتی سنہ ۱۸۷۱ء	کتب خانہ یحیوی متصل جامعہ العلوم مظاہر العلوم سہارن پور
سلطان جہاں بیگم	تزک سلطانی یعنی تاج الاقبال ۲ جلد سنہ ۱۹۰۹ء۔ ۱۹۱۴ء	در مطبع سلطانی بھوپال
سجاد ظہیر	روشنائی سنہ ۱۹۵۹ء	آزاد کتاب گھر دہلی
سید عبداللہ	میرامن سے عبدالحق تک سنہ ۱۹۶۵ء	چمن بکڈپو اردو بازار دہلی
شاد عظیم آبادی	شاد کی کہانی شاد کی زبانی سنہ ۱۹۵۸ء	معارف پریس۔ اعظم گڑھ
شورش کاشمیری	۱۔ بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل	مطبوعہ چٹان لمیٹڈ میکلوڈ روڈ لاہور
	۲۔ موت سے واپسی	" " " "
	۳۔ تحفہ خدمت	" " " "
شوکت تھانوی	ما بدولت سنہ ۱۹۴۶ء	ادارہ فروغ اردو۔ لکھنؤ
شبلی نعمانی	خطوط شبلی سنہ ۱۹۳۵ء	تاج کمپنی لمیٹڈ۔ لاہور
شعیب اعظمی	صحبت یار آخر شد سنہ ۱۹۷۷ء	انڈو پرشین سوسائٹی۔ دہلی
طٰہٰ حسین	الایام سنہ ۱۹۶۰ء	انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ
ظفر حسن ایبک	آپ بیتی (حصہ اول)	اشرف پریس۔ لاہور
	آپ بیتی (حصہ دوم)	منصور ایجوکیشنل پریس راوی روڈ لاہور

ظفر الحسن مرزا (مرتب)	ملیں میرے دریچے میں ۱۹۷۵ء (خطوط فیض احمد فیض)	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس اردو بازار۔ دہلی
ظہیر دہلوی	داستان غدر ۱۹۱۰ء	مطبوعہ۔ مطبع کریمی۔ دہلی
عبدالمجید سالک	سرگزشت (بار دوم) ۱۹۶۶ء	قومی کتب خانہ۔ لاہور
عبدالماجد دریابادی	آپ بیتی ۱۹۷۸ء	مکتبہ فردوس۔ مکارم نگر۔ لکھنؤ
عبدالواسع ڈاکٹر	بہار میں اردو سوانح نگاری کا آغاز اور ارتقاء ۱۹۷۹ء	بک امپوریم۔ سبزی باغ پٹنہ
علی سردار جعفری	لکھنؤ کی پانچ راتیں ۱۹۶۴ء	
عتیق صدیقی	یادوں کے سائے ۱۹۷۴ء	مکتبۂ جامعہ۔ نئی دہلی
فدا علی خنجر	محل خانہ شاہی ۱۹۲۶ء	نامی پریس۔ لکھنؤ
فرحت اللہ بیگ	یاد ایام عشرت فانی	
فقیر محمد خاں گویا	گویا صاحب سیف و قلم	مکتبہ دانش محل۔ لکھنؤ
قرۃ العین حیدر	کار جہاں دراز ہے (جلد اول)	
	" " " (جلد دوئم)	ادارہ فن اور فن کار بمبئی
کلیم الدین احمد	اپنی تلاش میں ۱۹۷۵ء	کلچرل اکیڈمی رینہ ہاؤس گیا بہار
گورکی میکسم	"گرد راہ" (مترجم اختر حسین رائے پوری)	انجمن ترقی اردو ہند۔ دہلی
گاندھی جی	تلاش حق (مترجم ڈاکٹر عابد حسین)	مکتبۂ جامعہ۔ دہلی
محمد صدر الحق	نسخ حیات اور تصنیف ۱۹۷۹ء	انجمن ترقی اردو، پاکستان
محمد خاں کرنل	بجنگ آمد ۱۹۷۷ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ
مجتبیٰ حسین	ادب اور آگہی	مکتبۂ افکار رابسن روڈ۔ لاہور

مصنف	کتاب	ناشر
مشتاق احمد یوسفی	زرگزشت سنہ ۱۹۷۶ء	مکتبۂ دانیال۔ کراچی
مفتون دیوان سنگھ	ناقابل فراموش	رنجیت نیوز ایجنسی۔ دہلی
ملک زادہ منظور احمد	مولانا ابوالکلام آزاد (فکر و فن)	نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ
میر تقی میر	میر کی آپ بیتی (مترجم نثار احمد فاروقی سنہ ۱۹۵۷ء)	مکتبہ برہان۔ دہلی
مولوی منظر علی سندیلوی	ایک نادر روزنامچہ سنہ ۱۹۵۷ء	فروغ اردو۔ لکھنؤ
	نقوش آپ بیتی نمبر سنہ ۱۹۶۴ء	ادارہ فروغ اردو۔ لاہور
	نقوش خطوط نمبر	" " " "
	نخبۃ الادب (طبع سوم سنہ ۱۹۷۳ء)	المطبع السلفیۃ وارانسی (الہند)
نظامی بدایونی	نکات غالب	نظامی پریس بدایوں
ہوش بلگرامی	مشاہدات سنہ ۱۹۵۵ء	انتخاب پریس۔ حیدرآباد
ہمایوں مرزا	میری کہانی میری زبانی	
یوسف حسین خاں	یادوں کی دنیا سنہ ۱۹۶۷ء	معارف پریس دارالمصنفین اعظم گڑھ

1. A History of autobiography in antiquity. By George Misch.

2. A Hand Book of English Biography By Edward and Cole.

3. Design and Truth in autobiography By Pascal Roy

4. The Indian autobiography in English By R. C. P. Sinha.

5. Encyclopaedia Britanica Volume I & II

6. Cassels Encyclopaedia Volume I & II

7. I am not an Island, An experiment in autobiography. By K. A. Abbas.

8. Revenue Stamp By Amrita Preetam.

9. Life and experiences of a Bengali Chemist By P. C. Ray

10. Apology for heroism, A brief autobiography of ideas By Mulak Raj Anand.

11. Letters from Jail By M. N. Roy.

12. An autobiography By J. L. Nehru

رسائل

امروز	جون ۱۹۷۹ء	لاہور
نقوش	خطوط نمبر	لاہور
نقوش	آپ بیتی نمبر ۱۹۶۴ء	لاہور
اوراق	(جنوری فروری) ۱۹۷۸ء	چوک اردو بازار لاہور
ہماری زبان	(۲۲ جنوری) ۱۹۷۲ء	علی گڑھ
صدق جدید	(ہفت روزہ) ۱۹۷۲ء	لکھنؤ
	مورخہ مئی ۴/ ۱۱/ ۱۸/ ۱۹۷۳ء	
	جون ۱/ ۸/ ۱۹۷۳ء	
	جولائی ۲۸/ ۱۹۷۳ء	
	اگست ۴/ ۱۹۷۳ء	
فن اور شخصیت	آپ بیتی نمبر	فن اور فنکار، بمبئی
الزبیر	آپ بیتی نمبر	بہاول پور

اشاریہ

شخصیات

ا

(ن)

(و)

(ہ)

ی

ورق ورق زندگی

از

ڈاکٹر صبیحہ انور

افسانوی مجموعہ

اتر پردیش اردو اکیڈمی سے انعام یافتہ